

دل گداز تحریریں ۔ زندگی کی تصویریں
کراچی
سچی کہانیاں
JUNE
2013
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
اس شمارے میں
زندہ کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، جیتی جاگتی کہانیاں
"آتشِ جنوں" سلیم فاروقی کے قلم سے
ایک نیا ناقابلِ فراموش سلسلہ
"مسئلہ یہ ہے"
www.paksociety.com

کھیل

مملکتِ خداداد پاکستان کو درپیش بے شمار مسائل دہشت گردی

اور دھماکوں کے درمیان بس یہی شور تھا۔

الیکشن......الیکشن......اور الیکشن......!

سیاست دان، دانشور، سماجی رہنما، میڈیا، عدلیہ، افواجِ پاکستان اور عوام......

سب کا یہی کہنا تھا کہ ہمارے ملک کو درپیش موجودہ ہر مسئلے کا حل الیکشن ہے!!......

لیکن کیا واقعی الیکشن کے بعد ہمارے ملک کو لاحق تمام مسائل اور بحرانوں کا

خاتمہ ہو جائے گا؟؟

خدا کرے کہ ایسا ہی ہو!......ورنہ تو یہ الیکشن اس شاعرانہ خیال کی تصویر

ہو گا۔

یہ ایک کھیل ہے ہم خوش عقیدہ لوگوں کا

دیے جلا کے ہوا کی امان میں رکھنا

ناصر رضا

WWW.PAKSOCIETY.COM

احوال

سلیم فاروقی قارئین کے درمیان

دوستو......! ایک طویل عرصے بعد خود کو اپنے قارئین کے درمیان پا کر دل کی عجیب سی کیفیت ہے۔ لگ رہا ہے، گویا ہم ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گئے ہوں لیکن یہ صرف اور صرف ہمارا تصور ہے۔ کبھی دانش دیروی صاحب (مرحوم) کی آواز کانوں میں گونجتی ہے اور محترم سہام مرزا مرحوم اپنی مخصوص اور باوقار مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ کبھی شمیم نوید (مرحوم) کی پیار بھری ڈانٹ سنائی دیتی ہے۔ غرض یادوں کی ایک یلغار ہے جس نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ کیسے الہڑ سپنے تھے جو دورِ جنوں میں ٹوٹ گئے! ہم نے جو کچھ بھی سیکھا، ان ہی بزرگوں سے سیکھا۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کی مغفرت فرمائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت کے کارخانے میں ایسے لوگ بننا ہی بند ہو گئے ہیں، غالباً اللہ نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے جس میں ایسے بے لوث، بے غرض اور اپنے کام سے جنون کی حد تک عشق کرنے والے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ ہم تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر!

جب سچی کہانیاں نکالنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا تو اکثریت نے اس کی مخالفت کی کہ اس زمانے میں اتنے ڈائجسٹ نکلا کرتے تھے جتنے آج کل ٹی وی چینلز ہیں۔ اکثر بہی خواہوں نے سہام مرزا صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ بھائی، ڈائجسٹ میں سرمایہ ضائع کرنے کی بجائے کسی فلاحی ادارے کو دے دو تا کہ کچھ کارِ خیر ہی ہو جائے کہ ڈائجسٹوں کے اس ''جنگل'' میں ''سچی کہانیاں'' بھی کہیں گم ہو جائے گا لیکن وہ سہام مرزا ہی کیا جو کسی بات کا ارادہ کر لیں اور اسے عملی جامہ نہ پہنائیں۔ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے اور ''سچی کہانیاں'' نکال کر ہی دَم لیا پھر اللہ کے فضل و کرم اور ہماری محنت سے اس کے پہلے ہی شمارے میں ڈائجسٹوں کی دنیا میں گویا ایک لرزہ طاری کر دیا۔ اس کی گونج کراچی سے خیبر تک سنی گئی۔ ''سچی کہانیاں'' کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ پاکستان کا پہلا ڈائجسٹ ہے جس کے دوسرے ہی شمارے کی اشاعت پہلے کے مقابلے میں دگنی سے بھی زیادہ تھی۔

یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اس پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا، اسے زمانے کے سرد و گرم سے بچایا، ہم نے اسے سجانے، سنوارنے اور اس کا منفرد معیار برقرار رکھنے میں بساط سے بڑھ کر محنت کی۔ شمیم نوید، ہم اور سیما غزل (معروف ڈراما رائٹر) ابتدائی طور پہ اس کے شعبۂ ادارت میں تھے۔

اللہ کے فضل و کرم سے یہ پودا چند ہی برس میں ایک تناور درخت بن گیا تو مخالفین کی زبانیں بھی خود بہ خود

WWW.PAKSOCIETY.COM

بند ہو گئیں۔ اس دوران میں وقت کی تند و تیز آندھی نے کتنے ہی ڈائجسٹوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ بھارتی الیکٹرانک میڈیا کی یلغار نے بے شمار ڈائجسٹوں کو زمیں بوس کر دیا لیکن بفضلِ تعالیٰ ''سچی کہانیاں'' اسی آن بان سے سینہ تانے کھڑا رہا جو ہمیشہ سے اس کا خاصہ رہی ہے۔ اصل میں جس درخت کی جڑیں زمین میں جتنی گہری ہوتی ہیں، وہ وقت کی تند و تیز آندھیوں کے سامنے اسی طرح کھڑا رہتا ہے اور ''سچی کہانیاں'' کا فخر اس کے مداح ہیں، اسے پسند کرنے والے ہیں اور کسی بھی ڈائجسٹ کے مداح ہی اصل میں اس کی ''جڑیں'' ہوتے ہیں۔ ان کی پسندیدگی، محبت، اپنائیت اور خلوص اگر نہ ہو تو کوئی بھی پرچہ اتنی طویل جنگ لڑ کے فتح یاب نہیں ہو سکتا۔ ''سچی کہانیاں'' پڑھنے والے، اسے پسند کرنے والے اور اس میں لکھنے والے ہی تو اصل میں ہماری متاع اور اثاثہ ہیں۔

آپ میں سے بے شمار لوگ مجھے نہیں جانتے ہوں گے کہ جس وقت ''سچی کہانیاں'' سے میرا ناتا ٹوٹا تھا، وہ لوگ نرسری میں ہوں، معدودے چند لکھاریوں کے جو روزِ اول سے ہمارے ساتھ ہیں۔ میں ''احوال'' کے توسط سے ''سچی کہانیاں'' کے اُن تمام پڑھنے والوں اور اس میں لکھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ اپنی گوناں گوں مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ایک دفعہ پھر ''احوال'' میں شرکت کریں، اپنی نگارشات بھیجیں اور ماحول کو اسی طرح گرما دیں جس طرح میرے دَور میں ہوتا تھا۔ میں اپنے اُن ساتھیوں سے بھی گزارش کروں گا جو میرے بعد اس کارواں میں شامل ہوئے کہ وہ بھی پابندی سے اور زیادہ سے زیادہ اپنی نگارشات ارسال کریں۔ میں آپ لوگوں کے لیے نیا ضرور ہوں لیکن ''سچی کہانیاں'' تو آپ کے لیے نیا نہیں ہے۔

میں ''سچی کہانیاں'' کے تمام پڑھنے والوں سے خصوصی طور پر یہ درخواست بھی کروں گا کہ وہ ڈائجسٹ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے تجاویز بھیجیں۔ ادارہ آپ کی رائے اور تجاویز کا احترام کرے گا اور منزہ سہام مرزا صاحبہ، ناصر رضا صاحب، راجا محمود صاحب اور مجھ سمیت ادارتی بورڈ اُن تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرے گا اور قابلِ عمل ہونے کی صورت میں ان پر عمل بھی کیا جائے گا۔

میری کوشش ہے کہ آپ کو آنے والے شماروں میں کچھ خوش گوار تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس سلسلے میں آیندہ شمارے سے ''سچی کہانیاں'' میں ایک دلچسپ سلسلے ''اعترافات'' کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس سے قبل بھی ''سچی کہانیاں'' میں خاصا مقبول رہا ہے۔

''سچی کہانیاں'' کے قارئین میں بے شمار افراد کو شوبز سے لگاؤ ہے، سو ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے آیندہ ماہ سے ''شوبز کہانی'' کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ موجودہ اور ماضی کے شوبز اسٹارز کی زندگی کے دلچسپ حالات و واقعات پڑھ سکیں گے۔

آخر میں تمام لکھنے والوں اور احوالیوں کے لیے ایک خوش خبری! اول، دوم اور سوم آنے والی کہانیوں کی انعامی رقم میں بھی جلد ہی اضافہ کر دیا جائے گا اور ''احوال'' میں چھپنے والے بہترین خط کو بھی انعام سے نوازا جائے گا۔ کہیے، یہ خوش خبری پسند آئی؟ اگر اللہ کی رحمت اور آپ دوستوں کا تعاون حاصل رہا تو آیندہ بھی آپ کو بہت سی خوش خبریاں سننے کو ملیں گی۔

یہ تو تھا ہمارا احوال جو کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آیئے اب آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں۔

✉ (یہ انتہائی محنت سے تیار شدہ سجا سنورا خط ہمیں سرگودھا سے بھیجا ہے مریم شاہ نے۔ انہوں نے اس خط کی آرائش مختلف رنگوں اور شیشوں سے کی ہے۔ محبت ہے ان کی) لکھتی ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ! خدا تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ آپ کو غموں کی دھول سے دکھوں کے گرداب سے شکست کی کڑواہٹ سے اور دشمنوں کی عداوت سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین ثم آمین!) ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' مورخہ 26 اپریل 2013ء بروز جمعۃ المبارک کو بذریعہ رجسٹری ڈاک ملا جسے دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ اشتہارات کو نظر انداز کر کے سیدھے ناصر چاچو کے پاس اداریہ میں حاضری لگوائی۔ ناصر چاچو! آخر ہم کب تک حالات کے بدلنے کا انتظار کرتے رہیں گے؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ سترہ کروڑ عوام متحد ہو کر اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں؟ اور جس انقلاب کی بات یہ نام نہاد سیاست دان کرتے ہیں وہ انقلاب کیا عوام نہیں لاسکتے؟ آہاہ! دیوانے کا خواب! (آپ نے تو خود ہی اپنے خواب کی تعبیر بتا دی۔) راجا جی! آپ تو واقعی زندہ کہانی کے راجا ہو۔ کیا اسٹوری لائے ہیں! ایک دم پرفیکٹ۔ ''چھلاوا'' ویسے میری بھی ملاقات ہوچکی ہے ایک چھلاوے سے۔ اسے میں نے آفر کی بھی کہ ہمارے ساتھ رہو مگر اس نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرلی۔ (کہ میں کسی ''چھلاوی'' کے ساتھ نہیں رہ سکتا، یہی بات ہے نا؟) اس ماہ کی خاص کہانی ''ہے یہ عجب کہانی'' واقعی خاص کہانی تھی۔ سڑک کہانی میں ''مداری کا ناٹک'' بہت پسند آیا۔ گل رخ کی کہانی ''مر کے بھی چین نہ آیا'' اور کوٹ قبرستان اور لڑکیاں ایک عجیب شخص وہ میری دشمنِ جاں اور وہ کون تھے؟ اچھی کہانیاں تھیں۔ سب سے زبردست اور بہترین تحاریر ''پانچواں کاہن'' عبدالروف تاجور پراسرار محافظ خلیل جبار مومن کا ہتھیار پروفیسر مشتاق حسین روح کا سفر ارم زہرا اسرارِ مکلی محمد اقبال زمان صاحب کی رہیں۔ سلسلے وار کہانیوں میں ظاہر ہے آتشِ جنوں اور ملھنی کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ شہید کی ڈائری تو ہے ہی لاجواب بے مثال! مجھے سچی کہانیاں کی ایک بات بہت بری لگتی ہے بھلا کیا؟ بھئی یہ مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے اور ختم بھی جلدی ہوجاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ اتنا اتنا اتنا اتنا ضخیم ہو کہ اسے پڑھتے ہوئے بھی کم از کم دو مہینے لگ جائیں لیکن پھر بھی دل سیر نہ ہو۔ واہ کتنا مزہ آئے گا ناں اگر ایسا ہوجائے۔ (آپ کو تو مزہ آجائے گا لیکن ناصر رضا اور راجا محمود صاحب کی جانِ ناتواں اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔) ''کچھ اپنے بارے میں'' پروین حیدر صاحبہ کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ خیال آرائی میں آصف ریاض کی خیال آرائی بہت اچھی لگی۔ آپ کی ڈائری کے لیے سب کا انتخاب اچھا تھا۔ آخر میں اپنی کہانی کے بارے میں اتنا ہی کہوں گی کہ یہ سب ناصر چاچو کی ذرہ نوازی ہے ورنہ بندی اس قابل کہاں! ارے ہاں شفق شیکی جی! پہلے تو خلوص بھرا سلام قبول فرمایئے۔ آپ نے میرا سندیسہ پسند کیا شکریہ۔ ویسے آپ کو میرے خط سے کس قسم کی خوشبو آتی ہے؟ قسم لے لیں میں نے آج تک کوئی خوشبو استعمال نہیں کی بے شک ''سچی کہانیاں'' سے تصدیق کرلیں صاف اور سیدھا سادہ سا کاغذ پر قلم سے لکھ بھیجتی ہوں اور تو کوئی بات نہیں۔ (لفظوں کی بھی ایک مہک ہوتی ہے مریم! ان کی مہک تو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔) اچھا اب خط طویل ہوگیا اس لیے اجازت ہاں ایک عدد کہانی بھی ساتھ ہے۔ (کہانی مل گئی ہے قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں شائع ہوجائے گی۔)''

✉ عمران مظہر ژوب بلوچستان سے لکھتے ہیں۔ ''محترم انکل سلیم فاروقی السلام علیکم! سب سے پہلے خوش

MENT
ملتی ایوارڈ ہولڈر
CELLENCE
NCE AWARD
co.uk
WWW.PAKSOCIETY.COM

آمدید! ایک عرصے بعد آپ کو احوال میں دیکھ کر اچھا لگا۔ نوے کی دہائی یاد آ گئی۔ کیا وقت تھا' کیا کیا ساتھی تھے۔ امید ہے کہ آپ کا اور ہمارا سفر اچھا رہے گا اور آپ کا تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔ (انشاءاللہ!) مئی کے شمارے کا سرورق متاثر نہ کر سکا۔ (یہ بھی تو بتائیں کیوں؟) اداریے کا کیا کہنا' ناصر سر اس خوبصورتی سے بات کرتے ہیں کہ انسان کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ حالات کو اچھے طریقے سے بیان کیا۔ میرے سوئٹ سے سر ناصر صاحب نے جعفر جمالی صاحب! منزہ صاحبہ کی تعریف کے بعد اب تو مجھے بھی آپ سے ملنا ہے۔ عبدالعزیز جی آ! انکل' آپ ہمیشہ ناراض ناراض سے کیوں رہتے ہیں؟ سب اتنا برا بھی تو نہیں ہے اور بیٹی کی شادی مبارک ہو۔ تحسین جو نجو صاحبہ! cool down یہ بتایئے' آپ کی سینئر سسٹرز آج کل کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں؟ راجا محمود صاحب کی ''چھلاوا'' نارمل رہی۔ محمد رضوان قیوم کی ''یہ ہے ایک عجب کہانی'' دلچسپ تحریر تھی۔ اس بار بشیر احمد بھٹی کی سڑک کہانی واقعی منفرد تھی۔ آتش بجوں بہترین انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ پروین حیدر کی ''وہ ایک جنون'' قاری کو سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ سنبل کی ''بھید نہ کھل سکا'' مریم شاہ کی ''جیسی کرنی' ویسی بھرنی'' سلمٰی غزل کی ''وہ کون تھے؟'' عبدالرؤف تاجور کی ''پانچواں کلہڑ'' نارمل تھیں جبکہ خلیل جبار کی ''پراسرار محافظ'' اچھی' سبق آموز تحریر تھی۔ اس کے علاوہ غیناں احمد کی ایک عجیب شخص' شازلی سعید کی بلیاں لافانی ہیں' انجم فاروق کی پراسرار کمرا' شفیق شیکی کی قبرستان اور لڑکیاں' رملہ شاہد کی روم نمبر 38 کا راز' قاسم شیخ کی وہ میری بیوی تھی اور کریم بخش پہوڑ کی یہ سچ ہے پڑھنے کے لائق تھیں جبکہ مریم مسعود کی اوورکوٹ بہت مشکل لگی اور پروفیسر مشتاق حسین کی ''مومن کا ہتھیار'' متاثر نہ کر سکی۔ ارشد علی ارشد کی تحریر ''ملغنی'' لاجواب ہے۔ بہترین اندازِ بیان' زبردست واقعات! ہر چیز پرفیکٹ' مستقل سلسلے سارے بہترین لگتے ہیں سوائے خیال آرائی کے' آپ کی ڈائری کے لیے صفحہ 243 پر ''خزانہ'' نام کا اقتباس میں نے تو نہیں بھیجا تھا پھر میرے نام سے کیوں شائع ہے؟ کوئی اور تو میرے نام سے تحریریں نہیں بھیج رہا؟ (غلطی سے ایسا ہوا ہوگا۔) اور سلیم فاروقی صاحب' اتنا عرصہ آپ کہاں رہے؟ (ہم کہاں رہے' اس کے لیے الگ سے ایک شمارہ نکالنا پڑے گا۔) ناصر سر کیسے ہیں؟ انہیں میرا خصوصی سلام دیجیے گا۔ اس کے علاوہ کاشی بھائی کو بھی خصوصی سلام کہیے گا۔ (دونوں حضرات بہ فضلِ تعالیٰ بہ خیریت اور خوش وخرم ہیں۔ آپ کا سلام اُن تک پہنچا دیا ہے۔) راجہ محمود صاحب' قیوم صاحب' منزہ صاحبہ سب کے لیے تسلیمات! دعاؤں میں یاد رکھیے گا!

☒ حیدرآباد سے آصفہ ضیاء رقم طراز ہیں۔ ''امید ہے' مزاج بخیر ہوں گے۔ میری جانب سے سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے اسٹاف کے لیے بے شمار دُعائیں اور نیک خواہشات۔ (بہت شکریہ!) پراسرار نمبر سچی کہانیاں میں میری پہلی ہی کہانی کو جو پذیرائی ملی ہے' اس کے لیے میں آپ کی اور تمام قارئین کی بے حد ممنون ہوں۔ جنہوں نے میری کہانی کو پڑھا' سراہا اور اپنی گرانقدر آراء سے میری حوصلہ افزائی کی۔ جناب خلیل جبار صاحب' ساحل ابڑو صاحب' حافظ مون شاہ' سدرہ انور علی اور تحسین جو نجو کا تبصرہ تو اتنا اچھا' اتنا خوبصورت تھا کہ میری ساری محنت وصول ہوگئی۔ ان تمام افراد کا ایک بار مزید شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ انشاء اللہ' اتنے پیارے پیارے قارئین کے لیے اپنی مزید تخلیقات لے کر سچی کہانیاں کی بزم میں آتی جاتی رہوں گی۔ (ضرور آصفہ! ہمیں بھی آپ کا انتظار رہے گا۔) بھائی ناصر رضا صاحب! اپریل کے شمارے میں انعامی مقابلے کی ونرز فہرست میں اپنا نام دوسرے نمبر پر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ اس انعام کے لیے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ادارہ سچی کہانیاں' محترمہ رخسانہ سہام' آپ کی اور قارئین کی شکر گزار ہوں۔ انعام کا اعلان ہوئے تقریباً ایک ماہ ہوگیا ہے' 20 مارچ بروز بدھ شمارہ میرے ہاتھ میں تھا لیکن انعامی رقم مجھے ابھی تک موصول نہیں ہوئی۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں مجھے ضرور مطلع فرمائیں گے۔ نوازش' کرم' مہربانی' ٹیلی فونک رابطہ میں اس لیے نہیں کرتی ہوں کہ آپ کی مصروفیت میں خلل نہ پڑے۔ (اکاؤنٹ کے شعبے سے معلوم کرکے آپ کو اطلاع دیں گے۔ ایسا کبھی ہوتا تو نہیں ہے۔) محترمہ رخسانہ سہام مرزا کی خدمت میں سلامِ ادب پیش کرتی ہوں۔ امید ہے وہ بفضلِ ربی بخیر ہوں گی۔ (آپ کا سلام اُن تک پہنچ گیا۔ وہ بھی آپ کو دعائیں دے رہی ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے بخیریت ہیں۔)

☒ کراچی سے ہمارے ایک دیرینہ کرم فرما فرید عالم نقشبندی کی آمد! "محترم ناصر رضا بھائی اینڈ سلیم فاروقی! السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) چمکتی دمکتی محفل احوال' سچی کہانیاں کے ساتھیوں اور اسٹاف! آپ سب کو سلام و دعائیں! پراسرار کہانی نمبر 2 منظرِ عام پر آکر ہمارے دل میں بس گیا۔ احوال میں 25 تبصرہ نگاروں نے پراسراریت کے خطوط روانہ کرکے پراسرار نمبر کو جگمگا دیا۔ پراسرار نمبر 2 میں 27 پراسرار سبق آموز اور بہترین کہانیوں نے مزہ دیا۔ آپ کی ڈائری' خیال آرائی' پسند اپنی اپنی' یاد کے گہرے ساگر میں' نقد ہنر' آپ کی خبر بازگشت' تمام کہانی کاروں اور ان سب کو عقیدت' محبت اور خوشیوں بھرا اسلیوٹ مار کر میں ان سب کو مبارک اور سلام پیش کرتا ہوں۔ ناصر رضا بھیا اور منزہ آپی' آپ چوپال جیسا نیا سلسلہ شروع کردیں اور ہاں' تقریب ایوارڈ سچی کہانیاں کب شروع کررہے ہیں' بتائیں؟ (ادارہ اس تجویز پر بھی سنجیدگی سے غور کررہا ہے۔ بہت جلد آپ کو خوش خبری سننے کو ملے گی۔)"

☒ ساحل ابڑو' ڈیرہ اللہ یار سے لکھتے ہیں۔ "باجی منزہ! میں خیریت سے ہوں اور اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ بھی بخیریت ہوں گی۔ باجی منزہ! میں ایک گھنٹے سے سوچ رہا ہوں کہ میں خط میں کیا لکھوں اور کہاں سے لاؤں رنگ برنگے الفاظ جن کی خوشبو سے یہ ادبی محفل مہک اٹھے۔ بہرحال اللہ کرے' ہماری ادبی محبت ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور خاص کر سچی کہانیاں کے خوبصورت رائٹر ہر وقت ہم نوجوان نسل تک ادبی پیغام پہنچانے میں گریز نہ کریں۔ باجی منزہ! اپریل کا شمارہ مجھے کافی تاخیر سے ملا جس کی وجہ سے میں احوال میں شرکت نہیں کرسکا اور اب تک مئی کا شمارہ بھی نہیں ملا ہے جو میں تحریروں پر تبصرہ لکھتا۔ لیٹ آنے کی کیا وجہ ہے' یہ تو آپ ہی بتا سکتی ہیں ورنہ یہ پرچہ 25 کو مل جاتا تھا۔ (چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ اب انشاء اللہ' سچی کہانیاں آپ کو مقررہ تاریخ کو ہی ملے گا۔) باجی منزہ! ایک چھوٹی سی تحریر ارسال کررہا ہوں' اسے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں ورنہ ردی کی ٹوکری ہی سہی۔ (آپ کی کہانی مل گئی تھی اور افسانہ بھی' قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں شائع ہوجائے گا۔) اور ہاں باجی منزہ! ادارے کی طرف سے بھیجا ہوا انعام مجھے مل گیا' بہت بہت شکریہ۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ احوال میں شرکت کرتے رہیں گے۔"

☒ راولپنڈی سے اصغر علی آسی فیروزپوری پہلی دفعہ تشریف لائے ہیں۔ (خوش آمدید جناب آسی!) السلام علیکم! میرا نام اصغر علی ہے۔ الحمدللہ' عمر کی بیاسی بہاریں گزار چکا ہوں۔ عرصہ پینتیس سال سے ماہانہ ڈائجسٹ کا مطالعہ کررہا ہوں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں ستمبر 2012ء صفحہ نمبر 21 پر آپ کی دی گئی پیش کش پر آپ کے قلم قبیلے میں شامل ہونے کا خواہش مند ہوں۔ گر قبول افتد زہے عزوشرف! آج سے تقریباً 30 سال پہلے خود پہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزری ہوئی ایک واردات' کیفیت بہ عنوان ''خودفراموشی'' کے نام سے ارسال خدمت ہے۔ اگر آپ نے اسے شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی تو آیندہ بھی حسبِ مقدور لکھ کر بھیجتا رہوں گا۔ (آپ کی کہانی قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔) چونکہ میں آپ کے مروجہ قواعد وضوابط سے نابلد ہوں اور نہ ہی کوئی پختہ کار لکھنے والا ہوں' اگر میری تحریر میں کوئی فنی' ادبی غلطی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔''

☒ (شیخوپورہ سے فیصل ندیم شکیل رقم طراز ہیں۔ السلام علیکم! جناب! میرا نام فیصل ندیم شکیل ہے۔ شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں۔ میں گزشتہ تین سال سے لاہور کے ایک ڈائجسٹ کے لیے اسٹوریز لکھتا رہا ہوں اور اس کے ساتھ تجزیہ بھی۔ اس پرچے کے علاوہ میں نے ملک بھر کے تمام معروف ڈائجسٹوں کے لیے لکھا ہے۔ اس بار سوچا ہے کہ آپ کے ڈائجسٹ سچی کہانیاں میں بھی اپنی تحریر شائع کرواؤں۔ اس کے لیے میں نے ایک کہانی تحریر کی ہے ''ارمانوں کا لہو'' امید کرتا ہوں' قارئین کو پسند آئے گی۔ جنابِ عالی' میں پہلی بار آپ کے ڈائجسٹ میں شرکت کر رہا ہوں' اس امید کے ساتھ کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی کریں گے۔ (خوش آمدید بھائی شکیل! آپ کی تحریر معیاری ہوئی تو ہم بھی اسے ضرور شائع کریں گے۔) اگر آپ نے اپنی محفل میں مجھے جگہ دی تو میں آپ کے ڈائجسٹ میں مستقل کہانیاں لکھوں گا۔''

☒ (کوئٹہ سے شاد ہندرانی کی خیال آرائی! امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیروعافیت سے ہوگی۔ اللہ کے کرم اور آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں بھی خیریت سے ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) دیگر احوال یہ ہے کہ مئی 2013ء کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل بہت حسین اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ ناصر بھائی کا لکھا ہوا اداریہ اچھا لگا۔ واقعی آج کل ہمارے ملک پاکستان کے حالات روز بہ روز ٹھیک ہونے کی بجائے بگڑتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف بے چینی کا سماں پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ حالات ایک خوفناک منظر نامہ پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے قوم کا ہر فرد بے چینی کا شکار ہو رہا ہے۔ آئے روز دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں کئی معصوم جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے پیارے ملک کے حالات کو درست کر دے۔ (آمین! ثم آمین!) اس مرتبہ میں کسی کہانی پر اظہار خیال نہیں کروں گا کیونکہ جب تک مکمل پڑھوں گا تو احوال میں شامل نہیں ہو پاؤں گا' ویسے بھی ماہنامہ سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر کہانی کا اپنا ایک انداز ہے۔ اس میں لکھنے والا ہر لکھاری فکری انداز میں لکھتا ہے اس لیے اس کا ہر لفظ معیاری ہونے کی ضمانت ہے۔ میں نے پہلے بھی ایک خط بہ ذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس میں ایک افسانہ ''حوا کی بے بسی'' اور ایک غزل تھی' وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ اب بھی آپ کی خدمت میں ایک افسانہ ''بیتے لمحے'' اور ایک آزاد نظم بھیج رہا ہوں۔ برائے مہربانی قریبی شمارے میں جگہ دے دیجیے گا۔ میری طرف سے ماہنامہ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو محبت بھرا اسلام! (سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کی طرف سے وعلیکم السلام! آپ کا افسانہ ''بیتے لمحے'' اور آزاد نظم مل گئی ہے۔ قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں جلد ہی شائع ہو جائے گی۔)''

☒ سرگودھا سے ممتاز احمد کا نامہ! ''بہت اچھی بہنا منزہ جی! السلام علیکم! آپ کی صحت' سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے رَب کے حضور دُعا گو ہوں۔ مئی کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ احوال کی خوب صورت چمکتی دمکتی محفل میں حاضر ہوں۔ سب سے پہلے اُن تمام دوستوں اور بہن بھائیوں کا تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

احوال

جون 2013ء

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام اور مکمل پتا: ....

....

سچی کہانیاں MINI MAG

جون 2013ء

میں اپنی پسند کا تراشہ بھیج رہا/رہی ہوں جسے میں نے ....

نامی کتاب کے صفحہ نمبر .... سے اتارا ہے۔

میرا نام و پتا: ....

....

اپنی اپنی پسند

جون 2013ء

میرا پسندیدہ شعر الگ کاغذ پر ہے اسے شائع کردیں

....

....

شاعر: ....

شعر بھیجنے والے کا نام: ....

پتا: ....

میری کہانی ''ہوسِ زر'' کو پسند فرمایا اور ان کی پسندیدگی کے نتیجہ میں پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری۔ اپنی چھوٹی اور پیاری بہنوں سدرہ انور علی اور صائمہ سحر کو اُن کی سالگرہ پر اپنی اس دعا کے ساتھ وِش کرتا ہوں کہ خوشیاں' عزت' سکون' پیار اور صحت' زندگی کو بہت خوبصورت بناتے ہیں۔ اللہ آپ کی زندگی میں کسی ایک کی بھی کمی نہ کرے۔ (آمین!) قابلِ صد احترام برادرِ محترم عبدالعزیز جی آ صاحب جناب! کیسے ہیں آپ؟ میرا اخلوص بھرا اسلام قبول فرمائیں۔ جی اب کچھ بات ہوجائے شمارہ مئی کے بارے میں۔ احوال میں سب دوستوں کے خطوط اور تبصرے شان دار تھے۔ اداریے میں ناصر رضا نے عمدہ الفاظ میں حالات کے بارے میں لکھا۔ شہید کی ڈائری میں سفرِ آخرت کے حوالے سے ایک اچھی کاوش اور جھنجھوڑ دینے والا بہت ہی فکر انگیز پیغام تھا۔ مجموعی طور پر اپنے پراسرار موضوع کی مناسبت سے تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ سب لکھاریوں نے اپنے اپنے قلم کے خوب جوہر دکھائے۔ کہانیوں کا معیار قابلِ تحسین تھا۔ ''آپ کی ڈائری کے لیے'' میں شرجیل اقدس کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ آخر میں تمام بیماروں کو شفایابی اور مرحومین کی بخشش و مغفرت کے لیے پاک پروردگار کی بارگاہ میں بہت سی التجاؤں اور دعاؤں کے ساتھ اس پیغام کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ کسی دوست کو فضول نہ سمجھیں کیونکہ جو درخت پھل نہیں دیتا' وہ سایہ ضرور دیتا ہے۔ اللہ کریم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو! خدا حافظ!'' ''آپ کی خبر'' کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ 26 جولائی کو میری سالگرہ ہے۔ آپ سے اور سب دوستوں سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ (ہماری طرف سے سالگرہ کی ایڈوانس مبارک باد بھائی ممتاز! ہمیشہ خوش رہیں۔)''

✉ (چیچہ وطنی آباد سے ہماری ایک اور ہمدمِ دیرینہ اور سچی کہانیاں کے ہراول دستے کی ساتھی صفیہ سلطانہ مغل کی آمد! لکھتی ہیں۔ محترم ناصر رضا صاحب! اَلسلام علیکم! ڈیئر منزہ جی! سلامت رہو۔ حیران ہو رہی ہوگی کہ مخاطب تو ناصر رضا کو کیا ہے' آداب آپ کو کر رہی ہوں؟ (اور جواب سلیم فاروقی دے رہے ہیں۔) دراصل گزشتہ کئی برس سے قلم اس نام سے اتنا مانوس ہو چکا ہے کہ خود بہ خود ہی پھسل جاتا ہے اور سنایئے منزہ جی! کیا حال ہیں؟ ستمبر کی تباہ کن بارشوں نے ہمارے گھروندے کو مٹا ڈالا تھا۔ (بہت افسوس ہوا صفیہ......!) اب الحمدللہ' ہم نے تنکا تنکا چن کر پھر ایک آشیانہ بنالیا ہے۔ اس تگ و دو میں اتنے مگن رہے کہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں تواتر سے خط ہی نہ لکھ سکے۔ اب یکم اپریل کو ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں مگر زندگی کی طرف لوٹنے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ (زندگی کی طرف لوٹنے میں؟ اسی کا نام تو زندگی ہے صفیہ!) پرچے حسبِ روایت ملتے رہے۔ دوشیزہ بالعموم' بہت تاخیر سے ملتا رہا' سوچنے اور مصروفیت کے چند لمحات کشید کرنے میں ہی تاریخیں بدلتی رہیں۔ (اب دوشیزہ بھی انشاء اللہ آپ کو بروقت ملے گا۔) ناصر رضا صاحب کی بے پناہ پیار بھری ڈانٹ پر (اس میں بھی پیار ہی ہوتا ہے اور اصرار بھی۔) پراسرار کہانی لکھی مگر سامانِ زندگی کی منتقلی پر وہ بھی لاپتا ہوگئی' سو بے حد معذرت! مائی ڈیئر' کہانیاں پڑھیں' اب ان کی پراسراریت میں وہ اسرار نہیں رہا اس لیے کہ واقعات میں یکسانیت ہے۔ اب ''جن'' حضرات نے بھی ہار تسلیم کرلی ہے کہ انسان اُن سے بہت آگے ہیں۔ پروین حیدر کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن بہت اچھی نہیں' یہ کہنا قدرے مشکل ہے۔ منزہ جی! اس بار فقط اتنا ہی' وقت کم ہے۔ (اور مقابلہ سخت!) اگلے ماہ وعدہ ہے کہ بہت مفصل خط ہوگا اور ہاں' شریف اکیڈمی (جرمنی) یہ اکیڈمی حاجی شریف احمد کے بیٹے' شفیق مراد صاحب نے ان کے نام پر بنائی ہے' جس میں تعلیم

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے فروغ کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ادباء اور شعراء کو ایک پلیٹ فارم پر لایا گیا ہے' ان کی کتابوں کی اشاعت میں معاونت کرنا' ایوارڈز دینا اور ان کی کتابوں کی بلامعاوضہ دنیا بھر میں ترسیل کرنا! میں اس کا مکمل تعارف لکھ کر ارسال کر رہی ہوں کیوں کہ میں جیکب آباد میں اس اکیڈمی کی ڈائریکٹر ہوں۔ اس کا سالانہ کنونشن 6 اپریل 2013ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ پلیز' اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ اس کی تصاویر میں پرچے کے ای میل ایڈریس پر میل کر دیتی ہوں۔ 8 اپریل کو جس دن ہماری روانگی تھی' اُس روز ہم رضوانہ کوثر کے بے پناہ اصرار پہ اُن کے گھر بھی گئے لیکن زمر نعیم اور نسیم نیازی سے ملاقات نہ ہو سکی۔"

✉ (مور شاہد حسین نظام کی قمبر' شہداد کوٹ سے آمد! (بھائی شاہد! قمبر اور شہداد کوٹ دو الگ الگ نام ہیں۔ ہم خود قمبر کے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ قمبر' شہداد کوٹ ضلع تو ہے لیکن دونوں میں بہت فاصلہ ہے۔) "قابلِ احترام انکل سلیم فاروقی! السلام علیکم! بھلی کرے آیا۔ ہم آپ کو اس حسین محفل میں دلی گہرائیوں سے well come کہتے ہیں۔ اللہ سائیں آپ کو سدا خوش سلامت رکھے۔ (آمین!) انکل' ایک گزارش ہے کہ آنٹی منزہ سہام نے قینچی صاحبہ کو خوب چلایا۔ اب بے چاری تھک چکی ہوگی۔ پلیز' قینچی صاحبہ کو آپ مکمل آرام کرنے دیں تا کہ ہم کچھ باتیں شیئر کر سکیں۔ (اصل میں قینچی صاحبہ فضول باتیں برداشت نہیں کرتیں اور تھکنے کا تو یہ نام بھی نہیں لیتیں۔) بچپن کی محبت راس نہیں آئی۔ (شاہد صاحب! یہ تو آپ کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں' محبت وغیرہ کے لیے تو ابھی عمر پڑی ہے۔) آپی مینا تاج! سالگرہ مبارک ہو۔ صائمہ آپی! سالگرہ اپریل میں تھی اور آپ نے بتایا ہی نہیں؟ سسٹر تحسین جونیجو صاحبہ! پلیز' آپ بھی کوئی تحریر پڑھنے کو دیں نا! یا آپ نے صرف پڑھنے کا ٹھیکہ لیا ہے؟ سدرہ انور علی بہنا! یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ شاہد فراز بھائی! السلام علیکم! کیسے ہیں بھائی' آپ؟ پیارے انکل' کچھ مصروفیات کے باعث چند کہانیاں پڑھی ہیں' بہت پسند آئی ہیں۔ اسرار سے بھرپور ہیں۔ انشاء اللہ' مولا خیر کرے! اگلی بار مکمل تبصرہ کریں گے۔ آنٹی منزہ سہام اور انکل ناصر رضا کی خدمت میں سلام و دعائیں پیش ہیں۔ اب ایک کہانی اور غزل کے ساتھ حاضر ہوں' اگر سچی کہانیاں کے معیار پر پوری اترے تو کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر شکریہ ادا کرنے کا موقع دیں۔ اب اجازت' (آپ کی کہانی اور غزل موصول ہوئی۔ قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں شائع ہو جائے گی۔)"

✉ بورے والا سے رانا محمد شاہد لکھتے ہیں۔ "مئی کا سرِورق پیلے رنگوں کے ساتھ ملا۔ ماڈل کا زوم تھوڑا کم ہوتا تو زیادہ اچھا لگتا۔ گزشتہ دو ماہ سے سرورق بائیں طرف سے جڑا ہوتا ہے' اس کی کوئی خاص وجہ؟ (اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ دو ماہ سے ٹائٹل دو تہہ میں جا رہا ہے۔) ناصر بھائی کے اداریے کے حوالے سے تو یہی کہیں گے کہ حالات اب اتنی جلدی بدلنے والے نہیں ہیں' تبدیلی کا نعرہ اپنی جگہ مگر جو حالات برسوں میں خراب ہوئے ہوں' وہ چند ہفتوں' مہینوں یا برس میں ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ مئی میں الیکشن ہیں۔ دُعا ہے کہ ایسے لوگ سامنے آئیں جو حالات کی بہتری کی بنیاد رکھ دیں کیونکہ جب تک بنیاد ہی صحیح نہ رکھی جائے گی' حالات ٹھیک ہونے کی امید رکھنا کارِ عبث ہے۔ خصوصی خط میں آپ کے استادِ محترم شاہد حسن کی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ رسالے کی سرکولیشن بڑھانے کے لیے خلیل جبار کی تجویز بہت معقول ہے' ویسے بھی آج مارکیٹنگ کا دور ہے' جب تک آپ اپنی چیز کی ایڈورٹائزنگ نہیں کریں گے' اُس کی سیل میں اضافہ نہیں ہوگا۔ ایک طلسماتی کردار "چھلاوہ" پہ راجا صاحب کی تحقیق دلچسپی اور معلومات سے بھرپور تھی۔ رضوان قیوم کی کہانی واقعی عجب کہانی تھی'

دلچسپ اور انفرادیت کی حامل۔ شہید کی ڈائری منزہ سہام کا ایک بہترین سلسلہ ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس میں کسی شہید کا مختصر مختصر تذکرہ بھی ہو تو کیسا رہے گا؟ تاریخی شہرِ خموشاں مکلی قبرستان پہ محمد اقبال زمان کی تحریر بھی اچھی تھی۔ معروف رائٹر پروین حیدر کی ادب سے وابستگی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ سچی کہانیاں جس طرح اپنے پرانے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے' وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ عکاشہ سحر نے خالد احمد کو اچھے الفاظ میں یاد کیا' خالد احمد ایک درویش صفت' وضع دار اور انکسار کا پیکر تھے۔ ان کی بہنیں حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ادب کا ایک بڑا نام ہیں۔ اسی طرح بڑے بھائی توصیف احمد خان کا شمار بھی معروف کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ سہام مرزا صاحب کا آخری صفحہ "بازگشت" آج بھی ہمارے حالات کا حقیقی عکاس ہے۔ الیکشن قریب ہیں' ہر پارٹی اپنی اپنی ڈفلی' اپنا اپنا راگ بجا رہی ہے' جوڑ توڑ کے ذریعے اپنا مفاد بچ جائے' اقتدار مل جائے' ملک رہے نہ رہے۔ ایک گلہ تھا آپ سے' پراسرار نمبر 11 کے حوالے سے گزشتہ دو ماہ سے اس پراسرار نمبر کے لیے لکھنے والوں کا نام ایک اشتہار کی صورت دیتے رہے مگر جب نمبر شائع کیا گیا تو اس میں اس ناچیز کی تحریر نہیں تھی۔ (عین وقت پہ یہ بات ہمارے علم میں آئی تھی کہ آپ کی کہانی نہیں ہے۔) امید ہے' آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔"

✉ (راولپنڈی سے یہ خط ہے ہمارے ہمدمِ دیرینہ محمد سلیم اختر کا' لکھتے ہیں۔ "عزیزہ منزہ بہن' السلام علیکم! امید ہے آپ بہ خیریت ہوں گی۔ دوشیزہ اور سچی کہانیاں کی کامیاب و کامران مدیرۂ اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ کالم نگاری مبارک ہو۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے مجھے آپ کا یہ نیا سفر نہ صرف خوب صورت لگ رہا ہے بلکہ فخر بھی ہو رہا ہے۔ کوشش ہوگی کہ آپ کا کوئی کالم اور کوئی کتاب پڑھنے سے رہ نہ جائے۔ آپ کی مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ برادرم سلیم فاروقی کو احوال کی باگ سنبھالنے پر مبارک باد! خوش آمدید بھائی جی! (شکریہ سلیم بھائی! اب آپ پابندی سے "احوال" میں حاضری بھی لگوائیں گے۔) مئی 2013ء کا پراسرار نمبر 11 سامنے ہے۔ ٹائٹل خوبصورت ہے' "کل کیا ہوگا؟" اس بارے میں اب ہم کیا کہیں کہ کل کیا ہوگا؟ شاید سوال کرتے کرتے اس کا جواب طلب کرتے ہوئے زندگی گزر جائے گی ناصر بھائی! مگر ہمیں اس کا جواب نہیں ملے گا۔ (استاد دامن کا ایک شعر ہے۔

کی ہونا ہے' کی ہووے گا؟
اے سوچ دے' سوچ دے مرجاں گے)

میں ان تمام بہن بھائیوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری والدہ صاحبہ کی وفات پر دکھ کا اظہار کیا اور میرا غم بانٹا۔ بھائی ممتاز احمد' برادرم رانا محمد شاہد' وقاص حسین' بہن نصرت سرفراز' عزیزی تحسین جونیجو' بیٹی مریم شاہ' سدرہ انور علی' کنول عمران خان' بہنا ام عادل' محترم خلیل جبار اور دیگر تمام احوالیو! میں آپ سب کا ممنون ہوں اور آپ کے احساسات اور جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ پروردگار آپ سب کو سکھی رکھے۔ (آمین!) (بھائی سلیم اختر! ہمیں تو اس سانحے کا علم ہی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین!) راجا محمود صاحب نے اسرار کی دنیا کے ایک اہم کردار "چھلاوا" سے بھرپور انداز میں متعارف کرایا ہے۔ مبارکباد کے ساتھ دعائیں اور یہ امید کہ ان کا قلم یوں ہی موتی بکھیرتا رہے گا۔ شہید کی ڈائری "ہر بار دل و دماغ اور سوچ کے نئے باب کھولتی ہے اور یہ آپ کے قلم کا ہنر اور کمال ہے۔ "مداری کا ناٹک" بشیر احمد بھٹی نے عوامی کہانی لکھ کر سچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہانیاں کی شان بڑھائی ہے۔ بھائی سلیم فاروقی کی ''آتشِ جنوں'' حسبِ معمول تیز رفتار اور خون کی گردش تیز کرنے والی تحریر ہے جو عرصہ تک یاد رکھی جائے گی۔ تینوں ناقابلِ یقین کہانیاں واقعی ناقابلِ یقین ہیں۔ بہن پروین حیدر نے جنوں کو بھرپور انداز میں نمایاں کیا ہے۔ ان کی کہانی' ان ہی کی زبانی نے ان کی زندگی کے گوشوں کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی زندگی اور خدمات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ پروین بہن!..... آپ نے خوب اور سچ لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ میری دُعائیں آپ کے ہمراہ ہیں۔ آسیب کہانی میں مریم مسعود کی ''اوور کوٹ'' اور انجم فاروق کی ''پراسرار کمرہ'' نے مزہ دیا' مبارک باد! ارواح کہانی میں مریم شاہ کی ''جیسی کرنی' ویسی بھرنی'' سرِ فہرست رہی۔ جرم و سزا کے موضوع پر بہترین کہانی ہے۔ مریم شاہ! مبارکاں! اندازِ تحریر بھی بھلا تھا۔ عروبہ عدنان اور عذرا فردوس کی کہانیاں بھی واقعاتی لحاظ سے کم نہ تھیں' ان کے لیے بھی مبارک اور دعائیں۔ حنا بشریٰ' سلمیٰ غزل بھی اچھی کہانیاں لے کر آئی ہیں اور پرچے کی رونق میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ''پراسرار محافظ'' خلیل جبار حسبِ معمول چن کر تحریر لائے ہیں۔ ارم زہرا کی میرے شہر کی کہانی اور محمد اقبال زمان کا ''اسرارِ ملکی'' حسبِ معمول رہا۔ ''دملکھنی'' دل میں اترنے والی تحریر ہے۔ ارشد علی ارشد کا قلم دل کو چھو رہا ہے' مبارک باد! سید مستقیم نوشاہی کے خالہ زاد بھائی کی وفات کا دکھ ہوا۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ کوثر سعید کے بھانجے' رانا محمد شاہد صاحب کے والد' سدرہ انور علی کی بہن عائشہ انور کی صحت اور سلامتی کے لیے ڈھیروں دُعائیں۔ پروردگار ان کے ساتھ عافیت والا معاملہ فرمائے۔ (آمین!) بھائی عبدالعزیز جی آ کو بیٹی حنا عزیز کی شادی مبارک ہو۔ پروردگار اس کی ازدواجی زندگی کو حسین بنائے رکھے۔ (آمین!) بہن صفیہ سلطانہ صاحبہ! بیٹے کی منگنی کی مبارک باد قبول کریں۔ دوشیزہ میں بارشوں کی وجہ سے آپ کے گھر کے نقصان کا پڑھا۔ بھائی کے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔ آپ کا مجھ پر ایک احسان ہے جسے میں بھلا نہیں سکتا۔ میری طرف سے اسٹاف کے تمام اراکین کو سلام اور دعائیں۔ یاد آیا' آپ نے مجھے بہترین کارکردگی پر ''سچی کہانیاں'' کے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اب 13 اپریل 2013ء کو مجھے ماہنامہ ''ریشم ڈائجسٹ'' لاہور نے بھی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اس تقریب میں دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے رائٹر ساتھی بھی ایوارڈ لینے آئے تھے۔ بہن نسیم نیازی' زمر نعیم اور شمیم ناز صدیقی کو بھی مبارک باد! ایک تحریر اگست کے شمارہ کے لیے ''آزادی کی قیمت'' کمپوز شدہ جویریہ کے نام سے ارسال ہے۔ (تحریر موصول ہو چکی ہے بھائی......!)''

✉ (اسلام آباد سے نصرت سرفراز لکھتی ہیں۔ ''مدیرِ اعلیٰ منزہ سہام' ناصر رضا صاحب' راجا محمود صاحب اور سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) ماہِ مئی 2013ء کا سچی کہانیاں دیدہ زیب سرورق کے ساتھ 28 اپریل کو ہاتھ میں تھا۔ ماڈل کی ہلکے پیلے لباس میں رونمائی گرمی کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ (کیا پیلا رنگ گرمی کی علامت ہے؟) سرورق ماہِ گزشتہ کی طرح یہ درتہ ہی تھا۔ احوال میں ہر دلعزیز مدیرِ اعلیٰ منزہ سہام قارئین کے درمیان موجود تھیں جنہوں نے آئندہ ماہ سے احوال میں سلیم فاروقی صاحب کی موجودگی کی نوید سنائی' خوش آمدید سلیم صاحب! (بہت شکریہ!) گزشتہ ماہ منزہ سہام سے ٹیلی فون پر گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ احوال میں وہ جس قدر پرخلوص انداز میں احوالیوں کو جوابات دیتی ہیں' ٹیلی فون پر گفتگو میں اور بھی زیادہ پرخلوص اور دوستانہ مزاج کی محسوس ہوئیں۔ میری خوش قسمتی کہ ان سے بات کرنے کا اعزاز حاصل ہوا اور ان کا بہت شکریہ کہ انہوں نے مجھ ناچیز سے بات کرنے کا وقت نکالا۔ احوال میں ان کی کمی شدت سے محسوس

ہوگی۔ اب آتے ہیں رسالے کی جانب' پراسرار نمبر 11' گزشتہ تمام پراسرار نمبروں ہی کی طرح پراسراریت' محیرالعقل واقعات' سسپنس اور ماورائی و آسیبی مخلوقات کے واقعات سے مزین تھا۔ رات میں پڑھنے سے حتی الامکان پرہیز کیا کہ میرا دل ویسے بھی کمزور ہے۔ اگر رات میں حسبِ عادت پڑھتی تو شاید اگلا پورا مہینا ڈرتے ہوئے ہی گزرتا۔ بہرحال یہ جہانِ فانی ایسے واقعات سے بھرا ہوا ہے جسے ہماری معلومات اور علم میں اضافے کے لیے ''سچی کہانیاں'' کی پوری ٹیم نے سہل اور آسان زبان میں بھرپور انداز میں ہم تک پہنچایا۔ یوں تو چھلاوا (راجا محمود) سے لے کر اسرارِ ملکی تک ہر کہانی بھرپور اسرار لیے تھی مگر پھر بھی خاص طور پر مداری کا ناٹک (بشیر احمد بھٹی) کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی' بہترین ٹاپک پر زبردست کہانی رہی۔ شہید کی ڈائری میں منزہ سہام نے گمنام شہید کے ایسے راز افشا کیے جو کامیابی کا راز ہیں۔ واقعی دنیا تو عارضی پڑاؤ ہے' اصل سفر تو آخری سفر ہے۔ کتنی آسان اور سادہ زبان میں انہوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر کی مثال دے کر یہ بتایا کہ زادِ راہ کی کس قدر اہمیت ہے اور اگلے پڑاؤ کی تیاری ہی اصل کامیابی ہے۔ سچ لکھا' اچھا دوست' اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور ہم احوالیوں کو سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اچھے اور پرخلوص دوستوں کی طرح محسوس ہوتی ہے جو بے غرض' بے لوث پیار قارئین میں تقسیم کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک دفعہ احوال میں شمولیت کے بعد دل چاہتا ہے کہ یہ پرخلوص رابطہ برقرار رکھا جائے اور اپنی ہزارہا مصروفیات کے باوجود ہم احوال میں ضرور شامل ہونا چاہتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے تمام لکھنے والے اس رسالے کی کہکشاں میں جھلملاتے ستاروں کی طرح ہیں' دل چاہتا ہے' میرا خط بھی خصوصی خط کے طور پر احوال میں شامل ہو جائے۔ اس دفعہ تو مشکل ہے' شاید یہ آرزو بھی نہ کبھی پوری ہو ہی جائے۔ ایک کہانی' ایک سوچ اور ایک شاعری روانہ کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ اگر قابلِ اشاعت ہوئی تو شاملِ اشاعت کر کے شکریہ کا موقع ضرور فراہم کریں گی۔ واقعی لگتا ہے کہ حالات ساکت ہیں۔ ایک جمود طاری ہے۔ سازشیں' جوڑ توڑ' مفاد پرستیاں جو سہام مرزا (مرحوم) نے 1993ء کے اداریے میں لکھا' آج بھی من و عن یہی ہے۔ قوم کے لیے مئی کا مہینا الیکشن کی نوید لایا ہے' کیا یہ الیکشن ہمارے ملک کی تقدیر بدل دے گا؟ کیا ہم بھی باوقار قوموں کی طرح سر اٹھا کر جینا سیکھ لیں گے؟ ہم 1993ء سے لے کر آج 2013ء تک معجزوں کے انتظار میں ہیں' معجزے بلٹ پروف گاڑیوں میں بیٹھ کر فنِ خطابت کے مظاہرے دکھانے سے نہیں آتے۔

موج بڑھے یا آندھی آئے' دیا جلائے رکھنا ہے
گھر کی خاطر سو دکھ جھیلے' گھر تو آخر اپنا ہے

ویسے بھی بقول سہام مرزا' دیے جلا کے ہوا کی امان میں رکھنا ہی تو ہم خوش عقیدہ لوگوں کا کھیل ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ آنے والے الیکشن کا نتیجہ جو بھی ہو' بس کوئی معصوم جان نہ جائے۔

07 مئی تک مجھے جو خطوط موصول ہوئے' وہ شاملِ احوال کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد جو خطوط موصول ہوں گے' میں آئندہ شمارے میں اُن کی صرف رسید ہی دے سکوں گا۔

اب اجازت دیں۔ زندگی رہی تو آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب
سلیم فاروقی

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اعترافات''

قارئین! ''سچی کہانیاں'' میں آپ کی شرکت اور دلچسپی کے لئے ایک بار پھر مقبول سلسلے ''اعترافات'' کا آغاز کیا جارہا ہے جس میں آپ اپنے تجربات ہمارے ساتھ شیئر کرسکتے ہیں جو کہ آپ کے دل وضمیر پر بوجھ بن گئے ہیں۔ اپنے اس بوجھ کو آپ کاغذ پر منتقل کیجئے اور ہمارے حوالے کر دیجئے اور ہوسکتا ہے آپ کا یہ اعتراف کسی اور کو بھی بھٹکنے سے پہلے راہ راست پر لے آئے، آپ کا یہ اعتراف نہ صرف آپ کا بوجھ ہلکا کرے گا بلکہ معاشرے کے سدھار کا بھی باعث ہوگا۔

راجہ محمود

اُس ''کھیل'' سے اِس ''کھیل'' تک

اوج یعقوبی کا خیال

توفیق عزم ہو تو مسافت کا کیا سوال
منزل یہاں سے پاس نہ منزل یہاں سے دور

کرکٹ کے میدانوں سے سیاست کے خارزاروں تک پھیلی عمران خان کی دلچسپ کہانی

کرکٹر بننا اُس کا شوق تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جنون میں تبدیل ہوتا چلا گیا اور یہ جنون اُس پر اپنے ننھیالی کزنز کو دیکھ کر سوار ہوا تھا حالانکہ وہ ابھی نو برس کا تھا مگر اُس نے قومی کرکٹ ٹیم میں کھیلنے کا خواب دیکھنا شروع کردیا تھا۔ اُن دنوں جاوید برکی اور ماجد خان کا نام کرکٹ کے حوالے سے ملک بھر میں گونج رہا تھا۔ یہ دونوں اُس کے ننھیالی کزنز تھے یعنی اس کی والدہ کے خاندان سے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُس کے دل میں بھی یہ خواہش شدت کے ساتھ انگڑائیاں لیتی تھی کہ وہ بھی اس کھیل میں نام پیدا کرے اور اپنے اُن کزنز کی طرح گیند بلے سے نمایاں کارنامے انجام دے۔ اُس بچے کا تعلق پٹھان فیملی سے تھا اور پٹھان کے دماغ میں جو سودا سما جائے یا وہ جس چیز کے حصول میں لگ جائے، اسے حاصل کرکے ہی چھوڑتا ہے چنانچہ وہ بچہ بھی پڑھنے کے ساتھ ساتھ کرکٹ میں بھی محنت کرنے لگا۔ نیازی قبیلے سے تعلق رکھنے والے اس بچے کا نام عمران خان نیازی تھا۔ اس کے والد اکرام اللہ خان نیازی سول



WWW.PAKSOCIETY.COM

انجینئر اور گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ پنجاب کے شمال مغربی علاقے میانوالی میں برسوں سے رہنے والی یہ پڑھی لکھی اپر مڈل کلاس فیملی اپنی پشتون روایات سے بندھی ہوئی تھی۔

25 نومبر 1952ء کو لاہور میں آنکھیں کھولنے والے عمران خان نے گھر میں جو ماحول دیکھا' وہ عام پٹھان گھرانوں سے قدرے مختلف تھا۔ والدین خود پڑھے لکھے تھے اس لیے تعلیم کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں وہ سختیاں بھی نہ تھیں جو عموماً خواتین کے معاملے میں پٹھانوں میں صدیوں سے نافذ تھیں۔ اکرام اللہ کے پانچ بچے تھے جن میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا عمران تھا' تاہم گھر میں بیٹیوں کو بھی وہی اہمیت دی جاتی تھی جو عمران کو ملتی تھی۔ بیٹیاں بھی اپنی خاندانی روایات میں رہتے ہوئے علم کے زیور سے آراستہ ہو رہی تھیں۔ چونکہ گھر میں کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے عمران کی پرورش چاروں بہنوں کے درمیان ہوئی تھی' شاید یہی وجہ تھی کہ شروع ہی سے اس کی شخصیت میں شرمیلا پن آ گیا تھا۔ وہ اکثر خاموش خاموش سا خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا۔ گھر میں روپے پیسے کی کمی نہ تھی لہٰذا عمران کا بچپن تمام تعیشات کے ساتھ گزرا۔ فرمائش منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی تھی' پلک جھپکتے میں پوری ہو جاتی تھی۔ ماں اور بہنیں بھی اپنے اکلوتے بھائی کے تمام لاڈ پیار کے باوجود تربیت کے معاملے میں کسی بھی لاڈ خوب اٹھاتیں' تاہم اس طرح کا سمجھوتہ نہ تھا۔ باپ کا رویہ یوں تو بچوں کے ساتھ دوستانہ اور پیار و محبت سے لبریز ہوتا تھا مگر جب کسی سے کوئی خطا ہو جاتی تو برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسے موقع پر والد روایتی پٹھان کے روپ میں نظر آتے تھے۔ وہ بچوں کو سرزنش بھی کیا کرتے اور اکثر سزا بھی دیتے۔ تربیت کے اس متوازن عمل کے باعث عمران کو بہت چھوٹی عمر میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ زندگی کچھ خاص اصولوں اور قواعد و ضوابط کے ساتھ گزرتی ہے اور زندگی میں صرف عیش و آرام کی چھاؤں ہی نہیں بلکہ محنت و مشقت کا تپتا صحرا بھی ہے جسے پار کیے بنا کامیابی کا ملنا محال ہے لہٰذا اس نے بچپن میں ہی سوچ لیا تھا کہ زندگی سے جو کچھ حاصل کرنا ہے' اس کے لیے وہ جان توڑ محنت اور کوشش کرے گا اور اپنے مقصد کو حاصل کر کے رہے گا۔ بچپن میں خود سے کیا جانے والا یہ عہد تمام عمر زادِ راہ کی صورت اُس کے ہمراہ رہا اور وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے اس عہد پر مضبوطی سے ثابت قدم رہا۔

عمران کا تعلیمی سلسلہ لاہور کے کیتھڈرل اسکول سے شروع ہوا۔ اس انگلش میڈیم اسکول میں اُس نے ابتدائی کلاسز بہت ہونہاری سے پاس کیں اور پھر اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا جہاں وورسسٹر کے رائل گرامر اسکول میں اس کا ایڈمیشن ہوا۔ انگلینڈ میں کرکٹ سب سے پسندیدہ کھیل ہے اور مختلف کاؤنٹیز کی اپنی اپنی ٹیمیں ہیں جن کے درمیان سال بھر مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں آ کر عمران کو اپنے کرکٹ کے شوق کو بہت جلا ملی اور ماہر کھلاڑیوں کے ہمراہ کھیلتے ہوئے اس کے کھیل میں بھی نکھار آتا گیا۔ انگلینڈ کی ٹھنڈی فضاؤں میں گزرے وہ ماہ و سال عمران کی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اسے بہت کم عمری میں ہی انگریز قوم کو قریب سے دیکھنے اور اُن کے مزاج' عادات اور فطرت کے بارے میں آگاہی ہو گئی تھی جو اُس وقت اُس کے بہت کام آئی جب وہ ایک انٹرنیشنل کھلاڑی کے روپ میں انگلینڈ میں کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے گیا۔ انگلینڈ سے واپسی پر اُس نے لاہور ایچی سن کالج میں داخلہ لیا اور پھر 1972ء میں بیس برس کی عمر میں کیبل کالج آکسفورڈ چلا گیا جہاں


1992ء میں ورلڈ کپ اٹھائے تقریر کرتے ہوئے

فلسفہ' سیاست اور معاشیات جیسے مضامین کا انتخاب کیا۔ کیبل کالج (Keble College) میں اُس نے سیاست میں سیکنڈ کلاس اور معاشیات میں تھرڈ کلاس میں گریجویشن کیا۔ تعلیم کے دوران ہی عمران کے کرکٹ کیریئر کا آغاز ہو گیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے لاہور سے اپنے فرسٹ کلاس کرکٹ کا ڈیبیو (debut) کیا' تاہم یہ کوئی متاثر کن آغاز نہیں تھا۔ اس کی پرفارمنس پھیکی رہی۔ 1970ء کے اوائل میں وہ چند سال لاہور کی مختلف ٹیموں کے لیے کھیلا جن میں لاہور اے' لاہور بی' لاہور گرین اور آخر میں 'لاہور' شامل ہیں۔ فرسٹ کلاس کرکٹ کا یہ عرصہ 1969ء سے 1971ء تک تھا۔ ان چند سالوں میں اُس نے جتنی کرکٹ کھیلی' وہ پی سی بی کے سلیکٹرز کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے کافی تھی۔ یوں ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کے لیے اسے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔

سال 1971ء میں عمران کا ٹیسٹ ڈیبیو ہوا۔ اپنا پہلا ٹیسٹ اُس نے انگلینڈ کے خلاف برمنگھم میں کھیلا۔ وہ عمران کے لیے ایک یادگار دن تھا' اُس روز جب اسے ٹیسٹ کیپ ملی تو فخر سے اس کا سینہ تن گیا۔ گراؤنڈ میں اترتے ہوئے اس کے ذہن میں بس یہی بات گردش کر رہی تھی کہ وہ دنیا بھر میں اپنے کھیل کے ذریعے خود کو منوائے گا۔ قومی ٹیم میں اس کے سفر کا آغاز ہو گیا تھا مگر یہ سفر تسلسل سے جاری نہیں تھا کیونکہ 19 سالہ عمران اُن دنوں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا۔ تعلیمی مصروفیات کے باعث اسے کرکٹ چھوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ اس دوران اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی ٹیم کے لیے بھی کرکٹ کھیلی۔ 1971ء سے 1976ء تک وورسٹر شائر کے لیے کاؤنٹی کرکٹ بھی کھیلی۔ اُس وقت عمران اوسط درجہ کے میڈیم پیس بولر کی شناخت بنا چکا تھا۔ اسی عرصے کے دوران عمران نے پاکستان میں مختلف اداروں کی ٹیموں کے لیے بھی کھیلا جن میں داؤد انڈسٹریز اور پی آئی اے شامل ہیں' یوں اس دوران اُس نے ہر طرح کی کرکٹ کھیلی خواہ وہ فرسٹ کلاس کرکٹ ہو' کاؤنٹی کرکٹ ہو' اداراتی کرکٹ ہو یا پھر قومی کرکٹ۔ اتنی زیادہ اور مختلف ماحول کی کرکٹ سے اس کے کھیل میں تیزی سے نکھار آتا چلا گیا اور وہ بہترین کرکٹر کے روپ میں ابھرنے لگا تھا۔ عمران کے ون ڈے کیریئر کی ابتدا ٹیسٹ کیپ ملنے کے تین برس بعد ہوئی۔ ٹیسٹ کی طرح اپنا پہلا ون ڈے بھی اس نے انگلینڈ کے خلاف ہی کھیلا تھا جو ناٹنگھم کے مقام پر ہوا تھا۔

گریجویشن کرنے اور وورسٹر شائر سے کاؤنٹی کرکٹ کا دورانیہ مکمل کرنے کے بعد 1976ء میں عمران کی واپسی ہوئی تو اس نے باقاعدہ طور پر قومی کرکٹ ٹیم کو جوائن کر لیا۔ اب وہ ٹیم کا مستقل ممبر تھا۔ اُن دنوں 77-1976ء کے کرکٹ سیزن کا آغاز تھا۔ اس سیزن میں اسے نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے خلاف سیریز کھیلنے کا موقع ملا۔ ان دونوں سیریز میں نوجوان عمران پہلے کے مقابلے میں قدرے تیز بولر کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ اس کی رفتار بھی بڑھ گئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی اور اس میں ورائٹی بھی آ گئی تھی' ساتھ ہی مختلف کنڈیشنز کو کس طرح استعمال کرنا ہے' اس گر سے بھی وہ بہت حد تک واقف ہو گیا تھا۔ اب وہ انتہائی مہارت سے یارکر بھی پھینکتا تھا' باؤنسر بھی کرتا تھا' آؤٹ سوئنگ اور ریورس سوئنگ بھی کرتا تھا کیونکہ 1971ء سے 1976ء تک اس نے بہت کرکٹ کھیلی تھی اور ہر قسم کی کنڈیشن میں اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا جس سے وہ منجھ گیا تھا۔ آسٹریلیا کی سیریز کے بعد عمران ویسٹ انڈیز گیا جہاں اس کی ملاقات ٹونی گریگ سے ہوئی جس نے عمران کو کیری پیکر ورلڈ سیریز کرکٹ کے لیے سائن کرلیا۔ اُن ہی دنوں پرتھ میں تیز رفتار بولرز کا مقابلہ ہوا جس میں دنیائے کرکٹ کے اُس وقت کے تمام ہی فاسٹ بولرز نے حصہ لیا۔ اُن میں نوجوان عمران خان بھی شامل تھا۔ اس مقابلے میں اس نے 139.7 کلومیٹر کی رفتار سے باؤلنگ کرا کے دنیا کے تیسرے تیز رفتار باؤلر کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ مقابلہ جیف تھامسن نے جیتا تھا جبکہ دوسرے نمبر پر مائیکل ہولڈنگ رہے تھے' تاہم عمران کے لیے اعزاز کی بات یہ تھی کہ ڈینس للی اور اینڈی رابٹس جیسے بولرز رفتار میں عمران سے پیچھے رہے تھے۔

1982ء وہ سال ہے جب عمران فاسٹ بولر کی حیثیت سے پیک پر نظر آیا۔ اس سال اس نے محض 9 ٹیسٹ میچوں میں 13.29 کی اوسط سے 62 وکٹیں حاصل کیں۔ یہ کسی بھی فاسٹ بولر کا ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں ایک کیلنڈر ایئر میں کم ترین اوسط ہے۔ جنوری 1983ء میں انڈیا کے خلاف کھیلتے ہوئے عمران نے ٹیسٹ باؤلنگ ریٹنگ کے 922 پوائنٹس حاصل کیے حالانکہ اُس وقت باقاعدہ طور پر آئی سی سی کی جانب سے پلیئرز کی ریٹنگز کا کوئی سسٹم نہیں تھا' تاہم عمران کی فارم اور پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے آئی سی سی نے انہیں آل ٹائم ٹیسٹ باؤلنگ رینکنگ میں انہیں تیسرا نمبر دیا تھا۔ عمران کی کارکردگی کا یہ عالم رہا کہ اس نے محض 75 ٹیسٹ میچوں میں تین ہزار سے زیادہ رنز بنانے اور 300 سے زیادہ وکٹیں لینے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ آئن بوتھم کے بعد وہ دوسرے بولر ہیں جس نے تیز ترین وکٹیں لینے کا اعزاز حاصل کیا۔ بوتھم نے یہ کارنامہ 72 ٹیسٹ میچوں میں انجام دیا تھا۔ باؤلنگ کے ساتھ ساتھ بیٹنگ میں بھی عمران کے پاس یہ اعزاز ہے کہ نمبر 6 پر بیٹنگ کرتے ہوئے اس نے 61.86 کی اوسط سے رنز اسکور کیے ہیں۔ عمران کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے قیادت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ 30 سالہ عمران کیریئر کے عروج پر تھے۔ اس موقع پر کرکٹ مبصرین اور ناقدین نے اعتراض کیا کہ کپتانی کے دباؤ سے عمران کی اپنی کارکردگی متاثر ہو سکتی ہے۔ عمران کو شروع میں بطور کپتان کچھ مشکلات پیش آئیں۔ دراصل وہ فطری طور پر ایک شرمیلا نوجوان تھا اور اپنے اس مزاج کی وجہ سے اسے خاصی دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ اس کی



خانگی زندگی کے خوشگوار ایام، خان اپنی سابقہ اہلیہ جمائما کے ساتھ

جھجک کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ساتھی کھلاڑیوں سے کھل کر بات بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے ایک بار عمران نے کہا تھا۔ ''جب مجھے کپتانی دی گئی تو میں بہت پریشان ہوا کیونکہ میں اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے اپنے ساتھی کھلاڑیوں سے بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر مجھے کوئی بات کہنی ہوتی تو میں اپنے ٹیم منیجر کے ذریعے اپنا میسج کھلاڑیوں کو پہنچاتا تھا۔ میرا مطلب ہے ابتدائی دنوں میں ٹیم میٹنگز میں شرم و جھجک کی وجہ سے میں اپنے ساتھیوں سے براہِ راست بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔''

عمران نے 48 ٹیسٹ میچوں میں کپتانی کی جن میں سے 14 میں کامیابی حاصل ہوئی' 8 میں شکست اور 26 ٹیسٹ میچ ڈرا ہوئے۔ اسی طرح بطور کپتان 139 ایک روزہ میچوں میں 77 جیتے' 57 ہارے اور ایک ٹائی ہوا۔ یوں قائد کی حیثیت سے اس کی کامیابی کا تناسب شاندار رہا۔

کپتان کی حیثیت سے اپنے دوسرے میچ میں ہی عمران نے پاکستان کو لارڈز کے میدان میں انگلینڈ کے خلاف شاندار فتح دلوائی۔ یہ جیت اس لحاظ سے بھی شاندار تھی کہ انگلش سرزمین پر پاکستان کو 28 برس بعد فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس میچ میں عمران کی انفرادی کارکردگی اور کپتانی دونوں ہی زبردست رہیں۔ یہی نہیں' قیادت کے پہلے سال خان کی کرکٹ عروج پر رہی۔ اس نے فاسٹ باؤلر اور آل راؤنڈر کی حیثیت سے اپنی کارکردگی سے اُن ناقدین کے منہ بند کردیئے جو کپتانی ملنے پر تنقید کررہے تھے کہ اس کی انفرادی کارکردگی متاثر ہوگی مگر خان کی



عمران خان، جمائما اور لیڈی ڈیانا

کارکردگی دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کپتانی ملتے ہی اس میں نیا جوش بھر گیا ہو۔ بطور کھلاڑی وہ مختلف روپ میں نظر آرہا تھا۔ 82-1981 میں لاہور میں سری لنکا کے خلاف کھیلتے ہوئے اس نے اپنے کیریئر کی بہترین باؤلنگ کرتے ہوئے 58 رنز کے عوض 8 وکٹیں لیں۔ اسی سال انگلینڈ کے خلاف تین ٹیسٹ میچوں کی سیریز میں اس نے نہ صرف 21 وکٹیں لیں بلکہ 56 کی اوسط سے رنز بھی بنائے اور سب سے نمایاں نظر آیا۔ اسی برس روایتی حریف انڈیا کے خلاف عمران کی کارکردگی تو انتہائی شاندار رہی۔ انڈیا کے دورہ پاکستان کے دوران چھ ٹیسٹ میچوں میں اس نے 13.95 کی اوسط سے 40 وکٹیں لیں۔ پوری سیریز میں عمران چھایا رہا' اس کے سامنے کسی بھارتی بیٹسمین کی نہ چلی بلکہ عمران کی

WWW.PAKSOCIETY.COM



عمران خان میں خامیاں سہی مگر لالچی نہیں ہیں، سابقہ اہلیہ جمائما

جمائما خان نے ایک بار عمران کے کردار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے عمران خان کو کچھ رقم ادھار دی تھی جو انہیں واپس مل چکی ہے۔ جمائما کہتی ہیں کہ عمران خان میں بعض خامیاں ہیں مگر وہ جھوٹے اور لالچی نہیں ہیں۔ عمران خان کی سابقہ اہلیہ جمائما خان نے سماجی ویب سائٹ پر اپنے ایک پیغام میں واضح کیا کہ پاکستان تحریکِ انصاف کے چیئرمین لندن کا فلیٹ فروخت کر چکے ہیں اور اس بارے میں وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ جمائما نے کہا کہ عمران خان نے ان سے 2003ء میں کچھ رقم ادھار لی تھی جو اپنا لندن کا فلیٹ فروخت کر کے واپس کر دی تھی۔ ان کا کہنا ہے، عمران خان نے لندن کا فلیٹ کرکٹ کے ذریعے حاصل کی گئی اپنی آمدنی سے خریدا تھا۔ جمائما نے کہا کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ عمران خان سے ان کی طلاق ہو چکی ہے۔ عمران میں کچھ خامیاں ضرور ہیں لیکن وہ جھوٹے اور لالچی انسان نہیں ہیں۔

طوفانی گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے اکثر بھارتی سورماؤں کی ٹانگیں کانپتی تھیں۔ اس سیریز کا اختتام ہوا تو خان بطورِ کپتان ایک سال کے دوران 13 ٹیسٹ میچوں میں 88 وکٹیں لے چکے تھے۔ انڈیا کے خلاف سیریز جہاں ہر لحاظ سے عمران کے لیے شاندار رہی، وہیں تھوڑی تکلیف دہ بھی ثابت ہوئی۔ اس سیریز میں شدید جان ماری کے باعث خان کی پنڈلی میں اسٹریس فریکچر ہو گیا۔ انجری اتنی شدید تھی کہ اسے دو سال سے زائد عرصے تک کرکٹ سے دور رہنا پڑا۔ ایسے موقع پر جب خان اپنی پرفارمنس سے کرکٹ شائقین کو محظوظ کر رہا تھا اور مخالف ٹیموں کے چھکے چھڑا رہا تھا، اس نوعیت کی انجری اس کے لیے خاصی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ جس ٹیمپو اور ردھم کے ساتھ وہ کرکٹ کھیل رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے باآسانی کہا جاسکتا تھا کہ خان کی ریکارڈ بک میں بہت سے کارناموں کا اضافہ ہوتا۔ خان کا علاج حکومتی فنڈ سے ہوا، ان کی انجری 1984ء تک ٹھیک ہوگئی پھر انٹرنیشنل کرکٹ میں خان کی کامیاب واپسی ہوئی۔ 1987ء میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نے خان کی قیادت میں ہندوستان دورہ کیا۔ اس سیریز میں پاکستان نے پہلی بار انڈیا کو انڈیا کی سرزمین پر ٹیسٹ سیریز میں شکست دی۔ اس سیریز کا بنگلور ٹیسٹ انتہائی سنسنی خیز تھا جس میں پاکستانی اسپنرز اقبال قاسم اور توصیف احمد نے پاکستان کو یادگار فتح سے ہمکنار کروایا تھا۔ روایتی حریف کے خلاف اس شاندار فتح پر پوری قوم خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ یہ کوئی معمولی فتح نہیں تھی، انڈیا کو انڈیا میں اس کے اپنے امپائرز کی موجودگی میں ہرانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس وقت نیوٹرل امپائر نہیں ہوتے تھے اور ویسے بھی انڈین امپائرز دنیا میں اپنی جانب داری کی وجہ سے مشہور (بدنام) تھے۔ اس ضمن میں عمران کے حوالے سے ہی ایک واقعہ ہے کہ دورۂ ہندوستان کے دوران ایک ضیافت میں کسی صحافی نے انڈین کپتان سنیل گواسکر سے پوچھا کہ پاکستان کے وہ کون سے دو پلیئرز ہیں اگر وہ انڈین ٹیم میں آجائیں تو آپ دنیا بھر کی ٹیموں کو شکست دے سکتے ہیں؟ سنیل گواسکر نے جواب میں کہا کہ اگر ہمارے پاس جاوید میانداد اور عمران خان ہوتو ہم سب کو ہرا سکتے ہیں پھر یہی سوال لے کر مذکورہ صحافی عمران خان کے پاس گیا۔ خان صاحب نے چند لمحے توقف کیا پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے انڈین ٹیم کا کوئی کھلاڑی نہیں چاہیے بلکہ ان کے امپائر اگر میرے ساتھ ہوں تو میں پوری دنیا کو ہرا سکتا ہوں۔“ یہ جواب دراصل انڈین امپائرنگ پر لطیف طنز تھا۔ بنگلور ٹیسٹ میں بھی پاکستانی کھلاڑی انڈین ٹیم کے ساتھ ساتھ ان کے امپائروں سے بھی نبرد آزما تھے۔ اس ٹیسٹ کی آخری اننگ میں ناقص امپائرنگ کی حد ہوگئی تھی۔



عمران خان اپنے دونوں صاحبزادوں کے ہمراہ میچ دیکھتے ہوئے

سنیل گواسکر، جو پاکستانی جیت کی راہ میں دیوار بنے حائل تھے، وہ کم از کم آٹھ، دس مرتبہ ایل بی ڈبلیو ہو چکے تھے مگر شاید امپائرز تہیہ کر چکے تھے کہ گواسکر کو ایل بی ڈبلیو نہیں دینا ہے۔ کرکٹ کو ان آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے عمران خان نے ہی سب سے پہلے نیوٹرل امپائرنگ کا مطالبہ کیا تھا جس کی بہت زیادہ حمایت ہوئی تھی۔ انڈیا کے بعد پاکستانی ٹیم انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئی۔ انگلینڈ کے ساتھ بھی پاکستانی شاہینوں نے وہی سلوک کیا جو بھارتی سورماؤں سے کیا تھا۔ انگریزوں کو بھی پہلی بار ان ہی کی سرزمین پر ٹیسٹ سیریز میں شکست دی۔ یہ فتح بھی کم نہیں تھی، کرکٹ کے موجدوں کو ان کے ہی ملک میں ہرانا لوہے کے چنے چبانے کے برابر تھا مگر عمران کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے یہ مشکل ترین معرکہ بھی سر کرلیا۔ اُن دونوں کامیاب دوروں کے بعد جب پاکستانی ہیروز وطن واپس پہنچے تو اُن کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ پوری قوم خوشی سے رقصاں تھی، اُن کی ٹیم نے بھارتیوں اور انگریزوں کو ان کے گھر میں پچھاڑ دیا تھا۔ اس جیت سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی تھی کہ عمران ایک جنگجو کپتان ہے اور اس کی قائدانہ صلاحیتوں پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔

سال 1987ء میں ہی ورلڈ کپ کا انعقاد ہوا جس کی میزبانی پاکستان اور بھارت نے مشترکہ طور پر کی تھی۔ پاکستانی ٹیم فل فارم میں تھی، ٹیم میں جاوید میانداد، سلیم ملک، اعجاز احمد سمیت بہترین بیٹسمین تھے تو عمران خان، وسیم اکرم اور عبدالقادر کی صورت میں زبردست باؤلنگ اٹیک تھا۔ قوم کو پوری امید تھی کہ اس بار عالمی کپ کی حقدار پاکستانی ٹیم ہی ہوگی پھر ٹورنامنٹ شروع ہوا تو پاکستان پول میچوں میں اپنے حریفوں کو پچھاڑتا سیمی فائنل تک پہنچ گیا۔ راؤنڈ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے میچ میں اس نے ویسٹ انڈیز جیسی ٹیم کو بھی ہرادیا تھا۔ سیمی فائنل میں پاکستان کا سامنا آسٹریلیا سے ہوا۔ قذافی اسٹیڈیم میں کھیلے جانے والے اس اہم ترین میچ میں کراؤڈ کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ شائقین پاکستان جیت کے لیے پرجوش تھے مگر شام کو جب اس میچ کا نتیجہ آیا تو سب ہی کی توقع کے خلاف تھا‘ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ پاکستان ٹورنامنٹ سے باہر ہوگیا ہے اور حسب سابق ورلڈ کپ کے سیمی فائنل میں ہمت ہار دی ہے۔ بلاشبہ یہ اُس وقت کی مضبوط ترین ٹیم تھی جبکہ ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کا ایڈوانٹیج بھی حاصل تھا مگر محض 18 رنز کی کمی سے پاکستان سے فتح دور ہوگئی اور آسٹریلیا فائنل میں پہنچ گیا۔ دوسری طرف بھارت بھی انگلینڈ کے ہاتھوں شکست کھا گیا اور فائنل میں دو روایتی حریف انگلینڈ اور آسٹریلیا کے مدمقابل ہوئے حالانکہ کرکٹ کے پنڈتوں اور پاک بھارت کرکٹ شائقین کو پوری توقع تھی کہ فائنل میں پاکستان اور بھارت ہی پہنچیں گے لیکن ہوا اس کے بالکل الٹ۔ 1987ء کا وہ ورلڈ کپ آسٹریلیا نے انگلینڈ کو چت کر کے جیت لیا تھا۔

عالمی کپ کے فوری بعد عمران نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ خان صاحب کے اس فیصلے پر کرکٹ کے متوالوں کو شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کے ہیرو میں ابھی بہت کرکٹ باقی ہے پھر کرکٹ کے حلقوں کی جانب سے خان صاحب سے ریٹائرمنٹ واپس لینے کا مطالبہ ہونے لگا مگر خان صاحب کسی طرح بھی واپسی کے لیے راضی نہ ہوئے۔ اُس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی جو کہ ملک کے مطلق العنان صدر تھے۔ جنرل صاحب خود بھی عمران خان کے پرستار تھے‘ چنانچہ ایک روز پریذیڈنٹ ہاؤس میں صدر صاحب نے بذات خود خان صاحب سے ریٹائرمنٹ واپس لینے کی خواہش کی اور عمران اُن کی بات پر انکار نہ کرسکے۔ یوں 1988ء میں کرکٹ کے میدانوں پر عمران کی دوبارہ واپسی ہوئی۔ 18 جنوری 88ء کو خان نے اپنی ریٹائرمنٹ واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ کپتان کی واپسی بہت دھواں دھار انداز میں ہوئی۔ دورۂ ویسٹ انڈیز میں خان نے تین ٹیسٹ میچوں میں 23 وکٹیں لیں اور ٹیسٹ سیریز میں پاکستان کی فتح میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خان اپنی اس پرفارمنس کو یاد کرتے ہوئے اکثر کہتے۔ ”یہ میری آخری بہترین پرفارمنس تھی‘ اس کے بعد میں اس طرح کی باؤلنگ نہیں کرسکا۔“

خان اپنے کھیل کی وجہ سے تو مقبول تھا ہی مگر اس کی پرسنالٹی میں بھی جادو تھا‘ مردانہ وجاہت چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ‘ سرخ و سفید رنگت‘ یہ وہ خوبیاں تھیں جو خان کو خواتین میں مقبول کرتی تھیں۔ اکثر خواتین محض عمران کی وجہ سے ہی اسٹیڈیم آتی تھیں۔ انہیں کرکٹ سے زیادہ عمران بھاتا تھا۔ وہ عمران کو قریب سے دیکھنے‘ اس سے آٹوگراف لینے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے کریزی ہوتی تھیں۔ دنیا کے جس حصے میں بھی عمران نے کرکٹ کھیلی‘ وہاں کی خواتین کو اپنا دیوانہ بنالیا۔ یہی وجہ کہ میڈیا نے عمران کے اسکینڈل بھی بنائے۔ کبھی اسے کسی ہندوستانی اداکارہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو کبھی کسی انگریز عورت سے نتھی کر دیا گیا۔ اس ضمن میں اس وقت کی معروف بھارتی فلمی ہیروئن زینت امان کے ساتھ بننے والے اسکینڈل نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ زینت بھی خان کے لیے پاگل تھی مگر خان نے اس فلمی تتلی سے خود کو بچالیا۔ انگریز خاتون سیتاوائٹ کے اسکینڈل کی کہانی تو بچے بچے کی زبان پر تھی۔ اخبارات نے اس اسکینڈل کو خوب اچھالا تھا۔ سیتا کے بیانات شائع کیے جا رہے تھے جس میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیتا نے دعویٰ کیا تھا کہ عمران اس کے بچے کا باپ ہے۔ یہ اسکینڈل عمران کے لیے بہت زیادہ شرمندگی کا باعث بنا تھا۔ عمران نے سیتا سے تعلق کے حوالے سے اقرار تو کیا تھا مگر اس کے بچے کو اپنی اولاد ماننے سے انکاری تھا۔ یہ اسکینڈل کافی عرصے بعد عمران کے لیے سیاسی میدان میں بھی مشکلات کا باعث بنا تھا۔ خیر، عمران کی کرکٹ زور و شور سے جاری تھی کہ 1992ء کا ورلڈ کپ آ گیا۔ یہ ورلڈ کپ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ہونا تھا۔ خان کے کیریئر کا یہ آخری ورلڈ کپ تھا اور خان اسے ہر صورت میں جیتنے کا خواہش مند تھا۔ جب خان ورلڈ کپ کھیلنے جا رہا تھا تو اس نے بہت یقین کے ساتھ کہا تھا۔ ”ہم ورلڈ کپ جیت کر واپس آئیں گے۔“

اس بار ورلڈ کپ بھی مختلف انداز میں ہو رہا تھا۔ ٹیموں کے لیے مختلف رنگوں کی یونیفارم مخصوص کی گئی تھی۔ سرخ گیند کی بجائے سفید گیند سے تمام میچز تھے اور ڈے نائٹ میچز بھی تھے۔ ٹورنامنٹ شروع ہوا، پاکستان اپنا پہلا ہی میچ ویسٹ انڈیز کے خلاف ہار گیا پھر انڈیا سے بھی شکست ہوئی۔ جنوبی افریقہ نے بھی پاکستانی ٹیم کو شکست کا داغ لگا دیا۔ انگلینڈ کے خلاف میچ میں بارش نے یاوری کی اور پاکستان ممکنہ شکست سے بچ گیا۔ دونوں ٹیموں کو ایک ایک پوائنٹ مل گیا۔ ٹیم کی اس کارکردگی پر پاکستانی میڈیا نے بڑا کرکٹ مبصرین اور ناقدین نے ٹیم پر بھرپور تنقید کی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ٹیم کا سیمی فائنل کھیلنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ پوری قوم مایوس تھی، پاکستانی ٹیم اگر مگر کی صورت حال سے دوچار تھی مگر اس وقت ایک شخص تھا جس سے مایوسی اور ناامیدی کوسوں دور تھی اور وہ تھا کپتان خان! اگلا میچ آسٹریلیا جیسی ٹیم سے ہونے والا تھا۔ میچ سے ایک رات قبل خان نے اپنی ٹیم کو جمع کیا اور ان میں نیا جوش و جذبہ جگایا۔ انہیں کہا کہ اب بھی ہم ورلڈ کپ جیت سکتے ہیں، ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ حوصلہ مند کپتان کی باتوں سے ٹیم کو نئی تحریک ملی۔ اگلے دن ٹیم نے آسٹریلیا کے خلاف جان لڑا دی اور ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد آسٹریلیا کو اس کے ہوم گراؤنڈ پر شکست دے دی۔ اس جیت نے پاکستانی ٹیم میں جیسے نئی روح پھونک دی اور پاکستان اپنے بقایا میچز بھی جیتتا ہوا سیمی فائنل میں پہنچ گیا جہاں اس کا مقابلہ نیوزی لینڈ جیسی مضبوط ترین ٹیم سے تھا۔ واضح رہے، نیوزی لینڈ راؤنڈ میچز میں سوائے پاکستان کے تمام ٹیموں سے جیتا تھا۔ سیمی فائنل انتہائی سنسنی خیز ہوا اور آخری لمحات میں پاکستان نے یہ میچ جیت لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان نے ورلڈ کپ کا سیمی فائنل جیتا تھا ورنہ ہر بار اس کی سانسیں سیمی فائنل ہی میں اکھڑ جاتی تھیں۔ اس جیت پر پوری قوم خوشی سے نہال تھی۔ اب عالمی کپ محض ایک میچ کی دوری پر تھا۔ فائنل میں انگلینڈ کی ٹیم مدمقابل تھی۔ میلبورن کرکٹ گراؤنڈ پر کھیلے جانے والے اس فائنل میں اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پاکستان نے پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے اچھا ٹارگٹ دیا جس میں عمران خان اور جاوید میانداد کی ذمہ دارانہ اننگز بھی شامل تھیں۔ ورلڈ کپ کے اہم ترین میچز میں کپتان اپنی ٹیم کو سہارا دینے کے لیے خود ون ڈاؤن پوزیشن پر آنے لگا تھا حالانکہ وہ بنیادی طور پر ایک باؤلر تھا اور چھٹے نمبر پر کھیلتا تھا مگر اس نے ٹیم کا مورال بلند کرنے کے لیے ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی جس سے باقی ٹیم ممبران کو بھی حوصلہ ملا۔ خان نے صحیح معنوں میں کپتان ہونے کا حق ادا کیا تھا۔ انگلینڈ کی بیٹنگ شروع ہوئی تو پاکستانی باؤلرز نے شروع میں ان کی اہم ترین وکٹیں گرا دیں مگر پھر ایلن لیمب دیوار بن گئے۔ ایک موقع پر ایسا نظر آ رہا تھا کہ میچ پاکستان



WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ہاتھ سے نکل رہا ہے مگر پھر کپتان نے وسیم اکرم کو باؤلنگ تھمائی اور یہ دانش مندانہ فیصلہ پاکستان کو میچ میں واپس لے آیا۔ وسیم اکرم نے اوور کی ابتدائی دو گیندوں پر دو وکٹیں گرا دیں۔ پہلے ایلن لیمب پھر کرس لوئس۔ دونوں بولڈ آؤٹ ہوئے تھے۔ اس تباہ کن اوور کے بعد انگلینڈ سنبھل نہیں پایا اور ٹارگٹ کے تعاقب میں مسلسل اس کی وکٹیں گرتی رہیں۔ اننگ کی آخری وکٹ خان نے لی تھی۔ جوں ہی ان کی گیند پر رمیز راجہ نے مڈ آف پر کیچ پکڑا۔ پاکستان ورلڈ کپ جیت گیا۔ پوری قوم خوشی سے جھوم اٹھی۔ قمری حساب سے وہ رمضان کا مہینہ تھا یعنی رمضان



خان ایک سیاسی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے

کی بابرکت ساعتوں میں قدرت نے پاکستانیوں کو ورلڈ کپ کی خوشیوں سے نوازا تھا۔ یقیناً پاکستان کو ایک ایسی جیت سے ہمکنار کیا تھا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ورلڈ کپ اٹھانے کے بعد عمران نے اپنی تقریر میں کینسر ہاسپٹل بنانے کے عزم کا اظہار کیا تھا جسے وہ اپنی ماں شوکت خانم کے نام پر بنانا چاہتا تھا۔

عمران کی والدہ شوکت خانم اصولوں پر زندگی گزارنے والی ایک بااصول خاتون تھیں۔ وہ ایک ایسی ماں تھیں جن کے زیر سایہ تربیت پانے والی اولاد ملک و قوم کے لیے سراسر فائدہ مند ہوتی ہے۔ اس معاملے میں وہ علی برادران کی والدہ اور بی اماں سے کسی طور کم نظر نہیں آتیں۔ مادرِ عمران دین و دنیا کو اس طرح ساتھ لے کر چلیں جیسا کہ اسلام درس دیتا ہے۔ وہ ایک سلجھی ہوئی خاتون تھیں اور معاشرتی، تہذیبی، معاشرتی، گھریلو، ہر قسم کے معاملات کو بہت سگھڑپن سے حل کرتی تھیں۔ عمران کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ جب شوکت خانم کینسر کے ہاتھوں یہ جہان چھوڑ گئیں تو عمران کی زندگی جیسے اندھیر ہو گئی۔ خود عمران کا کہنا ہے کہ انہیں زندگی کا سب سے بڑا دکھ ماں کی وفات کی صورت میں ملا۔ ان لمحے عمران نے سوچ لیا تھا کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض کے خلاف جہاد کرے گا اور پاکستان میں ایک ہسپتال بنائے گا۔ ورلڈ کپ کی جیت سے اسے اپنا خواب حقیقت بنتا نظر آ رہا تھا۔ ورلڈ کپ کی فتح کے بعد اس نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا، تاہم بعد میں عمران نے خودنوشت سوانح حیات میں اپنی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ورلڈ کپ کے بعد ہونے والے انگلینڈ کے

دورے پر جانا چاہتا تھا مگر چند کھلاڑی نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ سیریز کھیلوں کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کہیں میں انہیں مجبور کروں گا کہ ورلڈ کپ کی جیت پر ملنے والی انعامی رقم وہ میرے کینسر ہسپتال کے لیے عطیہ کریں حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد خان نے مختلف برطانوی اور ایشیائی اخبارات میں کرکٹ پر کالمز اور آرٹیکلز لکھنا شروع کر دیے۔ ان کے کالمز انڈیا کے آؤٹ لک، دی گارڈین، دی انڈیپینڈنٹ اور دی ٹیلی گراف جیسے اخبار و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ اپنے ایک آرٹیکل میں عمران نے انکشاف کیا کہ کاؤنٹی کرکٹ کے میچ میں وہ بال ٹیمپرنگ بھی کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے لکھا تھا۔ ”میں نے ہمیشہ سے ناخن سے بال کو کھرچا ہے البتہ ایک بار بوتل کا ڈھکن استعمال کیا ہے۔ یہ 1981ء کے ایک کاؤنٹی میچ کی بات ہے، سسیکس اور ہیمپشائر کا میچ ہو رہا تھا، میں بولنگ کر رہا تھا، بال میں کوئی موومنٹ نہیں تھی، چنانچہ میں نے 12ویں کھلاڑی سے بوتل کا ڈھکن منگوایا اور پھر اس سے بال کھرچنے لگا۔“ ایک بار عمران نے اپنے آرٹیکل میں ایلن لیمب اور آئن بوتھم کے خلاف کچھ ریمارکس لکھ دیئے جس پر دونوں انگلش کھلاڑیوں نے اسے عدالت میں گھسیٹ لیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ عمران نے ان کی ہتک کی ہے۔ جب کیس چلا تو 12 ججز کی جیوری میں سے دس نے عمران کے حق میں فیصلہ دیا اور جج نے ان ریمارکس کے ساتھ کیس خارج کر دیا کہ یہ ایک فضول مقدمہ ہے۔

خان نے برطانیہ اور ایشیا کے بڑے نیٹ ورکس چینلز کے لیے کمنٹری بھی کی جس میں بی بی سی اردو اور اسٹار ٹی وی نیٹ ورکس اور ٹین اسپورٹس شامل ہیں۔ خان کرکٹ تجزیہ نگار کی حیثیت سے بھی چینلز پر نظر آئے۔

یوں تو عمران نے 1991ء سے کینسر ہسپتال کے لیے فنڈ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا تھا، تاہم کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے چار سال بعد اس نے پوری توجہ اس کام پر لگا دی۔ پاکستان میں پہلے کینسر ہسپتال کی تعمیر اس کا خواب تھا اور اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے وہ شب و روز عطیات جمع کرنے نکلا۔ اس نے دنیا بھر سے 25 ملین ڈالرز جمع کیے اور شوکت خانم کینسر ہاسپٹل کی بنیاد رکھ دی۔ اس ہسپتال کا افتتاح 29 دسمبر 1994ء کو لاہور میں ہوا۔ اس ہسپتال کا مقصد ان غریب افراد کو کینسر کے علاج کی سہولت فراہم کرنا تھا جو باہر جا کر یا مہنگے ہسپتال میں علاج کروانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ شوکت خانم میں ایک مریض کے علاج پر جتنا خرچ آتا ہے، اس کا 75 فیصد ہسپتال برداشت کرتا ہے اور صرف 25 فیصد مریض کے ذمے ہوتا ہے۔ عمران اس ہسپتال کے چیئرمین ہیں۔ عمران کی نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے پاکستانی قوم نے بھی ہسپتال کے معاملے میں اس کی دل کھول کر مدد کی۔ عمران نے بھی قوم کے ایک ایک پیسے کو پوری دیانت داری کے ساتھ اس کارِ خیر میں لگایا۔ خان کی دیانت کے حوالے سے پارٹی کے ایک رہنما اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ ایک بار عمران خان صاحب کراچی تشریف لائے۔ میں انہیں لینے کراچی ایئرپورٹ گیا۔ عمران کا بیگ لوڈر کے ہاتھ میں تھا اور عمران اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ عمران نے مجھے دیکھتے ہی آواز دی اور قریب آنے پر گلے لگاتے ہوئے مجھ سے بولے۔ ”یار......! تیرے پاس سو روپے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں خان صاحب......!“

تو کہنے لگے۔ ”اس لوڈر کو دے دو۔“

میں نے لوڈر کو سو روپے دیئے اور اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھوں سے خان صاحب کا بیگ لیا پھر ہم دونوں چلتے ہوئے ایئر پورٹ سے نکلے۔ باہر گاڑی کے پاس کھڑے ہوکر عمران نے اپنی جیب سے سو سو روپے کے دس نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یار......! تُو یہ مت سمجھ کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں' دیکھ' پورے ہزار ہیں لیکن یہ میرے نہیں ہیں بلکہ دوبئی ایئر پورٹ پر مجھے ایک بچی نے شوکت خانم اسپتال کے لیے دیئے ہیں۔ میں اگر اس میں سے سو روپے نکال کر لوڈر کو دے دیتا تو یہ میری بددیانتی ہوتی جو میرے لیے کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔''

خان صاحب جہاں جہاں ہسپتال کے چندے کے لیے گئے' لوگوں نے انہیں لاکھوں روپے بغیر مانگے دیئے۔ یہ عمران کی نیک نیتی کا ثمر تھا۔

عمران میں خدمتِ خلق کا جذبہ نیا نہیں تھا۔ ہسپتال کے قیام سے پہلے بھی اس نے سماجی کاموں میں حصہ لیا تھا۔ 1990ء کے دوران خان نے یونیسیف کے خصوصی نمائندہ برائے کھیل کے لیے بھی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش' پاکستان' سری لنکا اور تھائی لینڈ میں صحت کے مختلف پروگراموں میں بھی کام کیا ہے جبکہ وہ لندن میں کرکٹ کے ایک خیراتی ادارے میں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

شادی' خان کی زندگی کا وہ فیکٹر رہا ہے' جس پر وہ ہمیشہ خاموش رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میڈیا میں اس کی شادی کے معاملے پر بہت کچھ لکھا گیا۔ عورتیں اس کی دیوانی تھیں' خواہ وہ پاکستانی ہوں یا ہندوستانی یا پھر انگریز عورت لیکن عمران نے کبھی بھی اپنی شادی کے حوالے سے کھل کر بات نہیں کی۔ جب اس سے سوال کیا جاتا کہ وہ کسی پاکستانی لڑکی کو اپنی دلہن بنائے گا یا پھر یہ اعزاز کسی غیر ملکی خاتون کو حاصل ہوگا؟ اس سوال پر وہ مسکرا کر رہ جاتا اور مول انداز میں ایسی بات کرتا کہ لوگ اس جواب میں اصل معنی تلاش کرنے لگتے۔ اکثر خیال تھا کہ عمران پاکستانی لڑکی سے ہی شادی کرے گا اور لڑکی اس کے خاندان کی ہی ہوگی مگر دوسری طرف عمران کے تعلقات انگلینڈ میں گولڈ اسمتھ سے استوار ہوگئے تھے' ویسے بھی برطانیہ کے اونچے گھرانوں کی تقریبات میں خان کو مدعو کیا جاتا کیونکہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ انگلستان میں گزرا تھا کرکٹ سے ہٹ کر بھی مقامی فیملیز سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔ ان ہی میں سے ایک گولڈ اسمتھ خاندان بھی تھا مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اس فیملی کی جمائما نامی ایک لڑکی کے ساتھ خان کا رومانس پروان چڑھ رہا ہے جب تک محبت کی اس کہانی کی خبر میڈیا تک پہنچی' تب تک دونوں ایک دوسرے کو شریکِ زندگی بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

16 مئی 1995ء کو پیرس میں جمائما گولڈ اسمتھ اور عمران خان ایک پروقار تقریب میں ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بن گئے۔ یہ تقریب روایتی پاکستانی تقریب تھی جس میں دونوں جانب کے خاندان کے افراد اور خصوصی دوست واحباب نے شرکت کی تھی۔ یہ شادی 21 جون کو انگلینڈ میں ایک سول تقریب میں رجسٹرڈ ہوئی۔ بعد میں سرے میں واقع گولڈ اسمتھ ہاؤس میں ریسپشن رکھا گیا جس میں لندن کی طبقۂ اشرافیہ نے شرکت کی تھی' گویا خان کی شادی دو مرتبہ ہوئی' ایک بار پاکستانی انداز میں اور دوسری بار برطانوی رسم و رواج کے مطابق۔ شادی کے فوری بعد یہ نیا نویلا جوڑا ہنی مون کے لیے روانہ ہوگیا۔ ہنی مون کے یہ حسین دن عمران نے اپنے سسر جیمز اسمتھ کے اسپین میں واقع ایک فارم ہاؤس میں گزارے تھے۔ ہنی مون منا کر جب یہ جوڑا پاکستان پہنچا تو زمان پارک لاہور میں ایک تقریب میں مبارک باد کے لیے آنے والے افراد کے سامنے عمران نے اعلان کیا کہ جمائما اسلام قبول کر چکی ہے اور اب اپنے نام کے ساتھ خان لگایا کریں گی۔ شادی کے وقت ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت عمران کو سال کے چار ماہ انگلینڈ میں گزارنا تھے جبکہ بقیہ مہینے میں اسے پاکستان میں رہنا تھا۔ عمران کے دو بیٹے سلیمان عیسیٰ اور قاسم پیدا ہوئے' تاہم یہ شادی بقول عمران خان کے' بہت مشکل ثابت ہوئی۔ جب عمران نے سیاسی پارٹی کے قیام کا اعلان کیا تو یہاں کی انٹیلی جنس ایجنسیز اور مذہبی' سیاسی پارٹیوں کے کان کھڑے ہوگئے کیونکہ جمائما خان یہودی نسل کی تھی' اسی نکتے پر مذہبی پارٹیوں نے عمران پر تنقید شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ عمران کو یہودیوں کی آشیرواد حاصل ہے اسی لیے وہ پاکستانی سیاست میں قدم رکھ رہا ہے تاکہ اس کے پس پردہ یہودی پاکستان میں اپنے عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

شوکت خانم کینسر ہسپتال کی کیمپین میں جمائما خان نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے اپنے شوہر کی سپورٹ کرتے ہوئے راولپنڈی میں خواتین کی ایک سیاسی ریلی کی قیادت بھی کی تھی۔ دونوں کی شادی شدہ زندگی بہت خوشگوار انداز میں گزر رہی تھی کہ آہستہ آہستہ اس تعلق میں جانے کس طرح دراڑیں پڑتی چلی گئیں۔ ایک روز جمائما اچانک انگلینڈ چلی گئی جس پر یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ یہ شادی بحران کا شکار ہے۔ اس موقع پر جمائما کی طرف سے پاکستانی اخبارات میں اشتہار شائع کروایا گیا جس میں ان افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا۔ ''یہ سچ ہے کہ میں لندن آئی ہوں لیکن میں یہاں ماسٹرز ڈگری کے لیے تعلیم حاصل کرنے آئی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ عمران اور میرے درمیان کوئی رنجش ہے' میں عارضی طور پر آئی ہوں اور تعلیم حاصل کر کے واپس پاکستان میں ہوں گی۔'' تاہم جمائما کی اس وضاحت کے باوجود حالات اس بات کے اشارے دے رہے تھے کہ دونوں کے درمیان سب کچھ اچھا نہیں ہے' دھواں اٹھ رہا تھا جس کا مطلب تھا' آگ کہیں نہ کہیں لگی ہوئی ہے پھر 22 جون 2004ء کو تمام افواہوں کی تصدیق ہوگئی۔ اُس روز اعلانیہ طور پر عمران نے جمائما کو طلاق دے دی اور یوں یہ نو سالہ شادی شدہ تعلق اختتام پذیر ہوا۔ بعد میں عمران خان نے بتایا کہ جمائما کے لیے پاکستانی ماحول میں ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ عمران کے مطابق' طلاق کا فیصلہ کرنے میں انہیں چھ ماہ لگے تھے۔ طلاق کے بعد زندگی میں اسے مشکل ترین دنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جمائما دونوں بیٹوں کو لے کر برطانیہ چلی گئی۔ طلاق کے معاہدے کے تحت دونوں بیٹے اسکول کی چھٹیوں میں پاکستان آسکتے ہیں جبکہ بقیہ سال بھر برطانیہ میں اپنی نانی کے پاس رہیں گے۔ اگر اس دوران عمران کو اپنے بیٹوں سے ملنا ہو تو وہ برطانیہ جا کر اپنے بیٹوں سے مل سکتا ہے۔ طلاق کا معاملہ خوشگوار انداز میں طے ہوا تھا۔ میڈیا کو مرچ مسالا لگانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ عمران اور جمائما نے باہمی رضامندی سے ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر دیا۔ طلاق کے بعد بھی دونوں کے تعلقات خوشگوار رہے تھے۔ عمران خان کے سیاسی مخالفین اس پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص گھر نہیں سنبھال سکا' وہ ملک کیا سنبھالے گا حالانکہ ان عقل کے اندھوں کو سوچنا چاہیے کہ عمران کے گھر ٹوٹنے کی وجہ یہ سیاست تھی' وہ اپنی پارٹی پاکستان تحریک انصاف کی وجہ سے اپنی نجی زندگی کو وقت نہیں دے پا رہا تھا جس کے باعث اس کا گھر متاثر ہو رہا تھا مگر اسے قوم کی فکر تھی گویا اس نے اپنے بڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر (پاکستان) کی فکر میں اپنے چھوٹے گھر کی خوشیاں قربان کردی تھیں۔ اس کی تمام تر دلچسپیوں کا محور صرف پی ٹی آئی تھی جس سے اس کی خانگی زندگی متاثر ہوگئی تھی۔

بیوی کے جانے کے بعد عمران خان اب اسلام آباد میں واقع 300 کنال پر پھیلے بانی گالا فارم ہاؤس میں تنہا رہ گئے تھے۔ یہ فارم ہاؤس مرگلہ کی پہاڑی پر واقع تھا جہاں سے پورے اسلام آباد اور راول جھیل کا نظارہ ہوتا تھا۔ اس خوبصورت مقام پر خان نے یہ فارم ہاؤس اپنی بیوی کے لیے بہت محبت سے بنوایا تھا اور اس کی تعمیر کے لیے کچھ رقم جمائما سے بھی ادھار لی تھی، بعد میں خان نے اپنا لندن والا فلیٹ فروخت کر کے جمائما کو یہ رقم واپس کردی تھی۔ اس شاندار فارم ہاؤس میں خوبصورت بنگلہ، ایک آفس، بہت سے لانز اور سوئمنگ پول تھا۔ اس میں مختلف النوع کے پھلوں کے درخت، گندم کے کھیت اور گائیں، بھینسیں اور کتے وغیرہ بھی تھے۔ عمران نے اپنے بیٹوں کے کھیلنے کے لیے ایک کرکٹ گراؤنڈ بھی بنوایا تھا۔ دونوں بیٹے جب بھی چھٹیوں پر پاکستان آتے، یہاں کرکٹ کھیل کر انجوائے کرتے تھے۔ خان کا آبائی گھر زمان پارک لاہور میں بھی ہے جہاں وہ اپنا بیشتر وقت گزارتے ہیں۔ اس گھر میں خان کا بچپن اور لڑکپن کے ابتدائی ایام گزرے تھے۔

گوکہ خان نے پاکستانی قوم کی فلاح کے لیے ایک ہسپتال قائم کردیا تھا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ قوم ہر لحاظ سے پس رہی ہے۔ اس ملک پر قدرت کی بے شمار فیاضیاں تھیں۔ یہاں چاروں موسم تھے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام تھا۔ یہاں پہاڑ تھے۔ جنگلات تھے، سمندر تھا، دریا تھے، نباتات، جمادات تھے، زمینی خزانے تھے۔ غرض کیا ہے جو اس ملک میں نہیں تھا۔ کمی تھی تو صرف ایک ایسی قیادت کی جو انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرسکے اور اس ملک کے وسائل اس کے لوگوں پر خرچ کرے۔ اس استحصالی نظام کو ختم کیا جائے جہاں مزدور تو بھوکا سوئے اور سرمایہ دار کا دسترخوان انواع واقسام کے کھانوں سے سجا ہو۔ جہاں چور ڈاکو لٹیرے تو حکمران بن جائیں اور حق دار رُلتا پھرے۔ ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد کپتان خان نے ایک فیصلہ کیا، ایک جدوجہد کا فیصلہ جو یقیناً آسان نہ تھی بلکہ یہ طویل اور تھکا دینے والی تھی مگر آہنی حوصلوں سے بنا خان ہر مشکل سے ٹکرانے کو تیار تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فیصلہ کیا اور سیاست کے خارزار میں قدم رکھ دیا۔ 1996ء میں اس نے ایک سیاسی پارٹی پاکستان تحریکِ انصاف کے نام سے قائم کی۔ اس کے قیام کا مقصد سیاست کو تمام آلودگیوں سے پاک کرنا تھا، تاہم 1997ء کے انتخابات میں عمران کی پارٹی کوئی نشست حاصل نہ کرسکی کیونکہ اس وقت اس کے قیام کو محض ایک سال ہوا تھا۔ 1999ء میں جنرل پرویز مشرف نے نواز حکومت پر شب خون مارا تو عمران خان نے اس عمل کی حمایت کی تھی کیونکہ اُس وقت عمران کا خیال تھا کہ مشرف ہر قسم کی کرپشن کو ختم کردے گا اور سیاسی مافیاز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ بعد میں عمران، جنرل مشرف کی حمایت پر قوم سے شرمندہ تھا۔ مشرف نے 2002ء کے انتخابات کے بعد عمران خان کو وزیراعظم بننے کی پیشکش بھی کی تھی جسے خان نے ٹھکرا دیا تھا کیونکہ خان کا مقصد وزیراعظم بننا نہیں بلکہ اس استحصالی نظام کا خاتمہ تھا۔ 2002ء کے انتخابات میں عمران میانوالی کے حلقے سے کامیاب ہوا تھا اور یوں اپنی پارٹی کا واحد ممبر تھا جو الیکشن جیت کر پارلیمنٹ تک آیا تھا۔ اس الیکشن میں تحریک انصاف نے محض 0.8 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے۔ پارلیمنٹ میں خان

کشمیر کی اسٹینڈنگ کمیٹی اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا حصہ بھی رہا اور اس نے بین الاقوامی تعلقاتِ عامہ، تعلیم اور انصاف کے لیے قانون سازی پر بھی آواز اٹھائی۔ خان نے مشرف حکومت کی پالیسیوں پر کھل کر تنقید بھی کی اور اس کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف احتجاج بھی کیا لہٰذا 3 نومبر 2007ء کو جب جنرل پرویز مشرف نے ایمرجنسی نافذ کی تو عمران کو گھر میں نظر بند کردیا گیا۔ عمران نے ایمرجنسی لگانے پر مطالبہ کیا تھا کہ مشرف کو پھانسی کی سزا دی جائے۔ اس نے ایمرجنسی کو غداری کے مترادف قرار دیا تھا۔

تحریک انصاف کو اصل عروج 30 اکتوبر 2011ء کو ملا جب خان نے لاہور میں تقریباً ایک لاکھ افراد کے جلسے سے خطاب کر کے ملک کی سیاسی تصویر کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس جلسہ میں عوام کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ لوگوں کو عمران کی صورت اپنا حقیقی لیڈر مل گیا تھا اور عوام تبدیلی کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس جلسہ میں لوگوں کے جمِ غفیر کو دیکھ کر خان نے اس جوش وجذبے کو "سونامی" کا نام دیا۔ تقریباً 2 ماہ بعد 25 دسمبر کو عمران نے کراچی میں اس سے بھی بڑا جلسہ کیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جلسے میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ افراد شریک تھے۔ یہ تحریک انصاف کا دوسرا بڑا جلسہ تھا جس نے ملکی سیاست میں ہلچل مچادی اور لوگ دوسری سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر تحریک انصاف جوائن کرنے لگے۔ مسلم لیگ (ن) کے جاوید ہاشمی اور پیپلز پارٹی کے شاہ محمود قریشی وہ نمایاں نام تھے جو اپنی اپنی جماعتوں کو خدا حافظ کہہ کر تحریک انصاف میں شامل ہوئے تھے۔ عمران نے اصولی سیاست کو اپنا ہتھیار بنایا۔ سیاست میں اس سے جب جب اور جہاں جہاں غلطیاں ہوئیں، ان پر وضاحتیں دینے کے بجائے انہیں کھلے دل سے تسلیم کیا۔ اس نے ڈرون حملوں کے خلاف جنوبی وزیرستان میں احتجاجی ریلی بھی نکالی اور ثابت کیا کہ وہ ایک جینوئن لیڈر ہے۔ پاکستان کا کوئی سیاست دان ایسی ہمت و حوصلہ کا مظاہرہ نہیں کرسکا کہ جس علاقے میں ڈرون حملے ہورہے ہوں، وہیں احتجاج کیا جائے۔

ان دنوں کپتان خان الیکشن 2013ء کی مہم میں مصروف ہے۔ روزانہ کئی کئی جلسے کررہا ہے، اس کے جلسوں میں عوام کا جوش وجذبہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان اس کا بازو ہیں اور وہ ایک نیا پاکستان بنانے کے جذبے سے سرشار ہے۔

مارٹن لوتھر کنگز نے ایک خواب دیکھا تھا مگر عمران نے اب تک زندگی میں جتنے خواب دیکھے، وہ سب پورے ہوئے۔

اس نے نو برس کی عمر میں پاکستان کرکٹ ٹیم میں کھیلنے کا خواب دیکھا اور ایک دن وہ پاکستان ٹیم کا حصہ بنا۔

اس نے دنیا کا بہترین آل راؤنڈر بننے کا خواب دیکھا اور محض نو برسوں میں اس نے یہ کر دکھایا۔

اس نے ورلڈ کپ جیتنے کا خواب دیکھا اور یہ خواب بھی سچ ثابت ہوا۔

اس نے کینسر ہسپتال قائم کرنے کا خواب دیکھا اور پانچ برسوں میں ہسپتال قائم ہوگیا۔

اس نے یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا اور نمل یونیورسٹی بنا ڈالی۔

اب سے چند ماہ قبل اس نے خواب دیکھا تھا کہ پاکستان تحریک انصاف نے پورے ملک میں کلین سوئپ کیا ہے اور پاکستانی عوام سڑکوں پر خوشی سے ناچ رہے ہیں۔ آج جب چار مئی کو یہ مضمون لکھا جارہا ہے، عمران کے خواب کی تعبیر کے لیے محض چند دن باقی ہیں، اگر اس کا یہ خواب بھی پورا ہوا تو یقیناً اس ملک کے لوگوں کو بقول عمران، ایک نیا پاکستان ملے گا۔

......☆☆......

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس ماہ کی خاص کہانی — یہ کہانی اس شمارے کا خصوصی حصہ ہے

محمد سلیم اختر

مسیحا اور موت

یاسمین صہباء کا خیال

کتنی چاہت سے تو نے لوٹا ہے
تیری چاہت کی بات کون کرے

ایک مسیحا کا قصہ، خاص جو درد کی عجیب دوا دیتا تھا



1985ء میں جب میں فیملی کے ہمراہ راولپنڈی شفٹ ہوا تو رہائش چٹیاں ہٹیاں میں ایک کرائے کے مکان میں رکھی۔ ہمارے اڑوس پڑوس میں سب ہی اچھے اور مخلص لوگ تھے۔ جلد ہی ہم محلے کے لوگوں میں گھل مل گئے۔ اُن میں سب سے نمایاں گھر ماسی فضلاں کا تھا۔ ماسی فضلاں کا حقیقی نام تو فضل بیگم تھا مگر محلے والے انہیں ماسی فضلاں کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے۔ وہ اپنے گھر میں تنہا رہتی تھیں۔ سنا تھا کہ تقسیم ہند کے وقت اُن کا سارا خاندان پاکستان کے نام پر شہید ہوگیا تھا۔ وہ اندر سے تو نہایت دکھی تھیں مگر اُن کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رقصاں رہتی تھی۔ وہ لوگوں کے کام آکر خوشی محسوس کرتیں۔ ہر ایک کے دکھ اور سکھ میں برابر کی شریک ہوتیں جیسے وہ اُن کا اپنا دکھ ہو، اپنی خوشی ہو۔ محلے کی بچیاں اُن سے قرآن مجید پڑھنے جاتی تھیں۔ اُن کا کوئی ذریعۂ آمدن نہ تھا۔ محلے کے مخیر لوگ اُن کی مدد کر دیتے تھے۔ وہ ہر ایک کی ماسی تھیں، چھوٹا کیا، بڑا کیا، ہر کوئی اُن کو ماسی فضلاں کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ ہم سب گھر والے بھی جلد ہی اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ میں اکثر اُن کو سلام کرنے جاتا اور اُن سے ڈھیروں دُعائیں لیتا۔ اس دوران میں میں نے کئی بار باتوں باتوں میں اُن کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہا لیکن وہ ٹال جاتیں مگر میں نے بھی عہد کرلیا تھا کہ میں اُن کا ماضی جان کر کے ہی رہوں گا کیونکہ پتا چلا تھا کہ ماسی فضلاں جنہوں نے شادی نہیں کی تھی، اُن کے ماضی کی کہانی بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

…………*……*

1990ء کے سردیوں کے دن تھے کہ ماسی فضلاں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ میں اُن کو اسپتال لے گیا۔ وہاں وہ تین دن داخل رہیں، تین دن بعد اُن کی طبیعت سنبھلی تو میں اُن کو واپس گھر لے آیا مگر اَب وہ نہایت ہی نڈھال ہوگئی تھیں اور چارپائی کی ہی ہو کر رہ گئیں۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ اُن کے جگر اور گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے لہٰذا اب وہ زیادہ عرصہ نہ جی سکیں گی۔ یہ جان کر مجھے بہت ہی پریشانی ہوئی۔ اُس وقت ان بیماریوں کا اتنا جدید علاج نہ تھا مگر میں نے پھر بھی بیٹا بن کر اُن کی تیمارداری جاری رکھی اور انہیں یہی کہتا رہا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی، ساتھ ہی محلے کا ہر فرد اُن کی صحت اور سلامتی کے لیے دُعاگو تھا۔

ایک رات عشاء کی نماز کے بعد ماسی فضلاں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگیں۔ ”میری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں، میرا بلاوا بس آنے ہی والا ہے۔ میں اس دنیا سے جانے سے پہلے تمہیں اپنا ماضی سنانا چاہتی ہوں تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور میں چین سے مر سکوں۔“ اُن کی بات سن کر میں ہمہ تن گوش ہوگیا اور وہ ماضی کو یاد کرنے لگیں۔

…………*……*

”میں جب چھوٹی تھی تو مجھے ساون کی گھٹائیں بڑی پیاری لگا کرتی تھیں۔ جالندھر، امرتسر اور خاص کر انبالہ کے حسن کو انبالہ والے ہی بیان کر سکتے ہیں۔ گھٹائیں گھر گھر کر آتی تھیں تو موروں کے رقص اور نغموں سے آموں کے پیڑ بھی جھومنے لگتے تھے۔ ہم کتنی ہی ساری لڑکیاں پاگلوں کی طرح کھیتوں میں کدکڑے لگاتیں یا پیڑوں پر بندروں کی طرح چڑھتی اترتی پھرتی تھیں مگر یہ سلسلہ ایک حد تک ہوتا تھا۔ انبالہ کے دیہاتوں میں مسلمان گھرانے پردے کے سخت پابند تھے، مجھے بھی چودہ برس کی عمر میں پردے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

اُس سال بھی ساون کی گھٹائیں گرجتی کڑکتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئیں اور موروں نے کُوک کُوک کے سُریلے نغموں اور رقص کی دلفریب اَداؤں سے ساون کا استقبال کیا۔ آم کے پیڑوں کی ہریالی ہر سال کی طرح نکھر کر آئی تھی مگر میں گھر میں قید تھی۔ جی میں آتا تھا کہ بغاوت کر کے اٹھ بھاگوں۔ ساون کے ہنگاموں میں گھر کی قید کا ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا اور پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مجھے رہائی مل گئی مگر ایسے حالات میں جن کا میں تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں جو تین تین، چار چار برسوں سے گھروں میں قید تھیں، میری ہی طرح گھروں سے نکل آئی تھیں۔ ساون کی وہی سیاہ گھٹائیں گِھر گِھر کر چھا رہی تھیں، موروں کی وہی کُوک سنائی دے رہی تھی جس پر میں دل و جان سے فدا تھی۔ میری تمام سکھی سہیلیاں جو پردوں میں قید کرلی گئی تھیں، گاؤں کے کھیتوں میں ہجوم کی صورت میں نظر آ رہی تھیں مگر کوئی بھی لڑکی ہنس نہیں رہی تھی، کدکڑے نہیں لگا رہی تھی، ہم میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آم کے پیڑ پر جا چڑھتی۔ اُس روز پیڑ پیڑ اور پتا پتا ہمارا دشمن ہو گیا تھا۔ گھٹاؤں سے پانی نہیں، خون برس رہا تھا، موروں کی نغمگی میں کُوک نہیں، جگرخراش ہُوک تھی...... کیوں کہ فسادی ہندوؤں اور سکھوں کے ’جے کارے‘ اور ’واہگورو کی فتح‘ کا شور موروں کے غل سے بہت بلند تھا۔

............*......*

وہ 1947ء کا ساون تھا، گھٹائیں غیض و غضب سے گرج رہی تھیں۔ ہندو کی مسلم کش درندگی سے پیڑ اور پودے بھی لرز رہے تھے۔ مسلمانوں کو جنگِ آزادی جیت جانے کی سزا دی جا رہی تھی۔ ہماری بدنصیبی یہ کہ ہم اپنے دیس سے بہت دور تھے۔ اب انبالہ اور انبالے کا یہ چھوٹا سا گاؤں جسے ہم کیسری کہا کرتے تھے، ہمارا وطن نہیں رہا تھا۔ اب کیسری کا ساون ہمارا ساون نہیں تھا۔ مجھے اسی ساون سے ... تھا۔ میں نے اِسی ساون کے حسن میں جنم لیا تھا ... مجھے اسی ساون سے نفرت ہو گئی۔ میں اپنے ... گھٹائیں دیکھنے کو بے تاب ہو گئی۔ مجھے یقین تھا ... پاکستان کا ساون اور اُس کی گھٹائیں اِس سے ... خوبصورت ہوں گی۔

گاؤں کے بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد ... نقدی، زیورات اور جو کچھ وہ اٹھا سکتے تھے اٹھا ... گھروں سے نکل آئے تھے۔ خون کا طوفان ابھی ... ہمارے گاؤں تک نہیں پہنچا تھا۔ اطلاع ملی تھی کہ ... فسادیوں کا طوفان تیزی سے چلا آ رہا ہے۔ ہمارے ... گاؤں اور ارد گرد کے چار پانچ دیہات سے ’جے ... کارے‘ اور ’واہگورو کی فتح‘ کے نعرے اٹھتے تھے ... ہمارے مردوں نے دو اڑھائی گھنٹوں کی معرکہ آرائی ... سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا جو فسادی ہمارے ... مردوں کی کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے بچ نکلے تھے ... بھاگ گئے تھے۔ وہاں تین ہندو گھرانے ایسے ... جو پانچ نوجوان لڑکیوں اور دو عورتوں کو مسلمانوں ... کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ مسلمانوں ... نے انہیں پناہ میں لے لیا تھا لیکن مسلمان جانتے تھے ... کہ جو فسادی، بلوائی بھاگ گئے ہیں، وہ انتقام ... کے لیے بلوائیوں کی ایک مسلح فوج کو ساتھ لائیں ... گے۔ ہمارے جوان مرد بھاگنے پر آمادہ نہیں ... کہتے تھے کہ مقابلہ کر کے نکلیں گے تا کہ بلوائی یہ ... کہیں کہ مسلمان بھاگ گئے ہیں یا بزدل ... بزرگوں نے بڑی مشکل سے انہیں قائل کیا کہ ’’ہمیں ... زندہ و سلامت پاکستان پہنچنا ہے۔ اگر ہم مقابلے ... میں ڈٹ گئے تو عورتوں کی آبرو خطرے میں ... جائے گی۔‘‘ سو تین چار گاؤں کے مسلمان، عورتوں ... اور بچوں کو ساتھ لیے قافلے کی صورت میں ... پڑے تھے۔ اتنی بیل گاڑیاں ساتھ تھیں جن میں ...

... سا گئی تھیں۔ بوڑھے، بچے، مریض اور چند ایک لڑکیاں سا گئی تھیں۔ ہندو پولیس نے ہمیں انبالے کے مہاجر کیمپ میں جانے کا مشورہ دیا تھا جو ہمارے بزرگوں نے قبول نہ کیا تھا اور ہم تمام تر اثاثہ انبالے کے گردونواح میں چھوڑ کر پاکستان کی سمت چل پڑے تھے۔

............*......*

وہ ایک تاریخی سفر تھا جو موت کے سائے میں ہوا۔ اپنوں کے خون میں سب نہائے، بچوں کو سینے سے لگائے، زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر بیل گاڑیوں میں ڈالتے، ہندو اور بلوائیوں سے جگہ جگہ لڑتے، مقابلہ کرتے، شاہ راہوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر کانٹوں اور تپتی زمین پر چلتے چلے گئے تھے۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ چلتے وقت ہمارے قافلے میں شامل لوگوں کی تعداد کتنی تھی، بس اتنا ہی یاد ہے کہ جب ہم واہگہ پہنچے تو ہماری گیارہ بیل گاڑیوں میں ستاون (57) لاشیں تھیں جن میں اکیس لاشیں دو برس سے سات برس کے عمر کے بچوں کی تھیں اور قافلے کی تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔

اس قافلے کے ساتھ میرے دو بڑے بھائی بھی چلے تھے جو انبالے سے کوئی تیس میل دور بلوائیوں کے ایک حملے کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اُس معرکے میں ہمارے قافلے کے چھ مرد اور بارہ بچے شہید ہوئے تھے اور جو ہندو اور سکھ بلوائی ہلاک ہوئے اُن کی تعداد یقیناً پچاس سے زیادہ تھی۔ ہمارے مرد لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور تلواروں سے مسلح تھے، تین شکاری بندوقیں اور دو پستول بھی تھے۔ عورتوں کے پاس چھریاں اور چارہ کاٹنے والے ٹوکے تھے۔ پہلے دو حملوں میں ہم کم سن لڑکیاں اور بچے چیخ چیخ کر روئے تھے لیکن اس کے بعد ہم میں ایسا انقلاب آیا تھا کہ واہگہ تک ہم پر پندرہ، سولہ حملے ہوئے مگر کوئی ایک بھی ایسا بچہ نہ تھا جو دہشت سے رو پڑا ہو۔ تین چار برس کے بچوں کو تو میں نے کافروں سے پتھروں سے لڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

پاکستانی سرحد سے سولہ، سترہ میل دور ہم پر آخری حملہ ہوا تھا۔ ہمارا قافلہ نہ صرف تھکا ماندہ اور بھوکا پیاسا تھا بلکہ آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ بلوائیوں کی تعداد کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کے ہجوم میں ہمارا کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ’’یاعلیؓ مدد!‘‘ اور ’’اللہ اکبر!‘‘ کے نعروں کی گرج تو سنائی دے رہی تھی لیکن توقع یہی تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے گا۔ ہم جو لڑکیاں تھیں، سروں پر دوپٹے لپیٹ کر جانیں کھیل کر لڑیں۔ بلوائیوں کی اس کمزوری سے ہم لڑکیوں نے خوب فائدہ اٹھایا کہ وہ ہمیں پکڑنے کے لیے لپکتے تھے اور اس طرح ہمارے ہاتھوں کٹ جاتے تھے، ایسے میں اچانک مشین گنوں اور رائفلوں کے چلنے کی آواز آئی تھی۔ ہم سمجھے کہ ہندو فوج آ گئی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی کافر کے ہاتھ چڑھ جانے سے پہلے اپنے آپ کو ختم کرلوں گی......

لیکن وہاں صورت کچھ اور ہی تھی۔ آنے والے فوجی ’’یاعلیؓ!‘‘ کے نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک ہی دو فوجیوں نے مجھے اپنے درمیان کرلیا تھا اور ایک نے پنجابی زبان میں کہا تھا۔ ’’کُڑیے......! ساڈے نال رئیں۔‘‘ (لڑکی......! ہمارے ساتھ رہنا۔) میں نے ایک ہندو سے پوچھا۔ ’’تم کون ہو؟‘‘ معرکے کے شور و غل میں مجھے یہی کچھ سنائی دیا تھا۔ ’’پاکستانی......! پاکستانی......!‘‘

وہ پاک فوج کے جوان تھے جنہوں نے ہمیں حصار میں لے لیا تھا۔ میرے دل میں یہ احساس پختہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں میرے وہی سگے بھائی تھے جو انبالے سے تیس میل دور شہید ہو گئے تھے اور اب بھی یہ عالم ہے کہ مجھے تنہائی میں اپنے بھائی یاد آتے ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو وہ دیہاتی لباس میں نہیں ہوتے بلکہ خاکی وردی پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں سنگینیں لگی رائفلیں ہوتی ہیں اور مجھے اُن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ”ہمارے ساتھ رہنا گوہیئے......!“ پھر مجھے ایسی رُوحانی طاقت مل جاتی ہے کہ دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی نہ حالات کی تلخی کا احساس رہتا ہے۔

یہ تو ہمارے سفر کی مختصر سی روداد ہے جو صرف میری نہیں بلکہ ہر اُس مسلمان کی داستان ہے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ ہر قافلے کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا جو ہمارے ساتھ ہوا۔ یہ کہانی، ہزاروں، لاکھوں بار سنائی جا چکی ہے۔ مجھے اَب نجانے کیوں یہ خوف رہنے لگا ہے کہ پاکستانی قوم کی کوئی ایسی نسل نہ آ جائے جو اس کہانی کو بھول جائے یا جس تک یہ کہانی پہنچ ہی نہ سکے۔ میں اس کہانی میں اتنا اضافہ ضرور کروں گی کہ اگر کسی پاکستانی کے دل میں بھولے سے بھی یہ خیال آ جائے کہ ہندوستان اور پاکستان کی دوستی ہو سکتی ہے تو میں اُسے پاکستانی کبھی نہیں کہوں گی

پاکستان میں داخل ہو کر میرا ایک اور ایسا سفر شروع ہو گیا جو ہجرت کے سفر سے بھی زیادہ کٹھن تھا۔ میری عمر چودہ سال تھی۔ والد صاحب کو فوت ہوئے چھ سال گزر گئے تھے۔ میرے دو بڑے بھائی تو ہجرت کے دوران شہید ہو گئے تھے، اَب ہمارے کنبے میں امی جان، میں اور میرے دو چھوٹے بھائی تھے۔ سرحد پار ہمارا اپنا مکان اور خالی زمین تھی۔ پاکستان میں آئے تو ہمارے پاس چند تولے سونا زیورات کی صورت تھا جس کی لاگت سات، ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن وہ ساڑھے چار ہزار میں فروخت ہوئے۔ اس رقم کے بل بوتے پر ہم نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ امی نے سلائی کی مشین لے لی اور گھر گھر سے کام لا کر گھر کا نظام چلانے لگیں۔ خدا اُن مقامی گھر والوں کو اس نیکی کا اَجر دے کہ وہ بعض اوقات ہمیں محض دینے کے لیے کام دیتے تھے مثلاً ایک روز ایک عورت اپنی قمیص لائی جو ایک جگہ سے ذرا سی اُدھڑی تھی۔ امی نے چند ہی منٹ میں مشین پھیر دی۔ اُس عورت نے امی کو پیسے دیئے تو امی نے لینے سے انکار کر دیا اور بولیں۔ ”یہ بھی کوئی کام ہے جس کے پیسے لوں!“

عورت نے بڑے پیار سے کہا۔ ”بہن...... میں دراصل تمہاری مدد کرنا چاہتی تھی، قمیص تو ایک بہانہ ہے۔“

ہماری رہائش کا مسئلہ ایک چھوٹے سے متروکہ مکان نے حل کر دیا تھا۔ دونوں بھائیوں کو اسکول داخل کرا دیا۔ محلے کی عورتوں نے میری امی کو مشورہ دیا کہ میری شادی کر دیں۔ انہوں نے ایک مقامی گھرانے میں آیا رشتے کا پیغام بھی دیا لیکن میں نے اِس سوچ اور ارادے سے انکار کر دیا کہ امی کو سلائی والے کام سے فارغ کرنے کے لیے خود کماؤں گی اور چھوٹے بھائیوں کو بھی اچھی تعلیم دلواؤں گی۔ میں اپنے ارادوں کو شادی کی زنجیروں میں نہیں جکڑنا چاہتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ میری تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ گاؤں کے اسکول میں چار جماعتیں پڑھی تھیں۔ انگریزی کی تو اے بی سی بھی نہیں آتی تھی۔

اس دوران میں محلے کی ہم عمر لڑکیاں میرے پاس آنے لگی تھیں تو اُن سے میری بہت دوستی ہو گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی طبیعت کی شگفتگی کو مرنے نہیں دیا تھا۔ میرے سینے میں جو زخم تھے وہ پاکستان کی خاطر کھائے تھے۔ میں نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ رونے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا، کوئی ذرا سی بھی شگفتہ بات کہہ دے تو میں قہقہہ لگا کر ہنسا کرتی تھی۔ اس رویئے سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے بھی ہنسی مذاق کا ڈھنگ آ گیا اور اس عادت نے مجھے بے شمار سہیلیاں عطا کیں۔ اِن سہیلیوں نے مجھے یہ انعام دیا کہ وہ میری خواہش کے مطابق مجھے انگریزی اور اُردو پڑھانے لگیں، یوں ایک سال کے عرصے میں میں نے سہیلیوں سے اتنی انگریزی اور اُردو پڑھ لی کہ بغیر مدد کے اگلا سبق خود پڑھ لیتی تھی۔ ڈیڑھ سال اور گزرا تو میں نویں جماعت کی انگریزی کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو گئی۔ مجھے کسی امتحان میں تو نہیں بیٹھنا تھا اس لیے اُردو اور انگریزی کے اور مضمون کی طرف توجہ نہ دی البتہ اپنے طور پر تاریخ وغیرہ کا مطالعہ کر لیتی تھی۔

میرا رُجحان ڈاکٹری کی طرف تھا جو محض ایک خواب تھا۔ میں نے اپنی اس خواہش کا ذکر اپنی سہیلیوں سے کیا تو انہوں نے میرا تعارف ایک نرس سے کرا دیا۔ وہ ایک بھلی عورت تھی جو ایک اسپتال میں ملازم تھی۔ فارغ اوقات میں وہ دائی کا کام بھی کرتی تھی۔ وہ ٹیکے بھی لگا لیتی تھی۔ اس نے میری خواہش کو دیکھ کر مجھے ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ وہ کبھی کبھی مجھے اسپتال بھی لے جاتی اور ڈاکٹر سے چوری چھپے مجھے کچھ تربیت دیتی۔ میں نے چند مہینوں میں زخموں کی مرہم پٹی اور انجکشن لگانے کا عملی تجربہ حاصل کر لیا۔ ساتھ ہی دوائیوں کے نام اور ان کے فوائد بھی یاد کر لیے اور پھر میں ڈاکٹروں کے نسخے بھی پڑھنے کے قابل ہو گئی۔

دو سال کی محنت کے بعد میں پختہ کار نرس اور دائی بن گئی۔ میں نے زچگی کے چار کیس سنبھالے اور بڑی خوش اسلوبی سے نباہ لیے۔ میں اَب اس پیشے کو ذریعہ معاش بنانا چاہتی تھی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں نے اس پیشے میں مہارت حاصل کر لی تھی اور دوسری وجہ جو میرے نزدیک زیادہ اہم تھی، وہ یہ تھی کہ مجھے مریضوں کی تیمارداری کر کے رُوحانی مسرت حاصل ہوتی تھی لیکن میں بغیر کسی سرٹیفکیٹ کے، کسی اسپتال میں تو ملازمت کر ہی نہیں سکتی تھی...... لیکن یہ مشکل اس طرح حل ہو گئی کہ جس نرس نے مجھے ٹریننگ دی تھی، اُس نے مجھے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے ہاں ملازمت دلوا دی۔ اُس نے کہا تھا کہ ”ڈاکٹر مجھے دو سو روپے ماہوار تنخواہ دے گا۔“ میرے لیے یہ رقم خاصی رقم تھی کیونکہ میں نہ تو تعلیم یافتہ تھی اور نہ ہی باقاعدہ تربیت یافتہ!

وہ بوڑھی نرس مجھے ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئی تھی۔ اُس ڈاکٹر کا نام سہراب خان تھا اور کلینک کا نام بھی سہراب کلینک تھا۔ ڈاکٹر سہراب ادھیڑ عمر تو تھا لیکن نہایت ہی وجیہہ اور خوبرو آدمی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا اور آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھول کر کتنی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے میری محسن نرس کی طرف دیکھا اور بڑی ہی بے تکلفی سے بولا۔ ”بہت قیمتی نرس لائی ہو!“

نرس نے ہنس کر کہا۔ ”بولیے، کیا دیں گے؟“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”دو سو روپے ماہوار۔ اگر میری مرضی کے مطابق نکلی تو تنخواہ مزید بڑھا دوں گا۔“ پھر اُس نے ایک نسخہ لکھا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے تمام دواؤں کے نام صحیح پڑھ لیے تھے۔

وہ میری ملازمت کا پہلا دن تھا، کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا کہ میں کس قدر خوش تھی۔ بوڑھی نرس نے مجھے ڈسپنسری کے دروازے پر روک کر رازداری اور پیار سے کہا تھا۔ ”بیٹی...... تم میں دو خطرناک نقائص ہیں، ایک یہ کہ تم جوان ہو، دوسرا یہ کہ تم بہت ہی خوبصورت ہو، کام محنت سے کرنا لیکن ڈاکٹر سے ذرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دور دور ہی رہنا۔''

میں اپنی کامیابی پر اتنی مسرور تھی کہ نرس کی اس بات پر ذرہ بھر توجہ نہ دی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں نوجوان اور خوبصورت ہوں۔ میری عمر کا اکیسواں برس شروع ہو چکا تھا۔ میں آئینہ ہر روز دیکھا کرتی تھی لیکن کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ میری شکل وصورت اچھی ہے یا بری! یقین جانو کہ مجھے اپنی صورت میں اکثر اپنے شہید بھائیوں کے خدوخال نظر آیا کرتے تھے۔ میں نے شہیدوں کے چہرے پر سرخی پاؤڈر کبھی نہیں تھوپا تھا۔ اب تو میں اپنی ماں اور بھائیوں کے لیے 'مرد' بن گئی تھی اور مرد تو میک اپ نہیں کرتے ناں! لیکن چند روز بعد ہی ڈاکٹر نے مجھے یہ احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ میں نہایت ہی حسین لڑکی ہوں۔ اُس نے جب مجھ سے ہجرت کی داستان سنی تو میرے دل میں بے چارگی اور بے بسی کا احساس ابھرنے لگا لیکن میں نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا تھا۔ یہی تو میرا کمال تھا کہ میں اپنے آپ کو کمزور اور بے بس لڑکی سمجھتی ہی نہ تھی' میں نے دکھوں اور غموں پر فتح پالی تھی مگر ڈاکٹر اداسی اور یاسیت سے بھرپور جملے کہہ کہہ کر مجھے غموں میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔ ابتدا میں تو میں اُسے پدرانہ شفقت سمجھتی رہی اور ڈاکٹر کی شکل وصورت میں مجھے اپنے والد صاحب نظر آتے رہے تھے۔

ڈاکٹر سہراب کے اُس چھوٹے سے اسپتال یا ڈسپنسری میں مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا ڈسپنسر پہلے سے ملازم تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے صرف عورتوں کے لیے ملازم رکھا تھا۔ اس علاقے میں چار اور ڈاکٹرز بھی تھے لیکن علاقے کے تمام مریض ڈاکٹر سہراب کے پاس ہی آتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر سہراب شگفتہ مزاج تھا' مریضوں کی اوٹ پٹانگ باتوں سے کتنا ہی کیوں نہ اکتا جائے اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب نہ ہوتی تھی۔ وہ مریض جتنا وقت مانگے' اتنا ہی وقت دیتا تھا اور سب سے بڑی خوبی تو اُس میں یہ تھی کہ مریضوں کے لیے جذباتی سہارا تھا۔ وہ لاعلاج مرض والے مریضوں کو مرنے تک زندگی سے مایوس نہیں ہونے دیتا تھا۔ اگر کسی مریض کو اُس کے گھر دیکھنے جاتا تو فیس نہیں لیتا تھا نہ ہی اُس نے مشورے کی کوئی فیس رکھی ہوئی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ میری اور بوڑھے ڈسپنسر کی یہ حالت ہوتی تھی کہ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اور شام چھ بجے سے رات دس بجے تک مریضوں کو دوائیاں دینے سے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔

وہ میری ملازمت کی آٹھویں شام تھی۔ رات کلینک کا وقت ختم ہوا تو ڈاکٹر نے بوڑھے ڈسپنسر کو کلینک بند کرنے کا کہتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''ذرا میرے ساتھ آؤ۔'' میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میں نے اُس سے اُس کے بیوی بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اکیلا رہتا ہے اور گھر کا کام کاج اور کھانا پکانا ایک ملازمہ کرتی ہے۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے بڑے پیار سے میرے بال پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں اتنی مشقت کرتے دیکھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔'' مجھے اُس کی یہ حرکت بہت ہی پیاری لگی تھی پھر وہ میرے بالوں میں انگلیاں الجھا کر بولا تھا۔ ''تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

میں نے اُسے بتایا کہ میں امی اور چھوٹے بھائیوں کے لیے آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا اور دکھی سی آواز میں بولا۔ ''تمہارا باپ ہوتا' بڑے بھائی زندہ ہوتے تو تمہاری یہ بھولی بھالی سی جوانی اور خوبصورتی مریضوں اور دوائیوں کی بدبو میں تباہ نہ ہوئی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایسی آہ بھری جو غم سے بھری ہوئی تھی۔

میرے دل پر تو جیسے غموں کی سل گر پڑی اور میرے آنسو بہہ نکلے۔ ڈاکٹر کبھی میرے ہاتھوں کو سہلاتا اور کبھی میرے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس طریقے کی باتیں کرتا رہا جن میں میرا درد اور رنج والم تھا۔

میں کبھی کبھی امی کے ساتھ دکھ سکھ کی باتیں کر لیا کرتی تھی لیکن تھوڑی سی دیر کے لیے مگر جب ڈاکٹر نے میرے دکھوں کی بات چھیڑ دی تو مجھ میں یہ تلخ احساس بیدار ہو گیا کہ میں بہت دکھی اور مظلوم ہوں اور میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔ میرے من میں ایک عجیب سا جذبہ طاری ہونے لگا اور میں کسی مرد کی پناہ کی ضرورت محسوس کرنے لگی۔ ڈاکٹر کی باتیں مجھے قائل کر رہی تھیں کہ میرا مونس وغم خوار یہی مرد ہے۔ چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھوں سے چھڑانے کے بجائے اس کے دونوں ہاتھوں کو بہت مضبوطی سے تھام لیا تھا اور میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی اور یہ سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا تھا۔

ملازمہ نے کھانے کی اطلاع دی تو ڈاکٹر نے مجھے کھانے کے لیے روک لیا۔ میں نے اُس کی دعوت قبول کر لی۔ کھانے کے دوران بھی وہ میرے ہی متعلق باتیں کرتا رہا اور اس نے دو تین بار کہا کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے اور پھر جب میں گھر کو روانہ ہوئی تو وہ تھوڑی دور تک میرے ساتھ آیا۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک اندھیری جگہ رک کر اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور مجھے اپنے قریب کر کے ایک ہاتھ میرے بالوں میں پھیرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے ابا جان زندہ ہوتے تو مجھے پریشان دیکھ کر اسی طرح میرے سر پر ہاتھ رکھ لیتے۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر سر اس کے سینے سے لگا دیا تھا۔

میں نے اپنے گھر آ کر امی کو ساری بات کہہ سنائی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کی نیت پر شک نہ کیا لیکن امی کچھ چپ سی ہو گئیں پھر کہنے لگیں۔

''بیٹی......! دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں لیکن برے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ تم نادان ہو۔''

''بس امی......! بس۔'' میں نے امی کو کچھ اور نہ کہنے دیا تھا۔

............*......*

دن اسی طرح گزرتے رہے تھے' ڈاکٹر سہراب ہر دوسرے' تیسرے دن مجھے اپنے گھر لے جاتا اور میرے ساتھ ہر طرح کی باتیں کرتا اور پھر ایک روز میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دو سال قبل اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس کی ایک بچی تھی جسے اس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں نے ان دونوں کے متعلق مزید بہت پوچھا لیکن اس نے کھل کر کوئی بات نہیں کی' وہ شاید انہیں زندگی اور دل سے اتار دینا چاہتا تھا۔ ان کے ذکر سے وہ اداس اور بے چین سا ہو گیا تھا' یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بیوی نے اس سے وفا نہیں کی تھی۔ اگر ڈاکٹر مجرم ہوتا تو وہ دوسری شادی کر چکا ہوتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں ڈاکٹر سے کچھ زیادہ ہی گھل مل گئی' اس کی عمر مجھ سے دگنی تھی مگر وہ اس قدر زندہ دل تھا کہ میں اسے اپنا ہم عمر دوست سمجھنے لگی تھی' یوں ہماری بے تکلفی بڑھتی گئی لیکن میں نے اس کے احترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا' وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گفتگو کے دوران میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ سہلاتا رہتا اور کبھی کبھی میرے بالوں میں انگلیاں پھرنے لگتا تھا۔ میں نے اس کی ان حرکات پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ میں اسے اپنا ہمدرد اور باپ کی سوچ و مرتبے والا آدمی سمجھتی تھی اور میرا ذہن اور ضمیر پاک اور صاف تھا۔ اس نے دراصل میرے دل میں غم بیدار کردیا تھا اور یہ احساس بھی کہ میں ایک نوجوان، حسین اور لاوارث لڑکی ہوں۔ وہ جب میرے درد کی باتیں کرتا تھا تو مجھے ایک انوکھا سا سکون محسوس ہونے لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اسے اپنا غم خوار سمجھنے لگی تھی۔

ایک روز بوڑھے ڈسپینسر نے مجھے بہت ہمدردی اور پیار سے کہا تھا۔ ''بیٹی! مجھے تمہاری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن تم کم سن، بھولی اور ناتجربہ کار لڑکی ہو اس لیے تمہیں خطروں سے آگاہ کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سہراب ایک اچھا انسان نہیں ہے، وہ تم جیسی دو تین لڑکیوں کی زندگی برباد کرچکا ہے اسی لیے اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی اس لیے تم ڈاکٹر سہراب سے دور ہی رہو بلکہ کسی اور جگہ نوکری ڈھونڈ لو۔ بیٹی! تم اس کے جال میں پھنستی جارہی ہو، اب بھی وقت ہے، ڈاکٹر سے نجات حاصل کرلو اپنی زندگی اور عزت برباد ہونے سے بچالو۔''

میں ڈاکٹر سہراب سے اس قدر متاثر تھی کہ میں اس کے خلاف کوئی بھی بات برداشت نہ کرسکتی تھی۔ میں نے ڈسپنسر سے کہا کہ ''ڈاکٹر ایسا آدمی نہیں ہے اور......!''

اس نے مجھے یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ تم بچی ہو، میں اس دنیا میں تم سے پچاس سال پہلے کا آیا ہوا ہوں پھر اس نے ڈاکٹر کا لکھا ہوا ایک نسخہ میرے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ ''اسے پڑھو! یہ کھانسی کے ایک پرانے مریض کی دوائی ہے جو ایک سال ڈاکٹر کے زیر علاج ہے، اس کی بیماری پہلے طرح اس کے پھیپھڑوں میں موجود ہے لیکن وہ پورے اطمینان سے دوائی پیتا چلا جارہا ہے۔ پڑھ کر بتاؤ کہ اس میں کھانسی کی دوائی کون کون سی باقی جو کچھ لکھا ہے، وہ کیا ہے؟''

میں نے نسخہ پڑھا، نسخے میں صرف دو کھانسی کے تھے، باقی چار اجزا مختلف قسم کی نشہ خواب آور دوائیں تھیں حالانکہ میں یہ نسخے ہاتھوں سے تیار کرکے مریضوں کو دیا کرتی تھی کبھی غور نہیں کیا تھا کہ اصل مرض کی دوا کتنی مقدار میں اور دیگر اجزا کتنے دیئے جارہے ہیں؟

ڈسپینسر نے کہا۔ ''یہ مریض ان نشہ آور دواؤں کا عادی ہوگیا ہے۔ اسے رات کو کھانسی سونے دیتی تھی لیکن اب یہ دوائیں اسے مدہوش کرکے نیند سلائے رکھتی ہیں، وہ ہر روز پانچ روپے ڈاکٹر کے حوالے کرجاتا ہے اور بدمست رہتا ہے، صرف ایک مریض نہیں، ڈاکٹر کا ہر مریض ان دواؤں کا عادی ہوچکا ہے اسی وجہ سے یہاں مریضوں کا رش رہتا ہے کہ یہاں سے ہر ایک کو سکون ملتا ہے۔ میں صرف عورتوں کے نسخے تیار کیا کرتی ڈسپنسر کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ عورتوں کے نسخوں میں بھی نشہ آور دوائیں خاصی مقدار میں جاتی تھیں۔ ڈسپنسر نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر تقریباً ہر مریض کو ٹیکہ ضرور لگاتا ہے جس میں کارٹی سون (Cartisone) ہوتا ہے۔ یہ ٹیکہ ہر مریض کے لیے ضروری نہیں ہوتا بلکہ یہ تو مریضوں کے لیے مضر وہ ہوتا ہے۔ یہ ٹیکہ وقتی طور پر اتنا فائدہ دیتا ہے کہ مریض کی تکلیف لمحوں میں دور ہوجاتی ہے۔ یہ ٹیکہ بیماری کو ختم نہیں کرتا بلکہ بیماری کو دبا دیتا ہے، بیماری کو سلا دیتا ہے، بخار اور درد خواہ کتنا ہی تیز ہو، یہ ٹیکہ فوری اثر کرتا ہے۔ درد کو ختم کرتا ہے اور درجہ حرارت نارمل ہوجاتا ہے۔ یہ ان جراثیموں کو یا تو مار دیتا ہے یا کمزور کردیتا ہے جو صحت اور تندرستی کے لیے ضروری ہوتے ہیں پھر اس ٹیکہ کے مضر اثرات (side effects) ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں جو کسی نئی بیماری کی صورت میں ہوتے ہیں۔ مریض ان باتوں سے بے خبر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مریض ڈاکٹر کا مرید بن جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کے سامنے ڈاکٹر کی قابلیت کے قصیدے کہتا ہے اور یوں مریضوں کا رش بڑھتا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کے ساتھ میری بے تکلفی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ میں اخلاق اور احترام کے دائرے میں رہ کر اس سے ہر طرح کی بات پوچھ سکتی تھی، میں اسی رات اس کے گھر گئی اور کھانا وہاں ہی کھایا اور پھر باتوں کے درمیان صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ''آپ مریضوں کو نشہ پلا پلا کر ان سے پیسے بٹور رہے ہیں۔''

ڈاکٹر نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا کہ مجھے یہ بات کس نے بتائی ہے؟ میں بوڑھے ڈسپنسر کا نام نہیں لینا چاہتی تھی، میں نے کہا کہ میں دوائیوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے توقع تھی کہ ڈاکٹر مجھے لیکچر دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے درست ہے لیکن وہ تو کچھ اور ہی بولا تھا۔

''میں نے تمہیں کبھی کہا ہے کہ تم مسلمان لڑکی ہوتے ہوئے برقع لیے بغیر باہر گھومتی پھرتی ہو اور مجھ جیسے غیر مرد کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے رہتی، باتیں کرتی اور ہنستی کھیلتی ہو؟''

''میری تو ضرورت ہی ایسی ہے۔'' میں نے کہا ''کچھ ایسی ہی ضرورت میری بھی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ تمہیں بیٹھے بیٹھے ایسا خیال کیوں آ گیا ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''یہ بددیانتی ہے، یہ گناہ ہے۔''

وہ سنجیدہ ہوگیا اور خاصی دیر چپ رہ کر اس نے اپنی صفائی میں جو بیان دیا، وہ قطعی قابل قبول نہیں تھا اس لیے میں ان باتوں کا ذکر نہیں کروں گی مگر ساتھ ہی اس نے یہ انکشاف بھی کردیا کہ آج کل شاید ہی کوئی ڈاکٹر ایسا ہوگا جو مریض کا مکمل معائنہ کرکے اس کے مرض کی جڑ تک پہنچے۔ پیٹنٹ دوائیوں کی ایسی بھرمار ہوگئی ہے کہ ڈاکٹر نسخے میں ایسی ایک دو دوائیوں کو ضرور شامل کرتا ہے، اس کا باقی کام کارٹی سون اور نشہ آور دوائیوں نے سہل کردیا ہے۔ ڈاکٹروں نے مریضوں کو ''فوری افاقے'' کا عادی بنا دیا ہے۔ ڈاکٹری نظریئے کے مطابق بخار کو آہستہ آہستہ نارمل پر لانا چاہیے لیکن اب ٹیکہ لگانے سے درجہ حرارت فوراً ٹھکانے پر آجاتا ہے۔ مریض خوش ہوجاتا ہے لیکن اسے بتانے والا کوئی نہیں ہوتا کہ اس دوائی اور اس کے عمل نے اس کی جسمانی مشینری میں ایسی خرابی پیدا کردی ہے جو اسے آئے دن کسی نہ کسی مرض میں مبتلا رکھے گی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جو بھی ڈاکٹر ان دوائیوں کو نقصان دہ سمجھ کر مریض کا صحیح علاج اپنے لکچروں سے کرتے ہیں، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے فاقے کررہے ہیں۔''

یہ ایک طویل اور تکلیف دہ بحث تھی، مجھے ڈاکٹر کی کوئی بھی دلیل اچھی نہ لگی مگر میرے لیے ایک بہت مشکل لیکن نہایت سچی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر مجھے اچھا لگتا تھا۔

............*......*

چار سال اسی طرح ڈاکٹر کے پاس کام کرتے، اس سے ملتے اور ہنسی مذاق کرتے گزر گئے۔ ڈاکٹر مریضوں کو کارٹی سون اور نشہ آور دوائیاں دیتا رہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوڑھا ڈسپنسر مجھے کہتا رہا کہ میں ڈاکٹر سے دور رہوں لیکن میں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس دوران ڈاکٹر نے میری تنخواہ ساڑھے تین سو روپے ماہوار کردی۔ امی سلائی مشین سے روزمرہ کی دال روٹی نکالنے میں مصروف رہیں اور بھائی اطمینان سے تعلیم حاصل کرتے رہے اور میں ڈاکٹر کے ساتھ مزید بے تکلف ہوگئی۔ تنہائی میں وہ میری انگلیوں اور بالوں میں اپنی انگلیاں ہر دَم الجھائے رکھتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ اس کے کسی لطیفے یا بات پر میں اس قدر ہنستی کہ سر اس کی گود میں جا پڑتا۔ کسی انسان کے کردار کو پرکھنے کے لیے چار پانچ سال کا عرصہ تھوڑا تو نہیں ہوتا ناں!

•......•......•......•

ڈاکٹر کے کلینک پر ایک خوبصورت، جواں سال عورت اکثر آیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر اسے مفت دوائی دیا کرتا تھا اور اسے ڈاکٹر نے کبھی کوئی نشہ آور دوائی نہیں دی تھی اور نہ ہی کبھی اس کو اسٹرائیڈ کا ٹیکہ لگایا تھا۔ اگر ڈاکٹر نے کبھی اسے انجکشن دیا بھی تو وہ طاقت کا ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ سی عورت تھی، اس کے ساتھ ایک کم عمر کا بچہ بھی ہوتا تھا۔ ایک روز میں نے اس عورت کو دوائی دی تھی تو اس نے تھوڑا آگے جھک کر کہا تھا۔

''میں تم سے علیحدگی میں ملنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کلینک بند ہونے کے بعد مل سکوں گی۔''

شام کو چھٹی ہونے کے بعد میں گھر روانہ ہوئی تو وہ عورت راستے میں کھڑی تھی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی، اس نے کسی لمبی چوڑی تمہید کے بغیر اداس اداس لہجے میں کہا تھا۔ ''بہن......! ڈاکٹر سہراب نے میرے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا لیکن تم درمیان میں آ گئی ہو۔''

یہ بات سن کر مجھے حیرت کا ایک نہایت شدید جھٹکا لگا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس بخت عورت کو کیا کہوں! اچھا ہوا کہ وہ بولتی چلی گئی تھی اور اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا تھا۔

''اس میں نہ تمہارا قصور ہے اور نہ ڈاکٹر کا کیونکہ تم مجھ سے زیادہ خوبصورت اور نوجوان ہو۔ میں بچوں کی ماں ہوں، وہ مجھ سے شادی بھلا کیوں کرے گا؟''

میں یکایک پھٹ پڑی اور اسے کہا۔ ''بدزبان عورت......! بات کرنے سے پہلے سوچ تو لیا ہوتا کہ تم کیا بکنے لگی ہو؟ میں تو ڈاکٹر کو اپنا باپ جیسا سمجھتی ہوں۔''

''میں بھی اسے باپ ہی سمجھتی تھی۔'' اس نے اداس سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''پہلے میری بات سن لو پھر جو جی میں آئے، کہنا۔ میرا خاوند بیمار ہوگیا تھا تو میں اس ڈاکٹر کو بلا لائی تھی۔ اُس وقت میری گود میں ایک ہی بچہ تھا، ڈاکٹر نے دوائی دی اور پھر میں اس سے دوائی لاتی رہی۔ وہ کبھی کبھار گھر آ کر میرے خاوند کو دیکھ جاتا تھا۔ میں اُسے اپنا محسن سمجھ کر اس کے گھر بھی چلی جایا کرتی تھی۔ وہ میرے ساتھ بے تکلف ہوگیا تھا۔ اکثر میرے بالوں اور میری انگلیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور پھر یہ بے تکلفی اتنی بڑھی کہ...... حد سے بڑھ گئی۔ میرا خاوند ڈیڑھ سال بیمار رہ کر مر گیا، اس کے مرنے کے چھ ماہ بعد میرے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ اس حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں کہ میرے اس بچے کا باپ میرا خاوند نہیں بلکہ یہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گا لیکن اس نے اچانک میرے ساتھ تعلق توڑ لیا۔ میں حیران تھی کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ اور پھر ایک رات جب میں اس کے گھر کے دروازے تک پہنچی تو

اندر سے تم نکل رہی تھیں بات فوراً ہی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ تم نے ڈاکٹر کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ ڈاکٹر کی ملازمہ کو میرے اور ڈاکٹر کے تعلقات کا اچھی طرح علم تھا۔ ایک روز میں نے اس سے بات کی تو اس نے بھی یہی کہا کہ اب تم ڈاکٹر کو نہ پاسکو گی۔ اسے ایک نئی اور جوان دوست مل گئی ہے۔

اس روز میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں ایک نہایت نادان اور بے وقوف لڑکی ہوں اور مجھے دنیا والوں کے ہتھکنڈوں کی ذرا بھر بھی خبر نہیں۔ میری زبان گنگ ہوگئی اور میں کچھ کہے بغیر اس عورت کے گھر سے نکل آئی اور سیدھی گھر پہنچ گئی مگر چین نہ آیا۔ بھوک تک غائب ہوگئی۔ میں نے امی سے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈاکٹر کے ساتھ ایک کیس دیکھنے جانا ہے۔ امی کے سامنے میں نے ڈاکٹر کی ایسی اچھی تصویر پیش کر رکھی تھی کہ اب انہیں میرے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ میں ڈاکٹر کے گھر جا پہنچی، اس نے مجھے دیکھتے ہی روزمرہ کی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا لیکن میری نظروں میں اب اس کی شکل و صورت بدل چکی تھی۔ میں نے اس عورت کا قصہ شروع کیا اور جو جی میں آیا، کہتی چلی گئی۔ میں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ بھی وہی کھیل کھیل رہے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو اس عورت کی طرح تباہ نہیں ہونے دوں گی۔

ڈاکٹر نے اپنی صفائی میں یہ نہیں کہا کہ وہ عورت جھوٹ بولتی ہے نہ اس نے یہ کہا کہ میں اس پر جھوٹا الزام عائد کر رہی ہوں۔ میں اس سے دور بیٹھی واہی تباہی بک رہی تھی، اس نے سر جھکا لیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کہہ دے کہ وہ عورت جھوٹ بکتی ہے۔ وہ ایسا کہتا تو میں فوراً مان جاتی کہ میں تو اسے اپنا باپ سمجھتی تھی۔ کوئی بیٹی اپنے باپ کے خلاف ایسا غلیظ الزام برداشت نہیں کر سکتی لیکن ڈاکٹر نے اس الزام کی تردید نہ کی۔ میں نے آخر اکتا کر کہا۔ ''آپ کہتے کیوں نہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے؟''

اس نے سر اٹھایا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس محبوب چہرے پر میں نے پہلی بار آنسو بہتے دیکھے تو جی میں آئی کہ اس کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھ دوں مگر وہ مجرم تھا، ایک عورت کو برباد کرنے کا مجرم۔ میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا پھر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''نہیں، یہ سب سچ ہے۔''

میرے دل میں تیر سا لگا اور میں وہاں سے اٹھ کر بھاگی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے میرا نام لے کر پکارا تھا لیکن میں سنی اَن سنی کر کے وہاں سے نکل آئی تھی۔ میں اگلی صبح کلینک نہ گئی، اب وہاں کی ملازمت سے میرا جی بھر گیا تھا۔ جسے میں باپ سمجھتی تھی، وہ پاپی نکلا، مریضوں کو نشے والی دوائیوں کے جادو میں پھنسائے رکھنے والا پاپی...... میں نے سوچا، وہ ایک عورت سے نہیں، کئی عورتوں سے کھیل چکا ہے۔ میں نے امی کو تو کچھ بھی نہ بتایا لیکن اس نرس کے ہاں چلی گئی جس نے مجھے یہاں رکھوایا تھا۔

وہ نرس جب کبھی مجھے ملا کرتی تھی تو میں اسے بتایا کرتی تھی کہ ڈاکٹر کتنا اچھا آدمی ہے مگر اس روز میں نے رو رو کر اسے ساری بات کہہ سنائی۔

نرس نے بتایا کہ وہ اس سارے ڈرامے سے واقف ہے اسی لیے اس نے مجھے ڈاکٹر سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ خدا اسے اس نیکی کا اجر دے۔ اس نے اسی روز مجھے ایک اور اسپتال میں نوکری دلوا دی تھی مگر کیونکہ میرے پاس سرٹیفکیٹ نہیں تھا اس لیے تنخواہ کم دی گئی۔ اس نیک سیرت نرس نے میرے لیے ایک دو اور پرائیویٹ کام نکال لیے تھے جن سے میری ماہوار آمدنی میں کوئی فرق نہ آیا۔

•......•......•......•

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی ایک سال گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر سہراب کی ملازمہ مجھے اسپتال میں ملنے آئی۔ اس نے خاصی مشکل سے مجھے ڈھونڈا تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر اتنا بیمار ہے کہ شاید زندہ نہ رہ سکے۔ اس نے التجا کی تھی کہ میں اسے ایک بار دیکھ آؤں۔ میں جانے پر آمادہ نہیں تھی لیکن ملازمہ نے ایسی باتیں بتائیں کہ میں جانے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر سہراب رات کو شراب پینے کا عادی تھا لیکن اس کی اس عادت کا کسی کو علم نہ تھا۔ (مجھے بھی پہلی بار پتا چلا تھا کہ وہ شرابی ہے۔) مگر بیٹی......! جس رات تم اسے لعنت ملامت کرکے آئی تھیں، اس نے اسی رات شراب چھوڑ دی تھی۔ وہ سینے میں ایک ایسا دکھ اٹھائے پھرتا ہے جسے وہ شراب میں یا ہنسی مذاق میں ڈبو دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ تم ناراض ہو کر چلی گئیں تو اس نے شراب چھوڑ دی اور اس کا مزاج اس قدر چڑچڑا ہوگیا کہ اس نے مریضوں کے ساتھ بھی بدکلامی شروع کردی۔ چند ماہ پہلے اسے سینے میں درد شروع ہوگیا۔ پہلے وہ خود علاج کرتا رہا لیکن درد بڑھتا ہی گیا۔ آخر ایکس رے کے ساتھ دوسرے ڈاکٹروں سے معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کا سرطان ہوگیا ہے، یہ شراب نوشی کا نتیجہ تھا۔ وہ اسپتال میں داخل ہوگیا مگر ڈاکٹروں نے تھک ہار کر اسے گھر بھیج دیا ہے۔ اب وہ آخری دنوں پر ہے۔ تمہیں ہر وقت یاد کرتا ہے، کہتا ہے کہ اسے ایک بار میرے پاس لے آؤ تاکہ میں خدا کو منہ دکھانے کے قابل ہو جاؤں۔"

میں اسی روز ڈاکٹر کے گھر چلی گئی۔ ایک نہایت خوش طبع اور خوبرو انسان میرے سامنے لاش کی شکل میں پڑا تھا، چہرے پر درد کے آثار نمایاں تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ مجھے یاد آگیا کہ جب میں روتی تھی تو وہ بہلا لیا کرتا تھا۔ آج وہ رو رہا تھا۔ میں اس کے بیٹھ گئی تو اس نے پرانی عادت کے مطابق میرا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری انگلیوں میں الجھانے لگا مگر اب اس کے ہاتھ سرد اور بے ہوچکے تھے۔ اس نے بے ساختگی سے میرے ہونٹوں سے لگا لیا اور بچوں کی طرح بلک بلک رونے لگا۔ میرے بھی آنسو نکل آئے۔ اسے اس بے بسی میں دیکھ کر میرے دل سے تمام گلے شکوے نکل گئے۔

"آپ نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گناہ گاروں کا یہی حال ہوتا ہے....." اس نے نحیف آواز میں کہا اور آہ بھر کر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ "زندگی کی آخری خواہش یہی تھی کہ ایک بار آجاؤ، آج آگئی ہو تو میری باتیں سن لو مرنے تک میری صورت نہ دیکھنا۔ میں گناہ گار ہوں۔ تم نے مجھ پر جو الزامات لگائے تھے وہ ہیں۔ میں نے مریضوں کو نشہ آور دواؤں سے اپنے جال میں پھنسائے رکھا۔ میں نے ایک عورت کو دھوکہ دیا لیکن میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ میرے متعلق مشہور ہوگیا تھا کہ میں نے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے بھی یہی کہنا شروع کردیا۔ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے تمہیں بھی یہی بتایا تھا لیکن آج میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں کہ وہ میری بیوی نہیں تھی اور وہ بچی بھی میری نہیں تھی، وہ تو میرے پاس ایک امانت تھی۔"

اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے تو اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی دینا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ میں نے اسے چمچ سے پانی پلایا۔ وہ پھر بولا۔ "یہ تو شاید تم کو

بھی معلوم نہیں کہ میں ریاست الور کا مہاجر ہوں۔ وہ عورت جسے لوگ میری بیوی سمجھتے رہے، مجھے پاکستان کی طرف آتے ہوئے راستے میں ملی تھی۔ ابھی اس کی بچی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی اذیت میں تھی۔ اس کا خاوند، بھائی، باپ اور گھر کے سارے ہی افراد شہید ہوگئے تھے۔ وہ مجھے پاگل پن کی حالت میں ملی تھی۔ میں اسے اپنی پناہ میں لے کر یہاں آگیا۔ یہ کلینک ایک ہندو ڈاکٹر کا تھا جو ہندوستان جا چکا تھا۔ میں نے اس کلینک پر قبضہ کرلیا اور میرا کام چل نکلا۔ تین ماہ بعد اس عورت نے ایک بچی کو جنم دیا۔ اس نے مجھ سے کئی بار یہ کہا کہ میں اس سے شادی کرلوں لیکن میں اسے امانت کے طور پر لایا تھا۔ میں نے ایک دو بار سوچا کہ اس سے شادی کر لوں لیکن مجھے یوں لگتا کہ جیسے میں اس سے نیکی کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہوں۔ آخر میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ تم میری بہن اور بیٹی ہو۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں کسی سے بیاہ دوں گا اور باپ بن کر تمہیں رخصت کروں گا اور میں ایسا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک رات جب میں کلینک بند کرکے آیا تو میری میز پر ایک رقعہ پڑا تھا۔ یہ اس کا میرے نام آخری پیغام تھا۔ اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ میں آپ کی نیکیوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے بخش دینا۔ میں نے اپنی منزل تلاش کرلی ہے۔ بچی کے مستقبل کی خاطر مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔" اور وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی مگر مجھے اس کے اس طرح سے جانے کا بہت ہی دکھ ہوا تھا۔

"آپ اس کے ساتھ شادی کرلیتے۔" میں نے کہا۔ "آپ کا فیصلہ مجھے پسند نہیں آیا۔"

"میں تو پہلے ہی شادی کرچکا تھا۔" اس نے کہا۔ "میری دو بچیاں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ بہن اور ماں بھی تھیں۔ وہ..... وہ....."

ڈاکٹر کو ایک ہچکی سی آئی اور وہ پھر کتنی ہی دیر سسکیاں لے لے کر روتا رہا۔ میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے اس کے آنسو پونچھے تھے اور اس کے منہ میں چمچ سے پانی ڈالنے لگی تھی۔ جب اسے کچھ سکون ہوا تو اس نے بات پوری کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ جل کر راکھ ہوگئی تھیں، بلوائیوں کے حملے کے بعد میں جب گھر آیا تھا تو میرے محلے کے کئی مکانوں سے شعلے نکل رہے تھے اور مسلمانوں کے بچے جل رہے تھے اور......!"

میں نے اسے پوری بات سنانے سے روک دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کیفیت میں اس قدر بھیانک اور تلخ یاد کو ذہن میں تازہ کرے۔ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے میری یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"میں نے اس عورت اور اس کی بچی کو پناہ میں لیا تو میرے زخم مندمل ہونے لگے تھے مگر وہ میرے زخموں پر نمک چھڑک کر چلی گئی تھی۔ میں انسان ہوں، پتھر تو نہیں ہوں، میں نے اپنے آپ کو دھوکے دینے شروع کردیئے تھے۔ مجھے اپنی بیوی، دو معصوم بچیاں، بہن اور ماں یاد آتی تھیں تو کسی کو معلوم نہیں کہ میں اپنے آپ کو کس طرح سنبھالتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مارفیا کے انجکشن لگانے شروع کردیئے تھے پھر میں نے مریضوں کے ساتھ ہنسی مذاق شروع کردیا۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملنے لگا پھر میں نے مارفیا چھوڑ کر شراب پینی شروع کردی اور نجانے کب نیکی اور بدی کے درمیان بھٹک گیا۔ میں نے گناہ بھی کیے اور ڈھیروں نیکیاں بھی کیں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں نے مجھے بدنام کر رکھا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بہت کھل

WWW.PAKSOCIETY.COM

مل جایا کرتا تھا۔'' اس نے ایک آہ بھری اور اکھڑی ہوئی سانسوں کو سنبھال کر بولا۔ ''میں گناہ گار ہوں' میں نے اس عورت کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا جس کا خاوند میرے زیرِ علاج تھا۔ مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ میں نے اس کے خاوند کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ عورت نہیں چاہتی تھی کہ اس کا خاوند بچ جائے۔ میں نے اس کے خاوند سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بیوی اسے باقاعدگی سے دوا نہیں پلا رہی۔ میں نے اسے انجکشن دینے شروع کر دیئے۔ میرے ڈسپنسر سے پوچھ لینا کہ وہ ہر روز اس کے گھر جا کر اسے انجکشن لگاتا تھا مگر وہ عورت میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے خاوند کے مرنے کے بعد میں اس سے شادی کرلوں گا۔ میں نے پوری کوشش کرڈالی کہ اس کا خاوند صحت یاب ہو جائے مگر وہ زندہ نہ رہا اور مر گیا...... میں بھی بے گناہ نہیں' میری شخصی کمزوریوں نے مجھے اندھا کر دیا اور میں اس عورت کو سیدھی راہ پر لاتے لاتے خود بھٹک گیا۔''

وہ یہاں تک بات کر پایا تھا کہ اس کا ایک دوست ڈاکٹر آ گیا تھا۔ وہ ہی اس کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سہراب کا معائنہ کیا تھا اور تسلی آمیز جملے کہہ کر چل پڑا تھا۔ چلتے چلتے اس نے مجھے اشارہ کیا تھا تو میں اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی تھی۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے اسے تفصیل سے بتا دیا تو اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میرا دوست زیادہ سے زیادہ آج رات یا کل کسی وقت ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گا۔ تم اس کے ساتھ ہی رہو۔ اسے اچانک ہی اس قدر درد اٹھے گا کہ یہ بے ہوش ہو جائے گا' اس وقت اس کی نجات کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ تم وضو کر کے اس کے سرہانے بیٹھ کر قرآن پاک پڑھنا۔ یہ جلدی جان دے دے گا۔''

میں ڈاکٹر کو اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ ''اچھا میں ... ہی کروں گی۔'' غم کی شدت سے حلق میں ... اٹک گئی تھی۔ ڈاکٹر چلا گیا تو میں اپنے ڈاکٹر کے سرہانے جا بیٹھی۔

ڈاکٹر سہراب نے پوچھا کہ ''ڈاکٹر کیا ... ہے؟''

میں نے کہا کہ ''وہ تسلی دے گیا ہے۔''

وہ بولا۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں' میں بھی ... والوں کو جھوٹی تسلیاں دیا کرتا تھا' مجھے اب کسی ... بھی مر جانا ہے...... اس لیے میں نے تمہیں ... کہ میری آخری باتیں سن لو۔'' پھر اس نے ایک ... بھری۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دانت ... اس کا درد بڑھ رہا تھا' اس کے چہرے پر پسینے ... قطرے پھوٹ آئے۔ میں نے دوپٹے سے ... پسینہ پونچھ ڈالا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ ... لے لیا اور بولا۔

''جب تم پہلے روز میرے کلینک میں آئی تھیں تو میں نے تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں ... سکون محسوس کیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ تم صرف ہنسنا ... تھیں مگر میں تمہیں رلانا چاہتا تھا۔ یہ میری ... کاری تھی۔ میری نیت بری نہیں تھی پھر بھی ... اسے فریب کاری ہی کہوں گا۔ میں نے تمہارے دل میں غموں کو ہوا دی اور جب تم بچوں ... رونے لگیں تو میں نے تمہیں بہلانا شروع کر ... میرا طریقہ کامیاب رہا اور میں نے تمہیں ... لیا مگر اس عورت نے تمہیں میرے گناہوں ... واردات سنا کر تمہیں مجھ سے چھین لیا' تم نے ... گناہ گار کہا تو میں نے گناہوں سے توبہ کر لی ... چوری چھپے شراب پیا کرتا تھا' یہ بھی ایک فریب ... میں اپنے آپ سے کرتا تھا۔ میرا بہت سا وقت مریضوں کے ساتھ گزر جاتا تھا' کچھ وقت تمہارے ساتھ ہنسنے کھیلنے گزرتا تھا اور رات کو جب میں تنہا ہوتا تھا تو میری دو بچیاں' بیوی' ماں اور بہن میرے کمرے میں آ جاتی تھیں۔ میں انہیں دیکھتا تھا مگر انہیں چھو نہیں سکتا تھا اور رونے لگ جاتا تھا۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں شراب میں ڈوبنے لگا۔ اس کا نتیجہ آج سامنے ہے کہ مجھے پھیپھڑوں کا سرطان ہو گیا ہے' جس روز سرطان ظاہر ہوا' اس سے ایک ہی روز پہلے میں نے شراب پینے سے توبہ کر لی تھی۔ اس توبہ کا باعث تم ہی ہو۔''

''مجھے تو علم تھا۔'' اس نے ہچکی لے کر کہا۔ ''تمہارے روپ میں مجھے اپنی دو بچیاں مل گئی تھیں۔ میں نے تمہارے پیار میں ماں اور بہن کے پیار کی لذت بھی محسوس کی اور...... اور میں اس گناہ کا بھی اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں اپنی دوست اور محبوبہ بھی سمجھتا رہا' تم شاید نہ سمجھ سکو' یہ ایک ذہنی کیفیت ہوتی ہے جسے نفسیات کے ڈاکٹر ہی سمجھ سکتے ہیں۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کے روپ میں اپنے مرحوم باپ اور دو شہید بھائیوں کو پا لیا تھا اور میں آپ کو اپنا دوست بھی سمجھتی رہی۔ آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔''

''نہیں...... نہیں......'' اس نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نے گناہ کیا تھا' میں نے کئی بار سوچا کہ تمہیں کہوں کہ میرے ساتھ شادی کر لو لیکن جب بھی میرے دل میں یہ خیال آیا' تمہاری شکل و صورت بدل گئی' تمہاری صورت میں مجھے اپنی جلی ہوئی بچیاں' ماں' بہن اور بیوی نظر آنے لگیں۔ میری یہ سوچ میرا گناہ تھا۔''

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اچانک اس نے میرے ہاتھ کو اس قدر مضبوطی سے پکڑ لیا کہ میری انگلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اس کے دانت پسنے لگے اور اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ اس کے منہ سے کرب زدہ چیخ نکلی' درد کی بے رحم شدت نے اسے تڑپا دیا پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر بھاگی اور ملازمہ سے کہا کہ مجھے قرآنِ پاک دو۔ وہ قرآن مجید اٹھا لائی۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں ایک کاغذ رکھا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی نیکیوں کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گی' اپنی بچی کے مستقبل کے لیے میں نے اپنی راہ تلاش کر لی ہے' آپ نے میری بات نہ مانی' آپ کی مرضی' اگر میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں جا رہی ہوں۔''

آپ کی عارفہ!''

اُس کے نیچے ڈاکٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا فقرہ تھا۔ ''تمہیں میں اس مقدس کتاب کی طرح پاک سمجھتا تھا۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ (آمین!)

ڈاکٹر سہراب!''

میں قرآن کھول کے ڈاکٹر کے سرہانے بیٹھ گئی اور سورۃ یٰسین پڑھنے لگی۔ ڈاکٹر درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ میں تلاوت بلند آواز سے کر رہی تھی لیکن میری آواز بار بار رِقت میں دب جاتی تھی اور میرے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر اور بلند آواز سے تلاوت شروع کر دی۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے چہرے پر سکون سا آ رہا تھا لیکن اب وہ آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا۔ جب میں آخری آیت پر پہنچی تو ڈاکٹر تڑپ اٹھا اور چلا کر بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں......خدا مجھے معاف نہیں کرے گا۔نہیں...... نہیں......کبھی نہیں......"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔"آپ اطمینان سے سنتے جایئے۔ یہ پروردگار کا وعدہ ہے کہ وہ گناہ بخش بھی دیتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے' مہربان ہے' رحیم ہے۔" میں نے پھر سے سورۃ یٰسین پڑھنی شروع کردی۔

"نہیں......نہیں......" وہ رورو کر کہنے لگا۔"خدا میرے گناہ نہیں بخشے گا۔ میرے گناہ تھوڑے نہیں' میرا ضمیر اس بوجھ کو اٹھا نہیں سکتا۔ میری بچیاں خدا کے نام پر قربان ہوگئیں مگر میں روتا رہا۔ یہ بھی گناہ تھا۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی گناہ تھا۔"

میں نے آواز اور بلند کردی۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی نحیف آواز میری آواز میں دب جائے اور میں اس کا ایک لفظ بھی نہ سن سکوں۔ میں خدا کا کلام اس کی روح تک اتارنے کی کوشش کررہی تھی۔ میرا ایک ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کو اٹھا کر منہ کی طرف لے جانے کی کوشش کی' یہ اس کی زندگی کی آخری کوشش تھی جو کامیاب نہ ہوسکی اور میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے وہیں سے ہاتھ سرکا کر اس کے دل پر رکھا' اس کی دھڑکن رک چکی تھی۔ ڈاکٹر اپنی بچیوں' بیوی' ماں اور بہن کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا' اُس کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔ درد کا تاثر ڈھل گیا تھا' شاید خدا نے اسے بخش دیا تھا۔

............*......*

میری زندگی کا ایک باب ختم ہوگیا۔ امی نے بہت کوشش کی کہ وہ میری کہیں شادی کردیں مگر میں نے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ امی یہی حسرت لیے دنیا سے چلی گئیں۔ میں نے پھر بھائیوں کی شادیاں کردیں۔ بھابیاں بہت اچھی تھیں۔ وہ بھی کہتی تھیں۔"آپ بوڑھی نہیں ہوئیں۔ اب بھی وقت ہے' شادی کرلیں۔" لیکن میں انہیں بتا نہیں سکتی تھی کہ ایک ایسا آدمی میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جس نے میرے روپ میں دو بچیوں' بیوی' ماں اور بہن کو پالیا تھا۔ میں اُسی کی ہوں' اُسی کی رہوں گی' اس کی بیٹی بن کر' بہن بن کر یا محبوبہ بن کر۔ بس پھر یوں ہی زندگی گزرنے لگی۔ میں نے اپنا آپ دوسروں کے لیے وقف کردیا اور اس مکان میں رہنے لگی۔ یہ وہی گھر ہے یعنی ڈاکٹر سہراب والا گھر۔ اس کا کلینک "بنی" کے علاقہ میں تھا۔ وہاں بعد میں نرسنگ ہوم بن گیا تھا مگر اب کسی جگہ کام کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ دونوں بھائی ملازمت کے سلسلے میں بیویوں کو ساتھ لے کر کراچی گئے تھے۔ کچھ عرصہ تو اُن سے رابطہ رہا اور پھر ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم ہوگیا۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ کراچی میں جب حالات زیادہ خراب ہوئے تھے تو وہ ان فسادات کی زد میں آگئے تھے۔ پاکستان نے میرے خاندان سے ایک بار پھر قربانی لی تھی۔"

............*......*

ماسی فضلاں نے اپنی کہانی ختم کی تو میں دکھی دکھی سا گھر لوٹ آیا۔ تمام رات نیند نہ آئی اور ماسی فضلاں کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اگلی صبح ماسی فضلاں کی زندگی کا اختتام ہوگیا۔ محلّہ کا ہر شخص اشک بار تھا' ہزاروں اشک بار آنکھوں کے ساتھ "شاہ دی ٹاہلیاں" والے قبرستان میں اُن کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ میں اب جب کبھی بھی اس قبرستان کے پاس سے گزرتا ہوں تو قبر پر جا کر فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں۔

......☆☆......

شہید کی کہانی | ہمارے وطن کا دفاع کرنے والے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوچ

منزہ سہام

شہید کی ڈائری

علامہ اقبال کی پرواز خیال
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت ، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ



WWW.PAKSOCIETY.COM

عزیز ہم وطنو......!

اللہ کرے آپ لوگ ہمیشہ اچھے رہیں۔ اللہ کرے پاکستان تا قیامت سلامت رہے۔ میں نے اور مجھ جیسے بے شمار لوگوں نے پاک سرزمین کے لیے خون دیا اس کی سلامتی کے لیے جان قربان کی۔ آج دل بہت مطمئن ہے کہ زندگی ضائع نہیں ہوئی وطن کے کام آ گئی اور اس سے بڑا کام تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔ وہ لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں جن سے وطن کچھ چاہتا ہے اور وہ اُس امتحان میں پورے بھی اترتے ہیں۔

سردیوں کی شاموں میں جب ماں جی مجھے باجرے کی گرم گرم روٹی پر سرسوں کا ساگ اور مکھن کا پیڑا رکھ کر دیتی تھیں تب میں اُن سے کوئی کہانی سنانے کو ضرور کہتا اور وہ بھی جانتی تھیں کہ جب تک کہانی جاری رہے گی منہ بھی چلتا رہے گا۔ کھانا کھلانے کا اچھا بہانہ تھا یاں جی ایسا سمجھتی تھیں اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ یہی سمجھتی رہیں تب وہ مجھے بے شمار بار کا سنایا ہوا قصہ سناتی تھیں کہ اُس وقت کیا جذبات تھے جب پاکستان کا قیام عمل میں آ رہا تھا۔ سب لوگ افطار کے بعد ریڈیو کے اردگرد جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اُس وقت خبروں کی ترسیل کا ریڈیو ہی واحد عوامی ذریعہ تھا۔ ماں جی بتاتی تھیں کہ میرے نانا بڑے بیمار تھے بس اب تب والی صورت تھی۔ ان کو دیکھ کر پریشانی بھی ہوتی تھی اور دل میں یہ خوشی بھی تھی کہ جلد قائداعظم کی کوششیں رنگ لانے والی ہیں۔ غم اور خوشی کا امتزاج ویسے بھی بڑا حسین ہوتا ہے اسی غم کی بدولت ہی تو خوشی کی اہمیت ہے۔ جیسے موت کی وجہ سے زندگی انمول ہے۔ جیسے جنگ کی بدولت امن سرمایۂ حیات ہے۔

13 اگست کی رات 12 بجے ریڈیو سے ایک بہت شاندار آواز گونجی۔

”یہ ریڈیو پاکستان ہے۔“

یہ بتاتے بتاتے ماں جی کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا چہرہ گھٹنوں میں دے کر چمٹے سے چولہے کی راکھ کریدنے لگتیں۔ پھر سر اٹھا کر کہتیں۔

”اس اعلان کے بعد کانوں میں تیرے نانے کے کلمہ پڑھنے کی آواز آئی اور وہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ عجیب کیفیت تھی پاکستان بننے کی خوشی بڑی تھی یا اُن کے جانے کا غم ہم گھر والے کبھی سمجھ نہ پائے۔

پتر......! تُو تو پڑھا لکھا ہے ہم لوگ تو چٹے اَن پڑھ تھے جذبوں سے عاری تُو ہی بتا کہ خوشی بڑی تھی یا غم......“

میں جب تک زندہ رہا جتنی سردیاں ماں جی کے باورچی خانے کی پیڑھی پر سرسوں کا ساگ اور باجرے کی روٹی کھاتے گزری میں تو انہیں یہ بتا بھی نہ سکا کہ...... اُن کی آنکھوں سے آنسو یہ جملہ ”یہ ریڈیو پاکستان ہے۔“ کہتے ہوئے رواں ہوتے تھے اور وہ کچھ لمحے جو سر جھکا کر چولہے کی راکھ کریدتیں تب تک بہتے پھر سر اٹھا کر ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کر کے کہتیں۔

”اور پتر! پھر تیرے نانے کی کلمہ پڑھنے کی آواز کانوں میں پڑی۔“ لیکن میں یہ جانتا ہوں جب میرا لہو میرے پاک وطن کی مٹی میں جذب ہو رہا تھا تب میری زبان پر بھی کلمہ تھا اور بند ہوتی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا وہ ماں جی کا آنسوؤں سے تر چہرہ سردیوں کی شام سرسوں کا ساگ اور باجرے کی روٹی کھاتا چھوٹا سا لڑکا تب مجھے ماں جی کے سوال کا جواب مل گیا مگر میں انہیں بتا بھی نہ سکا مگر آپ لوگ اپنی ماں کو ضرور یہ بتا دیجیے گا کہ وطن کی سلامتی سے بڑی کوئی خوشی نہیں اور اس کے سامنے بڑے سے بڑا غم بھی ہیچ ہے...... اس سچائی کو ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ زندگی بہت دھوکے باز ہے کب ساتھ چھوڑ جائے کوئی نہیں جانتا اور بہت سارے سوال اَن سنے اور بہت سارے جواب اَن کہے رہ جاتے ہیں۔

شہید وطن

مینا تاج

ڈاک بابو

فنا کانپوری کا خیال

منزلیں دور تر ہو گئیں
فاصلے کم سے کم رہ گئے

سڑک کے اس کردار کی کہانی جو اب غیر اہم ہوتا جا رہا ہے



WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈاکیا یا ڈاک بابو کا سفر بہت پرانا ہے۔ زمانہ قدیم میں صاحبِ استطاعت لوگ اپنے پیغامات دوسرے شہروں یا علاقوں میں پہنچانے کے لیے تنخواہ دار قاصد رکھتے تھے جو اُن کے عزیزوں میں خوشی اور غمی کے پیغامات سے لے کر حال احوال دریافت کرنے پر مقرر ہوتے تھے جو کہ زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں ہوتا تھا۔

قاصد‘ ایلچی‘ پیغام رساں اور مختلف ناموں سے ہمکنار ہوتا یہ کردار موجودہ دور میں ڈاکیا یا پوسٹ مین کے نام کے ساتھ ہم تک پہنچا۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاک بابو خط پہنچانے کے ساتھ ناخواندہ گھرانوں میں خط پڑھ کر بھی سناتا تھا اور جواب بھی لکھتا تھا۔ اس کی حیثیت خاندان کے فرد جیسی سمجھی جاتی تھی۔

دور دیس بسنے والوں کا اپنے پیاروں سے خط کے ذریعے رابطہ آدھی ملاقات اپنے اندر بے پناہ خوشی و رومانس سموئے ہوتا ہے اور اسی رومانس میں ڈاکیا پل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بیرونِ ملک مقیم حضرات وطن واپسی پر جہاں اپنے عزیزوں کے لیے تحائف لاتے تھے‘ وہیں ڈاک بابو کا تحفہ بھی ان کے سنگ ہوتا۔

پھر زمانہ بدلا‘ رِیت بدلی‘ ٹیلی فون کی آمد کے ساتھ ہی خط و کتابت کے رابطے میں کمی واقع ہوئی۔ لوگ خطوط بھیجنے سے زیادہ ٹیلی فونک رابطوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جن گھرانوں میں یہ سہولت میسر نہیں ہوتی‘ وہ کسی پڑوسی کے گھر سے یہ فیض اٹھا لیا کرتے تھے‘ پر وہ طبقہ جو ٹیلی فون کی نعمت سے محروم تھا‘ وہ اب بھی خطوں پر ہی انحصار کرتا تھا۔ اُن کے گھرانے میں پوسٹ مین کی اہمیت بدستور قائم تھی۔ اس کی آمد پر گھر میں ہلچل مچ جاتی اور خط وصول کرتے وقت ڈاک بابو کا شکریہ ادا کیا جاتا اور چند لمحوں میں بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی اس کے آگے پر دھر دی جاتی۔ اس کا حال احوال دریافت کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا کیونکہ یہی وہ کردار تھا جو ان کے پیاروں کے پیغامات پہنچانے کا ذریعہ تھا پھر جب علاقے ٹاؤن و سڑک کے نام سے منسوب ہو کر ترقی کی طرف گامزن ہونے لگے‘ وہیں ڈاک بابو کی اہمیت بھی تنزلی کا شکار ہونے لگی۔ معاشرتی ترقی کی دوڑ میں ڈاک بابو بہت پیچھے رہ گیا۔ ماضی کے اس اہم کردار کو پسِ پشت ڈالنے میں سماج کا بڑا عمل دخل ہے لیکن یہ شکوہ بھی بے کار ہے‘ جس سماج نے اپنے بزرگوں کو ماضی کا کھنڈر سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو وہ بھلا ڈاک بابو کو کس کھاتے میں ڈالیں۔

اگر ہم ڈاک بابو سے گزشتہ دور کی بات کریں تو وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر محکمۂ ڈاک کی عظمتِ گزشتہ کے قصے دہراتے ہوئے اُس دور کو حسرت سے یاد کرتا ہے جب موسمیات کے علاوہ کونین کی فروخت اور محکمۂ تار و ٹیلی فون بھی انہی کے پاس ہوا کرتا تھا۔

”کیا بھلا دور تھا کہ ہر ایک تار پر جو دفتری اوقات کے بعد آیا کرتی‘ ایک روپیا لیٹ فیس ملا کرتی۔ تنخواہ سے زیادہ تو لیٹ فیس ہوا کرتی جس کے باعث پوسٹ ماسٹر دو تین شادیاں رچایا کرتے۔“ اس ریٹائرڈ ڈاک بابو نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ ”پوسٹ مینوں کی اکثریت اپنے بیٹوں کی پیکر‘ کینڈی ڈیٹ پورز اور پوسٹ مین لگوانے کے چکر میں ہوتی مگر فیکس مشین کی آمد اور ٹیلی فونک ذریعے نے اُن کے سنہری سپنوں پر اوس ڈال دی۔ دن بھر پوسٹ مین جھلسی ہوئی آگ اگلتی سڑکوں پر بائی سائیکل پر ڈاک تقسیم کرتے پھرتے‘ پر لوگوں کی طرف سے موصول ہوتی عزت ٹھنڈی پھوار کی طرح ان کی زندگیوں میں شامل تھی‘ پر مشینوں کے ساتھ رہ کر ہم بھی مشین بن چکے ہیں‘ ہمارے انسانی جذبات کب کے ختم ہو چکے ہیں۔“

آج خطوط لکھنے کی روایت ’عالمِ نزع‘ میں ہے۔ فیکس‘ ای میل اور شارٹ میسجنگ سروس نے قلم کاغذ کا رشتہ توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایسے میں ڈاک بابو کا کام نصف سے بھی کم ہو گیا ہے۔ حالات کی چکی میں پستے ڈاک بابو اپنی اور اہلِ خانہ کی بقا کے لیے تگ و دو میں لگے ہیں۔

اس سلگتی زندگی میں جلتے ہوئے ناموں میں سے ایک نام رشید الدین پوسٹ مین کا بھی ہے جو بلدیہ ٹاؤن کا رہائشی ہے اور نیپا چورنگی پر واقع ڈاک آفس میں حاضری لگانے اور آفس کا کام مکمل کرنے کے بعد ڈاک لے کر روانہ ہوتا ہے۔ بلدیہ سے نیپا چورنگی تک 18 کلو میٹر سفر طے کرنے کے لیے صبح سویرے گھر سے نکلتا ہے۔ 19 سالہ سروس کے عوض اس پر حکومت کی مہربانی کے دروازے بند ہیں۔

رشید الدین سے میری ملاقات ادارے سے موصول ہونے والے منی آرڈر کے توسط سے ہوئی۔ پرانے گھسے ہوئے لباس میں لپٹا رشید کا وجود‘ چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔ منی آرڈر دیتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے جیب میں لگے بال پین کو بڑھاتے ہوئے دستخط لیے واپسی کی راہ لیتے‘ پسینہ پونچھتے ہوئے ایک لمحے کو ٹھٹک گیا۔

”کیا پانی مل سکتا ہے؟ گرمی بہت زیادہ ہے۔ ابھی بہت دور ڈاک لے جانا ہے۔ ڈیوریٹ فنڈز جن بڑے صاحب کے نام آتا ہے‘ وہ خاصے خشک مزاج ہیں اس لیے ان سے پانی مانگنے کی ہمت نہیں پڑتی۔“

”آں...... ہاں؟ سوری‘ اخلاقی طور پر تو مجھے خود آپ سے پانی کا پوچھنا چاہیے تھا۔ ابھی لائی۔“

پانی کا گلاس اور بوتل اسے تھماتے ذہن میں ماضی قریب کا منظر گھوم گیا جب بیرونِ ملک مقیم والد صاحب کی ڈاک کے انتظار میں پوسٹ مین کی آمد کا شدت سے انتظار ہوتا۔ پوسٹ مین کی مخصوص آواز سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ بھائیوں اور میرے درمیان دروازہ کھولنے کے لیے ریس لگ جاتی اور جو کامیاب ہو جاتا‘ وہ ہاتھ میں خط تھامے فاتح کی طرح گھر کے اندر داخل ہوتا جبکہ امی کی دھاڑ فاتح کی خوشی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہنے دیتی۔

”ارے یہ کیا طوفانِ بدتمیزی مچا رکھی ہے‘ بے چارے پوسٹ مین کو پانی کا تو پوچھو‘ جانے کتنی دور سے بائی سائیکل پر سوار مارا مارا پھر رہا ہے۔ بتا تو دیا کرو‘ کم از کم چائے‘ سگریٹ کی خرچی ہی دے دیتی۔“ اور ہم نادم ہو کر دوبارہ دروازے کا پٹ کھول کر دیکھتے‘ پر پرانی بائی سائیکل کے پیڈل پر پیر مارتے پوسٹ مین صاحب دو گھر آگے نکل گئے ہوتے اور ہم شرمسار ہو کر امی سے نظریں چراتے جیسے بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو پھر امی بڑی نرمی سے پوسٹ مین کی محنت اور عظمت گنواتیں کہ یہ پوسٹ مین ہی ہم تک ڈاک پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور معمولی تنخواہ کے عوض موسم کی سختی سے بے نیاز اپنا کام جاری رکھتے ہیں‘ کڑی محنت ان کے حصے میں آتی ہے۔

مگر یہ سب باتیں وقت اور ہماری بے حسی کی نذر ہو چکی ہیں۔

”شکریہ‘ بڑی مہربانی۔“ خالی گلاس اور بوتل واپس کرتے پوسٹ مین کی آواز نے مجھے فوراً ہی حال کی دہلیز پر لا دھکیلا پھر اچانک ایک خیال ذہن

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں کوندا کہ اس کردار کی زندگی کو کھوجنا چاہیے جس کا تعلق بھی سڑک سے ہے۔

نام، تنخواہ اور رہائش کی معلومات حاصل کرنے کے بعد فوراً زبانی جمع خرچ کا رستہ اپنایا جو کہ ہم سمیت ہماری پوری قوم کا وطیرہ ہے۔ خیر، مجھے تو اس زبانی کلامی جمع خرچ کا استعمال اس لیے بھی کرنا تھا کہ اس سے حاصل کردہ معلومات شاید ہمارے اور آپ کے رویوں میں مثبت تبدیلی لانے کا باعث ہو۔

''کیا گزارہ ہو جاتا ہے؟ میرا مطلب، چار بچوں سمیت اس مہنگائی کے دور میں اتنی معمولی تنخواہ پر؟''

اداسی سموئے ہلکی سی مسکراہٹ لیے رشید الدین کی کمزور سی آواز ابھری۔ ''آپ نے کیا سمجھا؟ کیا تنخواہ ہی ہماری گزر بسر کے لیے کافی ہوگی؟ ڈاک تقسیم کرنے کا کام تقریباً چار بجے ختم کر کے واپسی کی راہ لیتا ہوں۔ آدھے گھنٹے تک گھر پہنچ جاتا ہوں۔ یہ بھی شکر ہے کہ موٹر بائیک ہے ورنہ آدھے گھنٹے کی مسافت، ڈیڑھ، دو گھنٹے میں طے ہوتی۔ بس کے سفر، وہ بھی ٹریفک جام سے نمٹتے گھر پہنچنے تک اعصاب جواب دے چکے ہوتے تھے۔''

''موٹر بائیک ذاتی ہے؟''

''محکمہ سے ملی ہے۔ تنخواہ سے اس کی قسطیں کٹتی ہیں۔''

''مطلب اتنی کم تنخواہ میں بھی قسطیں کٹ جاتی ہیں تو......''

''پھر بھی شکر ہے، کم از کم دو سالوں میں ہی قسطیں ادا ہو جائیں گی ورنہ تو میں یہ سواری خریدنے کا متحمل کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جلد گھر پہنچنے کی بدولت دوسرا کام کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔''

''دوسرا کام کون سا؟''

''گھر پر مشین کی کڑھائی کا کام۔ فیکٹ[ری سے] مال اٹھاتا ہوں اور رات بارہ بجے تک کڑھا[ئی] کرتا ہوں۔ فیکٹری کے کام کے عوض جو [...] وہ گھر کے کرائے اور بجلی، گیس کے بلوں [...] ہے۔''

''کرایہ کتنا ہوتا ہے؟''

''کرایہ پانچ ہزار روپے اور بل وغیرہ [...] روپے۔''

''بچے پڑھتے ہیں؟''

''ایک بیٹے نے اسی سال میٹرک کیا۔ اس کی کالج میں پڑھنے کی بہت خواہش [...] حالات اجازت نہیں دے رہے۔ باقی بچے [...] کے گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ میر[ی] بڑی خواہش رہی کہ سب بچوں کو کالج [...] پڑھاؤں، پر ابھی بڑے بیٹے کے میٹرک کر[تے ہی] ہوش ٹھکانے آ گئے۔ کالج پڑھانا ہمارے [...] بات نہیں مگر وہ پارٹ ٹائم کوئی چھوٹا موٹا کام کر[کے] کالج پڑھنا چاہتا ہے۔ باقی دیکھتے ہیں آ[گے کیا] ہوتا ہے؟'' اس کے لفظوں میں حسرت اور [...] نے ماحول کو کافی بوجھل بنا دیا تھا چنانچہ میں [نے] ماحول کی گمبھیرتا کو توڑتے ہوئے رشید الدین [کو] ماضی کے خوش کن احساس کی جانب موڑ دیا کیو[نکہ] ماضی محفوظ ہوتا ہے، اس میں ردوبدل کی گنجائش [نہیں] ہوتی اس لیے ہر شخص کو اپنے ماضی سے پیار ہوتا [ہے] خواہ وہ کیسے بھی حالات سے گزرا ہو۔ انسان [...] کی تلخیوں کو ماضی کی یادوں سے مہکا کر کچھ [...] لیے سکون ضرور پا لیتا ہے۔

''ماضی کے ڈاک نظام اور موجودہ نظام میں [کیا] فرق آیا ہے؟''

رشید الدین کے چہرے پر چھائی اداسی [کے] بادل ایک دم چھٹنے لگے۔ ''ماضی کی کیا بات ہے [...] بڑا سنہرا دور تھا۔ جن دنوں میں نئی نئی سروس میں آیا [تو] مہنگائی کا یہ عالم نہیں تھا۔ گزر بسر بڑی اچھی ہوتی تھی۔ والدین حیات تھے۔ نوکری لگتے ہی میری شادی کر دی گئی۔ دو بہنیں بھی تھیں پھر بھی خرچہ برائے نام تھا بلکہ کچھ بچت بھی ہو جاتی تھی۔ خط لے کر جس گھر جاتا، بڑی عزت سے لوگ پیش آتے۔ خطوں کی آمد و رفت کم ہوتے ہی اخلاقیات میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کی ایک وجہ ملک کے بگڑتے حالات بھی ہیں جہاں ہر آدمی پر شک کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ ابھی دو روز قبل ایک جگہ ڈاک دینے گیا۔ کمپنی لیٹر لے کر کئی بار بیل بجانے کے بعد دروازے پر لگے انٹرکام سے پوچھا گیا۔ ڈاک کا بتانے پر دروازہ کھلا، لیٹر لے کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ ابھی لیٹر دے کر پلٹا ہی تھا کہ دو بندے قریب آئے اور لگے جرح کرنے۔

''کون ہو میاں، یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اپنا حوالہ دیا۔ ان کی تسلی پھر بھی نہ ہوئی اور قریب آ کر میرے بیگ کی تلاشی لینا شروع کر دی، یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ؟ میرے استفسار پر کہنے لگے۔

''بھئی، کوئی بھروسہ نہیں، کیا پتا، پوسٹ مین کی آڑ میں دہشت گردی بھی کر رہے ہو گے۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی اسلحہ وغیرہ تو بیگ میں نہیں چھپا رکھا؟''

غصہ تو بہت آیا، جو دہشت گرد ہیں، وہ کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں اور یہاں میرا ناحق وقت برباد کر رہے ہیں، بس زبان سے اتنا ہی کہہ سکا۔

''کیوں بھائی، میں کیا چہرے مہرے سے دہشت گرد لگتا ہوں؟''

''کیا مطلب؟ وہ کوئی آسمانی مخلوق ہوتے

یاد نہ آیا کرو!

☆

تم مجھے یاد نہ آیا کرو

جو یاد جینے نہ دے

وہ بات جو سونے نہ دے

وہ خیال جو روح پر گراں گزرے

وہ احساس جو آنکھ نم کر دے

وہ خوشبو جو دل بیزار کر دے

وہ سب تعلق جو تم سے جڑے ہیں

عذابِ جاں بن جائیں

وہ سب لمحے جو تم سے جڑے ہیں

میں ان سب سے دور جانا چاہتی ہوں

میں سب کو بھول جانا چاہتی ہوں

میں تم کو بھول جانا چاہتی ہوں

☆

فرحت جمال

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں؟ اسی دھرتی پر رہنے والے بندے ہوتے ہیں۔ چلو اب جاؤ یہاں سے......"

اپنے بیٹے کی عمر کے لڑکوں کو اس لہجے میں بدتمیزی کرتے دیکھ کر، کڑھ کر واپسی کی راہ لی کیونکہ اب زمانے کی ہوا بدل گئی ہے۔ "محنت میں عظمت۔" جیسے الفاظ بند کتابوں میں پھپوند کی نذر ہو گئے ہیں اور دولت ہی عزت و تکریم کا باعث بن گئی ہے خواہ وہ کسی بھی ذرائع سے حاصل کردہ کیوں نہ ہو اور ہم جیسوں کے نصیب میں حقارت ہی آتی ہے۔ اچھا، اب اجازت، یہ آخری پارسل اور دو لیٹرز پہنچانے ہیں۔"

"پارسل......؟"

"ہاں، کبھی کبھار اندرونِ سندھ یا دوسرے شہروں سے یہ آجاتے ہیں۔ منی آرڈر بھی کم ہو گئے ہیں۔ زیادہ تر کمپنی لیٹر، ڈیویڈنڈ فنڈ وغیرہ ہوتے ہیں۔" اجازت لے کر رشید الدین نے واپسی کی راہ لی اور میں نظروں سے اوجھل ہوتی موٹر بائیک اور اس کے پیچھے اڑتی دھول میں اسے جاتا دیکھتی رہی۔

............*

"پوسٹ مین۔"

"السلام علیکم! میڈم! یہ منی آرڈر آیا ہے۔ یہ رہی رسید، اس پر دستخط کر دیں۔" دروازہ کھلتے ساتھ ہی روبوٹ کی طرح بولتے لڑکے نے قلم اور رسید تھما دی۔

"تم سے پہلے جو پوسٹ مین، میرا مطلب رشید الدین......"

"وہ میرے والد صاحب ہیں۔ کچھ مہینے پہلے وہ ڈاک تقسیم کر کے گھر جا رہے تھے، رستے میں کچھ ڈاکو، شرپسند یا غنڈے جو بھی نام دے لیں، انہوں نے والد صاحب سے زبردستی ان کا سیل فون جو صرف پانچ سو روپے کی مالیت کا تھا، چھین لیا میں تنخواہ بھی لے لی۔ یہی نہیں، انہوں نے صاحب کے پاؤں پر فائر بھی کیے، گولی ہوئی نکل گئی۔ بروقت بہتر علاج نہ ہونے کا ایک پیر ناکارہ ہو گیا۔ بڑے آپریشن بہت رقم درکار ہوتی ہے جو کہ ہمارے پاس بھی شکر ہے اللہ کا۔ محکمۂ ڈاک والوں نے معذوری اور پرانی سروس کو دیکھتے ہوئے پر مجھے رکھ لیا ورنہ اس وقت جانے اور کتنی سامنا ہوتا۔"

"پر تم تو آگے پڑھنا چاہتے تھے اور ٹیوشن وغیرہ بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا تعلیم رکھنے کے لیے؟"

"بس سمجھ لیں، کالج پڑھنا میرے نہیں تھا۔ ابا گھر پر مشینوں پر کڑھائی کا کام ہیں۔ میں نے ڈاک کی نوکری کر لی ہے۔ گاڑی چل رہی ہے، ایسے میں کالج پڑھنے کے دیکھنا اب چھوڑ دیا ہے۔ بس جو اللہ کو منظور حال میں شکر گزار رہنا چاہیے۔"

رشید الدین کا بیٹا منی آرڈر دے کر احوال بتا کر چلتا بنا۔ اس نے اپنے خوابوں چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔

رشید الدین ہو یا اس کا بیٹا، یا اُن جو غربت کی چکی میں پسنے کے باوجود ہیں، پر صد افسوس کہ ہم لوگ اُن کے صبر میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ خطوط کے ذریعے لوگوں کو اُن کے پیاروں دیتا ہے، حالات کے جبر نے اُس کی زندگی پر پہنچا دی ہے کہ اُس کی خبر گیری کرنے نہیں۔

......☆☆......

سلیم فاروقی

آتشِ جنوں

فیض احمد فیض کا زریں خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ قسط نمبر 15



WWW.PAKSOCIETY.COM

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت مند اور اپنی عزت وانا کے ... جانے والے.....ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کر... ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ ... کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس ... کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آ... اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں ... گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ... کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان ... کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن ... ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس ... جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور ... نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے ... گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس' عمران ... ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورت حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے ... ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دشمن ... پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان ... کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون ... انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے.....عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ... کرتے ہیں.....

راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ... خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ... ہے اُس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور' مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان ... اغوا کر کے اُسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اُس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا' عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے ... وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مُردہ تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران' تیمور اور ... خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

... دوسری طرف مشہدی تھا۔ نادیہ' عمران کو بتاتی ہے اُسے علم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ مشہدی کا دوبارہ فون آتا ہے اور ... کو جواب آ...ز کرتا ہے۔ نادیہ انکار کر دیتی ہے۔ جان محمد کا فون آتا ہے اور وہ عمران کو بتاتا ہے کہ وہ اب مشہدی کے ساتھ نہیں ہے۔ نادیہ اور ... کے قریب آ جاتے ہیں۔ تیمور' ہاشم خان کو گولی مار دیتا ہے۔ عدنان کی امریکہ روانگی کے انتظامات مکمل ہو جاتے ہیں مگر روانگی ... اسے روک لیا جاتا ہے کہ اُس کے پاس آتش گیر مادہ ہے۔ یہ اطلاع غلط ہوتی ہے لیکن عدنان کی فلائٹ مس ہو جاتی ہے۔ تیمور' عمران کو ... ہے کہ یہ غنی بلوچ کی سازش تھی۔ گھر آتے ہیں تو نادیہ' عمران کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن تیمور' عمران کو لے کر لی مارکیٹ میں موجود ... تیمور یا دستاہ ہوٹل جاتا ہے اور کاؤنٹر پر جا کر غلام رسول کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

''غلام رسول مچھلی والا!'' تیمور نے کہا۔

''اچھا' تم بیٹھو چائے وائے پیو۔ ہم اس کو بلواتا ہے۔''

ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ چھریرے بدن کا ایک بلوچ لڑکا ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔ ''تیمور صاحب......!''

''ہاں' میں تیمور ہوں۔'' تیمور نے کہا۔

''آپ لوگ کو واجا غلام رسول نے بلایا ہے۔ آؤ' ہمارے ساتھ۔'' میں نے چائے کے پیسے دینے کے لیے کاؤنٹر کی طرف جانا چاہا تو لڑکا بولا۔ ''چائے کا پیسا مل جاوے گا۔ آپ لوگ فکر نہیں کرو۔''

وہ ہمیں لی مارکیٹ کی مختلف جگہوں سے گھماتا پھراتا ایک پرانے سے مکان کے سامنے ٹھہر گیا اور دروازے پر دستک دی۔

اندر سے بھی ایک بلوچ نے جھانکا پھر لڑکے کو دیکھ کر اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ ہمیں لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہم نے اپنے جوتے اتار لیے کیونکہ اندر فرش پہ چاندنی بچھی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو غلام رسول کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ اب اس کے جسم پر شلوار قمیص کی بجائے جینز اور شرٹ تھی۔ وہ اٹھ کر بہت والہانہ انداز میں مجھ سے گلے ملا پھر بولا۔ ''واجا! آپ تو بالکل غائب ہی ہو گیا' ویسے بھی آپ لوگ کا ہم جیسے چھوٹے لوگوں سے تو دوستی تھا نہیں' آپ تو ناصر صاحب کا دوست تھا۔ ہم تو اس کا ملازم تھا۔''

''یہ بات نہیں ہے غلام رسول!'' میں نے کہا۔ ''میں اس کے بعد اپنی ہی پریشانیوں میں اتنا الجھا رہا کہ مجھے کسی سے بھی ملنے کا وقت نہیں ملا۔ تم سناؤ' آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''ناصر صاحب کے والد نے فشنگ کا کاروبار ختم کر دیا ہے۔ وہ بولتے ہیں' یہ تو کاروبار سے زیادہ میرے بیٹے کا شوق تھا۔ اب وہ ہی نہیں رہا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنا ہوڑا بیچ رہے تھے۔ میں نے خوشامد کر کے ان کا ہوڑا بہت کم قیمت پر اور قسطوں میں ان سے خرید لیا۔''

''اچھا تو اب تم غلام رسول سیٹھ ہو گئے ہو؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''سیٹھ...... سیٹھ کیا صاحب!'' وہ ہنس کر بولا۔ ''بس' گزارہ ہو جاتا ہے اور شکر ہے مالک کا' پہلے سے اچھا ہوتا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

”غنی بلوچ سے ابھی تک تمہارے تعلقات ہیں؟“ میں نے اچانک پوچھا۔
”کیا کروں صاحب؟“ اس نے کہا۔ ”دریا میں رہ کر مگر مچھ سے جھگڑا تو نہیں کر سکتا‘ وہ بدمعاش ہے۔ میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ اسے جب بھی میرے ہوڑے کی ضرورت پڑتی ہے‘ وہ لے جاتا ہے اور واپس کر دیتا ہے۔“
”غلام رسول......!“ تیمور نے کہا۔ ”میں نے سنا تھا کہ تم غنی کے ساتھ کام کر رہے ہو؟“
”ہاں صاحب! ٹھیک سنا تھا‘ اس کے ساتھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔“
”ناصر کے پاس دو اسپیڈ بوٹس بھی تو تھیں؟“ اچانک مجھے ان بوٹس کا خیال آیا۔
”وہ ابھی تک موجود ہیں۔ میں نے تو بڑے صاحب سے کہا تھا کہ انہیں بھی بیچ دے ورنہ کھڑے کھڑے گل جائیں گی۔ سمندر کا پانی انہیں کھا جائے گا لیکن وہ بولتے ہیں‘ یہ میرے بیٹے کی نشانی ہے‘ میں انہیں نہیں بیچوں گا۔ انہوں نے میری ذمے داری لگائی ہے کہ میں ان بوٹس کی دیکھ بھال کروں‘ ان کا انجن چالو رکھوں‘ رنگ و روغن بھی دیکھتا رہوں۔ سمندری ہوا سب سے پہلے بوٹ یا جہاز کے رنگ پر اثر کرتی ہے۔“
”غلام رسول!“ میں نے پوچھا۔ ”پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کر دوں کہ تم نے بروقت اطلاع دے کر ہمیں ایک بڑی پریشانی سے بچا لیا۔“
”ہم نے برسوں ناصر صاحب کا نمک کھایا ہے۔ آپ نے بھی ہم کو بہت بخشش دیا ہے۔ ہم نمک حرامی کیسے کرتا صاحب؟“ غلام رسول نے کہا۔
”لیکن غنی کو معلوم کیسے ہوا کہ عدنان امریکا جا رہا ہے؟“
”بس اچانک ہی اسے معلوم ہو گیا۔ اصل میں جس ٹریول ایجنٹ سے آپ نے عدنان کا ٹکٹ بنوایا تھا‘ وہ غنی بلوچ کا خاص آدمی ہے۔ غنی اُس دن اتفاق سے اُس کے پاس چلا گیا تھا۔ ٹریول ایجنٹ کے پاس پاسپورٹ کی ایک فوٹو کاپی تھی‘ غنی کی نظر اس پر پڑ گئی‘ وہ عدنان کو پہچان گیا۔ اس نے مزید معلومات ایجنٹ سے کر لیں۔ پھر اس نے منصوبہ بنایا کہ عدنان کو ایئر پورٹ پر پکڑوایا جائے۔ جیسے آپ نے اسے پولیس کے حوالے کیا تھا‘ وہ اسی طرح سے اس توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ غنی نے اس کے بعد بہت ہاتھ پیر پھیلا لیے ہیں صاحب!“ غلام رسول نے کہا۔ ”اب وہ پرانا غنی بلوچ نہیں ہے جو ہمارا نائب تھا‘ اب تو اس کے تعلقات پولیس والوں‘ کسٹم والوں اور امیگریشن والوں سے بھی ہیں۔ ایئر پورٹ پر دو تین لوڈرز بھی اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس نے ان لوڈرز کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ایئر پورٹ پر آپ کے چاروں طرف موجود رہیں اور کوئی لوڈر آگے نہ جانے دے۔ پھر جو کچھ ہوا‘ وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔“
”غنی بلوچ کہاں ہوتا ہے؟“ میں نے کہا۔
”اس کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے صاحب!“ غلام رسول نے کہا۔ ”وہ کبھی کدھر ہوتا ہے‘ کبھی کدھر۔“
”تم سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ٹیلی فون پر۔“ غلام رسول نے کہا۔ ”وہ ٹیلی فون کر کے ہم کو بتاتا ہے کہ کہاں پہنچنا ہے؟“
”اور اگر کہیں تمہیں ضرورت پڑے تو؟“ تیمور نے پوچھا۔
”ہمیں ضرورت پڑے؟“ غلام رسول اس کا سوال یا تو سمجھا نہیں یا جان بوجھ کر انجان بن گیا حالانکہ سوال سیدھا سادہ تھا۔

”میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی تمہیں اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت پڑے تو تم کیا کرتے ہو؟“
”میں اسے ٹیلی فون کرتا ہوں پھر وہ جگہ فکس کرتا ہے اور مجھے وہاں بلا لیتا ہے۔“ غلام رسول نے کہا۔ ”کبھی کبھی وہ ٹیلی فون ہی پر مجھے کسی اور آدمی سے ملنے کو کہہ دیتا ہے تو اس سے ملاقات بھی نہیں ہوتی ہے۔“
”اس کا مطلب ہے کہ روز تمہاری ملاقات غنی بلوچ سے نہیں ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں صاحب! روز ملاقات کی تو ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اس دن بھی اتفاق سے غنی بلوچ نے مجھے اپنے ایک خاص کام سے بلایا ہوا تھا۔ اس دن وہ عدنان کو پھنسانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس کی اطلاع آپ تک پہنچا دوں گا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ میرے پاس تیمور صاحب کا نمبر موجود تھا۔“
”تم تیمور کو کیسے جانتے ہو؟“
”تیمور صاحب اکثر ارسلان صاحب کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ وہ لوگ ناصر صاحب سے اسپیڈ بوٹس لیتے تھے اور مجھے لے کر کھلے سمندر میں نکل جاتے تھے۔“
”کھلے سمندر میں جا کر کیا کرتے تھے؟“
”کبھی کھلے پانی میں کوئی جہاز ہوتا تھا‘ اس پہ جا کر کوئی بات چیت کرتے تھے‘ کبھی ویسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے چلے جاتے تھے۔ آپ تو جانتا ہے کہ ارسلان صاحب کو سمندر کی سیر کا کتنا شوق تھا؟“
”ہاں‘ میں جانتا ہوں۔“ میں نے افسردگی سے کہا پھر غلام رسول سے بولا۔ ”تم ابھی غنی کو ٹیلی فون کرو اور اس سے کہو کہ مجھے تم سے فوراً ملنا ہے‘ ایک بہت ہی اہم معاملہ ہے۔“
”کوشش کرتا ہوں۔“ غلام رسول نے کہا اور جیب سے سیل فون نکال لیا۔
اسی وقت ایک لڑکا گھبرایا ہوا آیا اور بلوچی میں غلام رسول سے کچھ کہا۔ میری سمجھ میں صرف غنی اور تیمور کا نام آیا۔
غلام رسول اچانک گھبرا گیا اور بولا۔ ”واجا تیمور! تم لوگ اس دوسرے راستے سے نکل جاؤ‘ جلدی کرو۔“
”کیوں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔
”غنی کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ لوگ اِدھر آئے ہو۔ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اِدھر ہی آ رہا ہے۔“
”آنے دو۔“ تیمور نے کہا۔ ”آج اس سے بھی دو دو ہاتھ کر لیں گے۔“
”حماقت کی باتیں مت کرو تیمور!“ میں نے کہا۔ ”غنی کوئی سڑک چھاپ غنڈہ نہیں ہے پھر اس کے ساتھ جانے کتنے آدمی ہوں؟ یہ بزدلی نہیں‘ مصلحت ہے۔ ہم غنی سے بعد میں بھی نمٹ سکتے ہیں۔ چلو اٹھو‘ جلدی کرو‘ غلام رسول ٹھیک کہہ رہا ہے۔“
غلام رسول ہمیں عقبی دروازے تک چھوڑنے آیا پھر ایک لڑکے کو ہمارے ساتھ کر دیا کہ ان لوگوں کو گلیوں سے نکال کر مین روڈ تک پہنچا دو‘ بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔“ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”عمران صاحب! آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“
”ہاں‘ ہم بھی خالی ہاتھ گھر سے نہیں نکلتے۔“ یہ کہہ کر ہم گھر سے نکل گئے۔
لڑکا ہمیں پتلی پتلی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے نکالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک موڑ مڑتے ہی گلی کے نکڑ پر تین آدمی نظر آئے۔ لڑکا انہیں دیکھ کر چونک اٹھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''واجا......! یہ غنی بلوچ کا آدمی ہے۔ اب ہم واپس جائے گا تو یہ لوگ شبے میں پڑ جائے گا اور ہمیں روکنے کی کوشش کرے گا اس لیے خاموشی سے سیدھے چلتے رہو۔''

وہ لوگ ہمیں دور سے دیکھ کر ہی چوکنا ہو گئے تھے۔ ہم مزید آگے بڑھے تو مجھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بھدا سا ایک ریوالور نظر آیا' باقی لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔

ریوالور والے نے آگے بڑھ کر اچانک میرا راستہ روک لیا اور بولا۔ ''کون ہو تم لوگ اور کدھر سے آیا ہے؟''

''ہم لوگ ادھر علی حسن بلوچ کے پاس آئے تھے۔'' تیمور نے کہا۔ ''سنا ہے کہ اس کے پاس خالص مال ہے۔''

''تم لوگ شکل سے نشئی نہیں لگتا؟'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''اور یہ علی حسن بلوچ کوئی نیا پیدا ہو گیا ہے ادھر؟''

''اس نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔'' تیمور نے کہا۔ ''لیکن وہ ملا نہیں۔''

ریوالور والے نے اچانک ریوالور کی نال لڑکے کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ''تم بتاؤ' اصل بات کیا ہے؟''

''یہ لوگ...... یہ لوگ......''

''جھوٹ نہیں بولنا۔'' ہمیں سنانے کو وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ''اگر جھوٹ بولا تو تیری کھوپڑی اڑا دوں گا تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ لڑکے سے مزید کچھ پوچھتا' میں نے اچانک اس کے دائیں شانے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا اور دایاں ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں جھولنے لگا۔

میں نے فوراً ہی اپنا ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ''بچے کو کیا مردانگی دکھا رہا ہے' مجھ سے بات کر۔''

تیمور نے بھی ریوالور نکال کر اس کے دونوں ساتھیوں کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا' اگر غنی' غلام رسول کے مکان پر پہنچ گیا ہوتا تو اسے معلوم ہو چکا ہوتا کہ ہم عقبی دروازے سے نکل چکے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں مزید آدمی بھی بھیج سکتا تھا۔ میں نے ریوالور کا دستہ خاصی قوت سے اس شخص کے سر پر دے مارا' یہ ہی کام تیمور نے اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کیا۔

لڑکا یہ منظر دیکھ کر بہت دہشت زدہ ہو گیا تھا' وہ بے چارہ شاید ان معاملات میں ابھی تھا بھی نہیں' غلام رسول نے اسے صرف ہماری رہنمائی کے لیے بھیجا تھا۔

''ابھی آپ لوگ سیدھا سیدھا جا کر دائیں بازو کو گھومے گا تو مین روڈ آ جائے گا۔ آپ کا گاڑی بھی ادھر ہی ہے۔''

''ہاں' ٹھیک ہے' اب تم جاؤ۔'' یہ کہہ کر میں اور تیمور کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دائیں طرف گھومنے کے بعد جلد ہی ہم مین روڈ پر پہنچ گئے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ہماری لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ میں نے ریموٹ سے گاڑی کے دروازے کھولے اور خود جلدی سے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تیمور بھی پسنجر سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

لی مارکیٹ پہنچ کر میں نے گاڑی کا رخ ٹاور کی طرف موڑنا چاہا لیکن اچانک پشت سے کسی نے میری گردن پر ریوالور کی نال رکھ دی اور بولا۔ ''ادھر نہیں' سیدھا چلتے رہو۔''

میں بری طرح اچھل پڑا' تیمور بھی چونک اٹھا۔

میں نے بیک ویو مرر میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے سوائے ایک ہاتھ کے کچھ نظر نہ آیا۔ بیٹھنے والا کچھ اس انداز میں عقبی سیٹ کے پائیدان میں بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ اور پورا جسم چھپ گیا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق سیدھا چلتا رہا۔

''اڑے یہ گاڑی ہے کہ گدھا گاڑی؟'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''کیسا مریل رفتار سے چل رہا ہے۔ ''اڑے تھوڑا اسپیڈ دکھاؤ۔''

''اس کا گیئر پھنس رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتی۔'' میں نے کہا۔

''بکواس کرے گا تو ابھی تمہارا کھوپڑی تربوز کے مافک بکھر جائے گا۔ یہ بالکل نیا لینڈ کروزر ہے' ہمارے ماتھے پر کیا پاگل کا بوڈ (بورڈ) لگا ہے؟''

''تمہارا ماتھا ہمیں نظر ہی کب آ رہا ہے واجا!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پر پاگل کا بورڈ ہے یا باولے کا؟'' پھر میں تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم ہو کون اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟''

''زیادہ بات کرنے کا ضرورت نہیں ہے عمران صاحب!'' اس نے کہا' گویا وہ میرا نام بھی جانتا تھا۔ ''گاڑی کو اسپیڈ دو ورنہ ہم تمہارے اس دوست کو مار دے گا۔''

میری باتوں سے اس کی توجہ ہم لوگوں کی طرف سے کچھ کم ہو گئی تھی۔

''او بھائی......!'' تیمور نے کہا۔ ''ڈرائیونگ سیٹ پر میں نہیں ہوں جو تم مجھے مار دو گے؟ اس سے کہو اسٹیئرنگ میرے حوالے کر دے پھر دیکھنا میں اس لینڈ کروزر کو کیسے جیٹ ہوائی جہاز بناتا ہوں۔''

''ابھی زیادہ بات نہیں کرو ورنہ ہمارا کھوپڑی گھوم گیا تو دونوں کی کھوپڑی اڑا دے گا۔''

''یار تم جب سے گاڑی میں بیٹھے ہو' مسلسل مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ دھمکی نہیں ہے۔ ہم جو کچھ کہتا ہوں' اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ اب ہم پانچ تک گنوں گا' اس کے بعد تمہارے ساتھی کا کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' اس نے ریوالور کی نال تیمور کی گردن پر رکھ دی۔ ''ایک...... دو......''

میں نے گاڑی کی اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔ وہ جھٹکے سے اچھل کر پیچھے گرا۔ تیمور نے گھوم کر پلک جھپکتے میں اس کی ریوالور والی کلائی پکڑ لی اور اسے زوردار جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود بھی قلابازی کھا کر پیچھے کی طرف چلا گیا۔

مجھے عقب نما آئینے میں اب پیچھے کا منظر واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ تیمور نے اس کی دونوں کلائیاں تھام رکھی تھیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔

حملہ آور کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح تیمور کی گرفت سے اپنی کلائیاں چھڑا لے مگر تیمور کی گرفت معمولی نہیں ہوتی تھی۔ حملہ آور نے بھنا کر تیمور کو ایک غلیظ گالی دی اور اس کی ناک پر ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ تیمور نے اس کی خوفناک ٹکر سے بچنے کی کوشش کی لیکن بچتے بچتے بھی اس کی ٹکر تیمور کے چہرے کی بائیں طرف لگی۔ ٹکر خاصی شدید تھی' میں نے تیمور کو سر جھٹکتے دیکھا پھر کچھ سنبھل کر اس نے بھی ٹکر ہی کا استعمال کیا اور حملہ آور کی پیشانی پر اتنی زوردار ٹکر ماری کہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ تیمور نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کلائی چھوڑ کر اس کے منہ پر اتنا زوردار پنچ مارا کہ حملہ آور ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح کرب ناک آواز میں چیخا اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

''یہ کہیں مر تو نہیں گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بہت سخت جان ہے بھیا! اس قسم کی چھوٹی موٹی چوٹیں تو ان کو لگتی رہتی ہیں۔''

پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ''اب اس کا کرنا کیا ہے؟''

''اسے اپنے ایک ٹھکانے پر لے جا کر تفتیش کروں گا۔ آپ ایسا کریں، اب آپ اپنی نشست پر آ جائیں، ڈرائیونگ میں کروں گا۔ آپ کو اس ٹھکانے کا علم نہیں ہے جہاں اس وقت میں اس حملہ آور کو لے جا رہا ہوں۔''

میں نے گاڑی روک دی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دوسری طرف سے تیمور اتر اور اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تیمور نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے تشویش سے کہا۔ ''بھیا! آپ نے ایک بات نوٹ کی، ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔''

''تعاقب ہو رہا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ابھی جب آپ نے گاڑی روکی تھی تو میں نے ایک آف وہائٹ سوزوکی کو بھی آتے دیکھا تھا، مجھے اس میں دو آدمی نظر آئے تھے، ممکن ہے سوزوکی کیری کے پچھلے حصے میں مزید آدمی بھی ہوں۔''

''کیا اب بھی وہ سوزوکی کیری ہمارے تعاقب میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، ہمارے روانہ ہوتے ہی وہ بھی حرکت میں آ گئی تھی۔''

''پھر ایسا کرو کہ اپنے ٹھکانے پر جانے کی بجائے یونیورسٹی روڈ کی طرف چلو۔ میں اس سوزوکی کیری میں موجود افراد کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

تیمور نے پسنجر سیٹ کو تھوڑا سا پیچھے کھسکایا اور سیٹ کے نیچے واقع چھوٹے سے خفیہ خانے سے ریوالور کے سائیلنسر اور ٹیبل ٹینس کی جتنی چار گیندیں نکال لیں پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''بھیا! ذرا اپنا ریوالور مجھے دیں۔''

''فی الحال میرے ریوالور کو چھوڑو، تم ڈرائیونگ کی طرف توجہ دو۔ میں اس سوزوکی کیری کو کسی ویرانے میں لے جانا چاہتا ہوں کہ وہاں ہم بہت آسانی سے ان کا شکار کر سکتے ہیں۔''

''وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے لیکن آپ اپنے ریوالور پر یہ سائیلنسر تو فٹ کر لیں۔''

''اور یہ بال کیسی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ گیندیں نہیں ہیں بلکہ انتہائی طاقت ترین بم ہیں، ان میں ایسا آتش گیر مادہ ہے کہ جہاں بھی پڑے وہاں آگ لگا دیتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ بم استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔''

اس دوران میں ہم صفورا گوٹھ کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔

''یار تیمور، یہاں بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ تمام گہما گہمی اور رونق زیادہ سے زیادہ محکمہ موسمیات کے دفتر تک ہو گی لیکن یہاں تو اس سے بھی زیادہ رش ہے۔''

''یہاں سے آگے ڈملوٹی کی طرف جاتے ہوئے اب بھی ہزاروں ایکڑ زمین ہے جو قبضہ مافیا کی دست برد سے اب تک محفوظ ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ زمین کسی انتہائی ذی اثر شخص کی ملکیت ہے۔ ممکن ہے وہ حکومت ہی کا کوئی با اثر وزیر یا مشیر ہو۔''

ہم صفورا گوٹھ سے کافی آگے نکل گئے۔ بائیں طرف ملیر چھاؤنی کا علاقہ تھا جہاں بڑی سی چیک پوسٹ کے سامنے بیریئرز لگے تھے اور دو تین سنتری موجود تھے۔ ہم سڑک کے اس دوشاخے سے دائیں طرف چلے گئے۔ چند کلومیٹر بعد ہی ویرانہ شروع ہو گیا۔ سڑک کی دونوں اطراف خودرو جھاڑیوں کا ایک جنگل بھی تھا۔

میں نے تیمور سے پوچھا۔ ''وہ سوزوکی کیری اب کہاں ہے؟''

''وہ بہت مستقل مزاجی سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' تیمور نے ہنس کر جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ ہمارا شکار کچھ کسمسا رہا تھا، گویا اسے بھی ہوش آنے والا تھا۔

میں نے اس کے سر پہ ریوالور کا ایک اور دستہ رسید کر دیا تاکہ وہ کم سے کم ایک گھنٹے تک آرام سے لیٹا رہے۔

چند کلومیٹر مزید چلنے کے بعد سڑک پہ ایک ہلکا سا موڑ آیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس موڑ کی وجہ سے سوزوکی کیری چند سیکنڈ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میں نے عجلت میں تیمور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا اور خود بائیں طرف کی خودرو جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے تیمور سے کہا کہ تم گاڑی کا بونٹ کھول کر یہ ظاہر کرو جیسے اس کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔

پھر میں پوری طرح جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ اس کوشش میں میرے گھٹنے اور جسم کے دوسرے حصے زخمی ہو گئے۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے میرے کپڑے بھی پھٹ گئے لیکن میں پوری طرح مستعد تھا۔

فوراً ہی مجھے کسی دوسری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی، وہ سوزوکی کیری ہی تھی۔ ان لوگوں نے ہماری گاڑی کے عین نزدیک اپنی گاڑی روک دی تھی۔

پھر کوئی کرخت آواز میں بولا۔ ''کیا ہوا جناب، ہم کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ گاڑی کرنٹ نہیں لے رہی ہے، پوائنٹ کا مسئلہ ہے۔'' تیمور نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں جناب! میرا ساتھی شیرو بہت اچھا مکینک ہے۔ یہ ابھی منٹوں میں آپ کی گاڑی اسٹارٹ کر دے گا۔'' کرخت آواز پھر سنائی دی۔

''تھینک یو ویری مچ!'' تیمور نے کہا۔ ''اتنا کام تو میں بھی جانتا ہوں، میں ٹھیک کر لوں گا۔''

''آپ کے ساتھ اور کون ہے؟'' کرخت آواز پھر سنائی دی۔

''آپ پلیز! اپنے کام سے کام رکھیں۔'' تیمور نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''ہم اپنے کام سے ہی کام رکھ رہے ہیں۔'' کرخت آواز والا شخص بولا۔ ''ہمیں شبہ ہے کہ آپ کی گاڑی میں منشیات ہیں۔''

''منشیات......؟'' تیمور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ہاں ہیں تو پھر؟''

''پھر یہ کہ ہمیں گاڑی کی تلاشی لینا پڑے گی۔'' وہ آدمی پھر بولا۔

''آپ ہیں کون؟'' تیمور نے جھلا کر پوچھا۔ ''اور آپ کو تلاشی کا اختیار کس نے دیا ہے؟''

''میں نارکوٹکس کا انسپکٹر شہباز خاں ہوں۔'' کرخت آواز والا بولا۔ ''اور میں کافی دور سے آپ کا پیچھا کرتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا آیا ہوں۔"

"اور آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ کسی بھی شریف شہری کو پریشان کریں، اس کی گاڑی کی تلاشی لیں" نے درشت لہجے میں کہا۔ "جائیے، میں آپ کو تلاشی نہیں دوں گا۔"

"تلاشی تو تمہیں دینا پڑے گی۔" شہباز نے کہا۔ نہ جانے وہ اس مردود کا فرضی نام تھا یا اصل؟

"یہ ریوالور جیب میں رکھ لو انسپکٹر صاحب!" تیمور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "ان کھلونوں سے کھیلتے عمر گزر گئی ہے، میں اس سے ڈرنے والا نہیں ہوں، کوئی راکٹ لانچر یا توپ لے کر آؤ، شاید میں ڈر جاؤں۔"

"تیری بہت زبان چل رہی ہے، اس کھلونے میں سے ایک چھٹانک کی گولی نکلتی ہے جو انسان کو آسمان پر پہنچا دیتی ہے، چل، گاڑی کی تلاشی دے۔"

میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے سر نکال کر دیکھا، مجھے اپنی گاڑی کے نیچے سے دو آدمیوں کے پیر نظر آ رہے تھے، گویا اس جعلی انسپکٹر کے علاوہ وہاں ایک آدمی اور بھی تھا۔ ممکن ہے، گاڑی میں دو چار آدمی مزید ہوں۔ میں نے نیچے سے جعلی انسپکٹر اور اس کے ساتھی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

گولی لگتے ہی وہ کراہ کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے دوسرے آدمی کو نشانہ بنایا، وہ چیخ مار کے زمین پر بیٹھ گیا، گولی اس کی پنڈلی ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس دوران میں تیمور بھی اچھل کر جھاڑیوں میں چلا گیا تھا پھر مجھے 'ٹھک' کی آواز سنائی دی اور سوزوکی کیری کی طرف سے کسی کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔

میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا تیزی سے سڑک کی طرف بڑھا۔ اب میں اپنی گاڑی کی پشت پر تھا اور سوزوکی کیری بھی بہت واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ ایک آدمی سوزوکی کے دروازے کے بیچ میں آدھا اندر اور آدھا باہر لٹک رہا تھا اور وہ بری طرح زخمی تھا۔

پھر میں نے سوزوکی سے ایک اور شخص کو برآمد ہوتے دیکھا، وہ بہت احتیاط سے ارد گرد دیکھتا ہوا نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔

"اندر ہی رہو۔" جعلی انسپکٹر چیخ کر بولا۔ "ابھی باہر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی، اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر گاڑی میں گھستا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کے اچھلا اور پھر دھب سے زمین پر آ گرا۔ میں نے دوسرا فائر گاڑی کے ٹائر پر کیا پھر مزید ایک فائر اس کے دوسرے ٹائر پر کر دیا۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور تیمور کی آواز آئی۔ "اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ تم سب کو اس ویرانے میں ہلاک کر دوں گا۔"

تیمور کی آواز سن کر میں بھی باہر آ گیا۔ وہ کُل چار آدمی تھے، دو میری فائرنگ سے زخمی ہو گئے تھے، تیسرا تیمور کی گولی سے مارا گیا تھا اور چوتھا بھی میری گولی سے زخمی ہوا تھا جو آدمی گاڑی سے نکلتے ہوئے میری گولی کا نشانہ بنا تھا، اس کی حالت نازک تھی، گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ شدید کرب کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ شکل وصورت سے وہ بھی مکرانی تھے۔ پہلی نظر میں وہ نیگرو لگتے تھے کیوں کہ ان کے جسموں پر

نہیں تھیں۔

"مجھے ہاسپٹل پہنچا دو۔" جعلی انسپکٹر نے کہا۔ "میرے زخم سے بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔"

"تمہیں اپنی فکر ہے؟" تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اپنے اس ساتھی کی فکر نہیں ہے جو تکلیف کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہے؟"

"اس کا تو آخری وقت آ پہنچا ہے۔" جعلی انسپکٹر نے بے حسی سے کہا۔ "ہمارے دھندے میں یہی ہوتا ہے، موت ہر موڑ پر گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی اندھی گولی ہمیں چاٹ جاتی ہے۔"

"تمہارے دھندے میں...... کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا تعلق تو نارکوٹکس کے شعبے سے ہے، میں تمہیں کسی سرکاری ہوسپٹل پہنچا دیتا ہوں، اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دو۔"

جعلی انسپکٹر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ "میں اگر سرکاری ملازم ہوتا تو آج بے یار و مددگار تم لوگوں کے رحم و کرم پر نہ پڑا ہوتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟" تیمور نے کہا۔ "کیوں؟ تم گاڑی کی تلاشی کیوں لینا چاہتے تھے؟"

"میں آپ کو سب بتا دوں گا، پہلے مجھے فرسٹ ایڈ دے دیں ورنہ خون بہنے سے میں مر جاؤں گا۔"

"تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے۔" تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس وقت تک اس کا دوسرا زخمی ساتھی شاید بے ہوش ہو چکا تھا یا پھر خون بہہ جانے سے مر چکا تھا۔

"تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے اور گاڑی کی تلاشی کیوں لینا چاہتے تھے؟"

"اس گاڑی میں ہمارا ایک آدمی تھا۔" اس نے یوں کہا جیسے آدمی نہ ہو، کوئی چیز رہ گئی ہو۔

"ہمارا آدمی؟ ہماری گاڑی میں؟" تیمور نے حیران ہونے کا مظاہرہ کیا۔

"ہاں وہ ہمارے سامنے آپ کی گاڑی میں چھپا تھا۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، مجھے پہلے فرسٹ ایڈ دے دیں۔"

"اس کے جو آدمی مر گئے ہیں انہیں دوبارہ اس سوزوکی میں ڈال دو۔" میں نے تیمور سے کہا۔ "اور اسے اپنی گاڑی میں منتقل کر دو۔"

تیمور اس کی گاڑی کی طرف بڑھا، وہ اس وقت بھی بہت محتاط تھا کہ ہمارا ان کا کوئی اور ساتھی اب بھی گاڑی میں موجود ہو لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔

اس وقت تو وہ آدمی بھی مر چکا تھا جو میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔ ایک آدمی تیمور کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ تیمور نے ان دونوں کو اٹھا کر دوبارہ گاڑی میں ڈالا پھر وہ اس جعلی انسپکٹر اور اس کے اس ساتھی کی طرف متوجہ ہوا جو سب سے پہلے میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔ وہ دوسرا آدمی بھی اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ تیمور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے ایک گہری سانس لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

"خس کم جہاں پاک۔" تیمور نے کہا۔ "یہ بھی جان سے گیا۔" پھر وہ جعلی انسپکٹر سے بولا۔ "یار، تم لوگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہباز تھوک نگل کر رہ گیا' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
''ہاں' اب بتاؤ' یہ خادم حسین کون ہے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''میں نے رحیمو کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔'' شہباز نے کہا۔ ''خادم حسین کا کوئی وجود نہیں ہے۔''
''تم تو بہت اچھی اردو بول لیتے ہو۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟''
''میں نے انٹرمیڈیٹ کیا ہے صاحب!'' اس نے اچانک مجھے ''صاحب!'' بنا دیا۔
''تو پھر تم نے خادم حسین کا نام کیوں لیا؟''
''پرانے لوگ غنی بلوچ کو خادم حسین کی بجائے خادو کے نام سے پکارتے ہیں۔''
''کون غنی بلوچ؟'' میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔
''آ...... آپ غنی بلوچ کو نہیں جانتے صاحب؟'' اس کے لہجے میں تحیر تھا۔
''غنی بلوچ کیا قائداعظم ہے یا صدر اوباما؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''کہ اسے جاننا بہت ضروری ہے''
''ہمارا خیال تھا کہ آپ انڈرورلڈ کا آدمی ہے' آپ غنی بلوچ کو ضرور جانتے ہوں گے۔''
''میں تمہیں انڈرورلڈ کا آدمی لگتا ہوں؟'' میں نے کہا۔
''صاحب' لگتے تو نہیں ہو لیکن......''
''اچھا چھوڑو اس بات کو' غنی بلوچ نے تم سے کیا کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔
''اس نے مجھے پچیس ہزار روپے دیئے تھے اور کہا تھا کہ اس گاڑی میں جو سوار ہو' اسے اغواء کر کے پاس لے آؤ۔ اگر زیادہ اڑی کرے تو اسے وہیں گولی مار دو۔ میں نے رحیمو سے کہا کہ تم اس گاڑی میں چھپ بیٹھ جاؤ اور گاڑی والوں کو اسٹیڈیم روڈ کی طرف لے آؤ پھر میں ان سے نمٹ لوں گا۔'' پھر وہ آہستہ سے
''رحیمو ہر قسم کے لاک کھولنے میں ماسٹر ہے پھر گاڑی کا لاک تو اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔''
''فالتو بکواس سے پرہیز کرو تو اچھا ہے۔'' تیمور غرا کر بولا۔ ''تم سے غنی بلوچ نے اور کیا کہا تھا؟''
''اور تو اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا...... ہاں' اس نے کہا تھا کہ اس کے گینگ کا ایک آدمی غلام رسول ڈبل کراس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عمران بھی اس وقت اس کے ڈیرے پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھی اور بھی ہے' ان دونوں کو گھیر کر بنگلہ نمبر سترہ میں لے آؤ۔ غلام رسول سے تو میں خود نمٹ لوں گا'' زادہ' آیندہ زندگی بھر کسی سے بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں رہے گا۔ میں اس کی زبان ہی کاٹ ڈالوں گا'' بانس نہ بجے گی بانسری۔''
مجھے غلام رسول کی طرف سے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ غنی بلوچ نے اپنے آدمیوں کی ناکامی کا سارا غصہ رسول پر اتارا ہو گا۔
میں نے تیمور کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور اس سے کہا۔ ''تیمور! ذرا غلام رسول کا نمبر ملاؤ۔''
تیمور نے موبائل فون جیب سے نکالا اور غلام رسول کا نمبر ڈائل کر دیا۔ اس نے احتیاطاً اسپیکر فون آن کر دیا تھا۔
دوسری طرف بیل بجتی رہی پھر غلام رسول کی آواز آئی۔ ''ہیلو تیمور! کیسے کال کی' سب خیریت تو ہے'' اس کی آواز سن کر میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

''غلام رسول!'' تیمور نے کہا۔ ''لو' عمران صاحب سے بات کرو' یہ تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھے۔''
اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔
''غلام رسول!'' میں نے سیل فون لے کر کہا۔ ''تم خیریت سے تو ہو؟''
''میں بالکل خیریت سے ہوں عمران واجہ!'' اس نے کہا۔
''لیکن محتاط رہنا۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکے تو اپنا وہ ٹھکانا عارضی طور پر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ غنی بلوچ کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ میں نے اس کے تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور دو آدمی میری قید میں ہیں۔ ابھی اسے اس کا علم نہیں ہے' جب اسے معلوم ہو گا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنا وہ ٹھکانا فوری طور پر چھوڑ دو۔''
''کیسا بات کرتا ہے واجہ؟'' غلام رسول نے برا مان کر کہا۔ ''ابھی غلام رسول پر اتنا برا وقت نہیں آیا ہے کہ کوئی اس کے گھر میں گھس کر اسے نقصان پہنچا سکے اور پھر زندہ سلامت وہاں سے لوٹ جائے۔ تم احتیاط کرو واجہ!'' اس نے فکرمندی سے کہا۔ ''اگر کچھ بندے چاہئیں تو اپنے کچھ بہترین بندے تمہاری طرف بھیج دوں؟''
''شکریہ غلام رسول!'' میں نے کہا۔ ''میں بھی اب اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ غنی بلوچ جیسے تیسرے درجے کے بدمعاش مجھے نقصان پہنچا سکیں' بس تم اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور دوبارہ شہباز کے کمرے میں آ گیا۔
''صاحب جی!'' غنی بلوچ کے مخبر سارے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں' وہ آج نہیں تو کل آپ کا یہ ٹھکانا تلاش کر لے گا۔''
''تمہارا سیل فون کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔
''وہ تو مجھ سے پہلے ہی آدمی نے لے لیا تھا۔'' شہباز نے کہا۔
''یہ گھڑی اور انگوٹھی بھی اتار کر مجھے دے دو۔'' میں نے کہا۔
میں نے دیکھا' میری اس بات سے شہباز کا چہرہ کچھ تاریک پڑ گیا' اس نے پہلے انگوٹھی اتاری' وہ سونے کی تھی' اس انگوٹھی میں جس میں یاقوت جڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ انگوٹھی میری طرف بڑھا دی۔
''گھڑی......'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔
''یہ گھڑی تو بہت سستی ہے صاحب!'' اس نے کہا۔ ''صدر میں ڈھیریوں کی صورت میں ایک سو ساٹھ روپے کی بکتی ہے۔''
تیمور نے آگے بڑھ کر پھر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور ناگواری سے بولا۔ ''کیا تم بغیر مار کھائے کوئی کام نہیں کرتے؟ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ گھڑی اتار دو تو اتار دو' چاہے اس کی قیمت ایک سو ساٹھ روپے ہو یا ایک لاکھ روپے!''
تھپڑ کھا کے شہباز کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا' وہ بھنا کر بولا۔ ''اپنے ہاتھ قابو میں رکھو مسٹر! انڈرورلڈ کی دنیا بہت چھوٹی ہے' ہو سکتا ہے' کل تم میری جگہ ہو اور میں تمہاری......''
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور تیمور نے پہلے سے بھی زیادہ قوت سے اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔ ''تو مجھے دھمکی دے رہا ہے' ہاں انڈرورلڈ کی دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن جب تو اس چھوٹی دنیا میں واپس جائے گا تو کچھ کر سکے گا۔ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تجھے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ تو دوبارہ وہاں جاسکے۔ اب جلدی سے گھڑی اتار کے میرے حوالے کر ورنہ اب میرا ہاتھ نہیں بلکہ لات چلے گی۔"

شہباز کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا' اس کے چہرے پر تیمور کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہوگئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے دو چار دانت بھی ہل گئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ جبڑے کی ہڈی میں بھی فریکچر ہوا ہو۔ اس کے دائیں رخسار کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

اس نے قہر آلود نظروں سے تیمور کو گھورا اور اپنے ہاتھ سے کلائی کی گھڑی اتار کر میری طرف بڑھادی۔

میں ایک مرتبہ پھر تیمور کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا اور بولا۔ "سب سے پہلے تو اس کا موبائل آف کرکے اس میں سے سم اور بیٹری نکال لو۔ ممکن ہے موبائل میں کوئی لوکیشن فائنڈر ڈیوائس لگی ہو۔ اس کے بعد اس کی یہ گھڑی چیک کرو اس میں کوئی ڈیوائس ہوسکتی ہے۔"

اس کا سیل فون تو میں نے پہلے ہی آف کردیا تھا۔ میں اس کی بیٹری اور سم بھی نکال دیتا ہوں' ویسے میرا اندازہ ہے کہ اگر کوئی ایسی ڈیوائس ہے بھی تو اس کی گھڑی میں ہوگی۔ آپ نے گھڑی اتارنے کے نام پر اس کا ردِعمل نہیں دیکھا تھا؟"

"ہمارے آدمیوں میں کوئی الیکٹرانک کا ماہر ہے؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا آدمی جو کنفرم کرسکے کہ گھڑی میں کوئی ایسی ڈیوائس ہے یا نہیں؟"

"بالکل ہے۔" تیمور مسکرا کر بولا۔ "آپ شاید عدنان کو بھول گئے۔ وہ ابھی امریکا نہیں گیا ہے اور میرے خیال میں تو وہ ہر قسم کے الیکٹرانک سامان کا کیڑا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف دیکھا ہے۔"

"ارے ہاں' عدنان کو تو میں بھول ہی گیا۔" میں نے کہا۔ "اصل میں وہ ان تمام معاملات سے لاتعلق ہے اس لیے اس کا خیال نہیں آیا۔"

"دوسری بات یہ کہ ہاشم بھی ان تمام کاموں میں بہت ماہر ہے' اس نے تو پیکنگ کی بھی کی ہے۔"

"تو پھر ہاشم ہی کو بلالو لیکن اسے بلانے سے پہلے رحیمو کا سیل فون اور انگوٹھی بھی لے آؤ۔"

"اس کا بھی سیل فون میرے پاس ہے لیکن گھڑی میں نے اس سے نہیں لی' شاید اس کے ہاتھ میں گھڑی تھی ہی نہیں۔ دیکھتا ہوں کہ اس کے پاس رسٹ واچ ہے یا نہیں؟"

تھوڑی دیر بعد ہاشم اور تیمور ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ تیمور رحیمو سے بھی رسٹ واچ اور انگوٹھی لے آیا تھا۔ اس نے رحیمو کے سیل فون سے سم اور بیٹری دونوں نکال دی تھیں۔

"ہاں عمران! تم نے مجھے بلایا؟"

وہ چونکہ مجھ سے کافی سینئر تھا اس لیے مجھے "تم" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ مجھے اس کا یہ اندازِ تخاطب پسند تھا۔

"ہاں' میں نے بلوایا ہے۔" میں نے کہا۔ "ذرا یہ گھڑیاں غور سے دیکھیں۔ ان......"

"یہ تو خاصی مہنگی گھڑیاں ہیں عمران! اس وقت ان دونوں گھڑیوں کی قیمت تقریباً ڈھائی لاکھ روپے ہوگی کیا تم یہ گھڑیاں خرید رہے ہو؟"

"آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیں' میں نے آپ کو یہاں گھڑیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے نہیں بلایا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں دستی گھڑیوں میں کوئی ایسی چپ' کوئی ایسی ڈیوائس تو پوشیدہ نہیں ہے جو لوکیشن فائنڈر کے طور پر لگائی جاتی ہے؟"

"اچھا' اچھا!" ہاشم نے طویل سانس لیا اور بولا۔ "مجھے اس کے لیے اپنا ہی تیار کردہ میٹر اور کچھ دوسرے اوزار استعمال کرنا پڑیں گے۔"

☆......☆

دس منٹ کے اندر اندر ہاشم نے یہ بتادیا کہ ان دونوں گھڑیوں میں مخصوص قسم کے سگنلز والی ڈیوائس موجود ہیں۔

"یہ ناکارہ کیسے ہوں گی؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ کوئی پرابلم نہیں ہے' میں وہ چپ نکال کر ضائع کردوں گا۔"

میں ایک مرتبہ پھر شہباز کے کمرے میں جانے لگا تو نادیہ نے مجھے ٹوک دیا اور بولی۔ "اب آپ دو گھڑی ذرا آرام کرلیں۔"

"بس دس منٹ اور!" میں نے کہا اور شہباز کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

وہ میٹرس پہ دیوار کے سہارے نیم دراز تھا اور چہرے سے خاصا فکرمند نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ لوگوں نے میرے زخم کی اچھی طرح صفائی تو کردی تھی نا؟"

"اس صورتِ حال میں جو کچھ ممکن تھا' ہم نے کردیا ہے۔ اگر تمہارا زخم بگڑ بھی گیا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' تمہاری ایک ٹانگ ہی تو کاٹنا پڑے گی۔" تیمور نے سفاک اور سرد لہجے میں کہا۔

"اب ذرا جلدی سے مجھے غنی بلوچ کا سیل نمبر بتاؤ تاکہ اس سے بھی دو باتیں ہوجائیں۔" میں نے کہا۔

اس نے بلا چون وچرا غنی بلوچ کا نمبر بتادیا۔

تیمور نے وہ سیل فون نکالا تھا جو ایسے موقعوں پر ہم استعمال کرتے تھے۔ اس نے نمبر ملا کر سیل فون میرے حوالے کردیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی' میں مایوس ہوکر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے کال ریسیو کرلی گئی اور کوئی انتہائی اکھڑ لہجے میں بولا۔ "ہیلو......"

"کون بول رہا ہے؟" میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"تم کو کس سے بات کرنی ہے؟" دوسری طرف سے درشت لہجے میں کوئی بولا۔

"مجھے غنی بلوچ سے بات کرنا ہے۔" میں نے بھی اسی طرح غیر مہذب لہجے میں کہا۔

"میں بول رہا ہوں' تم کون ہو؟"

"میں تمہارا باپ ہوں......" میں نے کہا۔

"کیا بکواس کررہا ہے؟" غنی بلوچ تپ کر بولا۔ "تو جانتا ہے کہ کس سے بات کررہا ہے؟"

"تو نے ابھی تو اپنا نام بتایا ہے کم ذات...... اب مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ میں تجھے جانتا ہوں یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں تیرا باپ عمران بول رہا ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"عمران......!" وہ سپاٹ لہجے میں بولا پھر خاموش ہوگیا۔ میں سمجھا کہ اس نے لائن ڈراپ کردی ہے۔

"ہیلو......" میں نے کہا۔ "میرا نام سن کر تجھے سانپ کیوں سونگھ گیا بے غیرت؟"

"تو ابھی تک زندہ ہے؟" اس نے یوں کہا جیسے اسے میری موت کی اطلاع مل چکی ہو۔

"اللہ کے فضل سے میں زندہ ہوں اور تجھے جہنم رسید کرنے سے پہلے مروں گا بھی نہیں۔" پھر میں ہنس کر بولا۔ "تو کیا سمجھ رہا تھا کہ اپنے ان پانچ چوہوں کو بھیج کر مجھے ختم کرادے گا؟ پانچ چوہوں کے ذکر پر مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آرہی ہے' وہی

پانچ چوہے گھر سے نکلے
کرنے چلے شکار"

"دیکھو عمران! اگر میرے ان آدمیوں کو کچھ ہوا تو میں تجھے دنیا کے کسی کونے میں نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے شاید معلوم نہیں کہ ان لوگوں میں میرا بھائی بھی ہے۔"

"تم شاید بھول رہے ہو کہ ایک میرا بھائی بھی تھا' اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں پوچھتا ہوں کہ میرا بھائی کہاں ہے؟"

"آواز نیچی کر کے بات کر۔" میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ "پہلے تو یہ بتا کہ تو نے ان چوہوں کو میرے پیچھے کیوں بھیجا تھا؟"

"تجھے جہنم رسید کرنے کے لیے۔" غنی بلوچ غالباً دانت پیس کر بولا تھا۔

"لیکن معاملہ الٹ ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تو صفورا گوٹھ سے تقریباً بیس' بائیس کلومیٹر اندر کی طرف جا' وہاں ایک سوزوکی کیری میں تجھے تیرے آدمیوں کی لاشیں مل جائیں گی۔"

"بکواس کرتا ہے' کتے...... کمینے......"

"اپنی اوقات میں رہ اچکے' ہیروئن فروش' تو' تو ان لوگوں میں سے ہے جو جس تھالی میں کھاتے ہیں' اسی میں چھید کرتے ہیں۔ اپنے بھائی کی موت کی خبر سن کر کتنا دکھ ہو رہا ہے' تو نے ناصر کو قتل کرنے سے پہلے سوچا تھا کہ وہ بھی کسی کا بھائی ہے' کسی کا بیٹا ہے؟"

"مجھے بتاؤ' میں پریشان ہوں کہ میرا بھائی شہباز کہاں ہے؟"

"میں نے بتایا تو ہے کہ وہ صفورہ گوٹھ سے بیس' بائیس میل کے فاصلے پر سوزوکی کیری کی خودساختہ قبر میں پڑا ہے' جا' اسے جا کر لے آ اور کفن دفن کا بندوبست کر۔"

"عمران! اگر واقعی میرے بھائی کو کچھ ہوگیا ہے تو یہ سمجھ لے کہ تو نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردیے ہیں۔"

"یہ بہت پرانا فلمی ڈائیلاگ ہے' اب تو بہت سارے نئے ڈائیلاگ بھی مارکیٹ میں آگئے ہیں۔ لگتا ہے' تم آج کل فلمیں نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"ابھی کرلے بکواس......" غنی بلوچ دہاڑ کر بولا۔ "لیکن جس دن بھی تو میرے ہتھے چڑھ گیا' میں......"

"بھونکتا ہے......" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے اپنے بھائی کی لاش کا بندوبست کر ورنہ وہ وہیں سوزوکی میں پڑی پڑی سڑ جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

پھر میں رحیمو کے کمرے میں پہنچا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ ویران ویران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم غنی بلوچ کے ساتھ کب سے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"غنی بلوچ......!" اس نے حیرت سے کہا۔ "میں غنی بلوچ کو نہیں جانتا۔ ہاں' شہباز سے اس کا نام ضرور سنا ہے۔"

"تم نہیں جانتے کہ غنی بلوچ کون ہے اور وہ کیا کام کرتا ہے؟"

"میں یہ تو جانتا ہوں۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "لیکن کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے اور مجھ جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کو شہباز ہی ہدایت دیتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کی گاڑی میں چھپ جاؤں۔"

"تم شہباز کو کیسے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو صاحب! معمولی درجے کا ایک اچکا تھا۔ ہاں' ہر قسم کے تالے کھولنے کا فن مجھے آتا تھا۔ میرے باپ نے بچپن ہی سے مجھے ایک تالے والے کے پاس بٹھا دیا تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی ہنر آجائے۔ وہاں رہ کر میں نے بہت چھوٹی عمر میں ہر قسم کے تالوں کا سسٹم سمجھ لیا۔ بارہ سال کی عمر میں تو میں نمبروں والے تالے بھی بہت آسانی سے کھولنے لگا۔"

"پھر تم نے اس ہنر کو ناجائز کاموں کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں کہوں گا' مجبوری تھی تو یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی۔ اس شہر میں ہزاروں چابیاں بنانے والے جائز طریقے سے اپنا رزق کما رہے ہیں۔ بس میں اپنے حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ بابا کا بھی انتقال ہوچکا تھا اس لیے مجھے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

میرا استاد جو مجھے کام سکھاتا تھا' وہ بھی چل بسا تو اس کے بیٹوں نے اس کی دکان پر قبضہ کرلیا اور مجھے نکال باہر کیا' بس اسی دن کے بعد سے میں دکانوں کے تالے کھولنے لگا' گھروں میں گھس کر چوریاں کرنے لگا۔ ایسے میں ایک موقع پر ایک دکان کا تالا کھولتے ہوئے علاقے کے چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا۔

اچانک وہاں شہباز اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں گزرا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جیپ روک لی اور چوکیدار کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا' بس اسی روز سے میں شہباز کے ساتھ ہوں۔"

"اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو کیا تم شہباز کا ساتھ چھوڑ دو گے؟" میں نے کہا۔

"مشکل ہے صاحب! اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں تو اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا لیکن وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ اس کے کہنے پر میں نے اتنے غیر قانونی کام کیے ہیں کہ وہ مجھے جیتے جی تو چھوڑنے سے رہا۔"

"اور اگر شہباز ہی نہ رہے؟" تیمور نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

رحیمو نے چونک کر تیمور کو دیکھا پھر سہم کر بولا۔ "صاحب! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"مطلب صاف ہے۔" میں نے کہا۔ "اب میں شہباز کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ شہباز کو کیا' میں تو غنی بلوچ کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ پرتجسس' سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

"عشاء کی اذان ہوتے ہی وہ گھر سے چلے گئے تھے۔ میں دیر تک اُن کے انتظار میں جاگتی رہی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی پھر رات میں جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔" میں نے تھانے دار کو تفصیل بتائی۔ تھانے دار نے لفافے میں سے وہی دوپٹہ نکال کر میز پر رکھ دیا جو اسے جائے واردات سے ملا تھا۔

"کیا یہ دوپٹہ تمہارا ہے؟" تھانے دار نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......" دوپٹہ میرا تھا لہٰذا میں نے اقرار کرلیا۔

"ابھی تم نے کہا کہ تم ساری رات گھر پر تھیں پھر تمہارا یہ دوپٹہ لاش کے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

"تھانے دار صاحب! یہ دوپٹہ بے شک میرا ہے مگر یہ چھ سات مہینے پہلے چوری ہوگیا تھا۔"

"تم نے اس چوری کا تذکرہ کسی سے کیا تھا؟"

"نہیں...... کیونکہ اس واقعہ کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی اسی لیے میں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔"

"تمہاری ساس کا کہنا ہے کہ اُس نے دوپٹہ سنگاپور سے آنے والی ایک عورت سے مہنگے داموں خریدا تھا۔" تھانے دار نے پہلو بدلا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، تمہارا دوپٹہ کون چوری کرسکتا ہے؟" تھانے دار نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

"جب میرا دوپٹہ چوری ہوا تھا، اُس وقت میں ساس سسر کے گھر رہتی تھی اور وہاں میری نند اور میری جیٹھانی بھی ہوتی ہیں۔ اُن کے علاوہ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی ہمارے گھر آتی رہتی تھیں۔ میں کسی ایک پر الزام نہیں لگا سکتی۔"

"اچھا، یہ بتاؤ کہ تمہارے شوہر کا کوئی دشمن ہے؟" تھانے دار نے روایتی سوال کیا۔

"جی نہیں، اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی، کوئی اس کا دشمن ہو ہی نہیں سکتا تھا، وہ ایک سیدھا سادہ معصوم سا شخص تھا۔" یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

"اب تم اپنے بارے میں بتاؤ، مجھے تمہارے متعلق بہت غلط قسم کی اطلاعات ملی ہیں۔ اگر تم قاتل نہیں ہو تو مجھے ساری باتیں سچ سچ بتادو تاکہ میں اصل قاتل کا سراغ لگا سکوں۔ بظاہر تو حالات تمہارے خلاف ہیں، تم مصیبت میں ہو۔"

تھانے دار مجھے مصیبت کا احساس نہ بھی دلاتا، تب بھی میں عہد کرچکی تھی کہ اس کے سامنے اپنی تمام حقیقت بیان کردوں گی پھر چاہے وہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے یا اس مصیبت میں میری مدد کرے۔ یہ سوچ کر میں نے اسے اپنی داستانِ حیات سنانا شروع کی تھی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔

"تھانے دار صاحب! میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئی۔ میرے ابو خاندان کے دوسرے مردوں سے بہت مختلف تھے۔ اُن کا زیادہ وقت شہر میں گزرا تھا۔ وہ تھوڑے بہت پڑھے ہوئے بھی تھے اس لیے کسی حد تک آزاد خیال تھے، اسی آزاد خیالی کی وجہ سے ابو نے خاندان کے تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود مجھے اسکول میں مڈل تک تعلیم دلوائی تھی۔ ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا کوئی علیحدہ اسکول نہیں تھا۔ ایک ہی پرائمری اسکول تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ پانچویں تک میں نے گاؤں کے اسکول میں پڑھا پھر گاؤں سے ایک میل دور قصبے کے مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔

گاؤں کا ایک لڑکا امجد بھی میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ اس کا باپ فوج میں صوبے دار تھا اور اُن کے پاس بہت سی قابلِ کاشت زمین بھی تھی اس لیے وہ خاصے کھاتے پیتے اور خوش حال لوگ تھے۔ امجد

اور میں ایک ہی کلاس میں تھے لیکن شروع میں ہمارے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔

جب ہم روزانہ میل بھر پیدل چل کر مڈل اسکول میں جانے لگے تو امجد سے میری دوستی ہوگئی۔ ہم ساتھ ساتھ اسکول جاتے اور اکٹھے ہی واپس آتے۔ امجد بہت شوخ اور شریر لڑکا تھا۔ وہ ہر وقت مجھے چھیڑتا رہتا۔ اکثر میں اس کی شرارتوں سے تنگ آکر ناراض ہوجاتی یا رو پڑتی، تب بھی اس کی شوخی و شرارت کم نہ ہوتی۔ مجھے ستانے میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ وہ مجھے چھیڑتے ہوئے کہتا۔

"شبو......! جب تک تمہیں تنگ نہ کرلوں، مجھے چین نہیں پڑتا۔ تم نہیں آتی ہو تو دن میرے لیے طلوع ہی نہیں ہوتا۔"

وقت کے ساتھ ساتھ امجد سے میری دوستی پختہ ہوچکی تھی۔ مڈل پاس کرتے ہی ابو نے میری پڑھائی چھڑادی۔ میں گھر کی چاردیواری میں قید ہوئی تو بہت اداس رہنے لگی۔ ہر وقت مجھے امجد کا خیال ستاتا رہتا۔ میرا جی چاہتا کہ امجد ہر وقت میرے پاس رہے، مجھے چھیڑے اور ہنسائے مگر وہ بھی مڈل کرنے کے بعد اپنے ماموں کے پاس لاہور چلا گیا تھا اور وہیں آگے پڑھ رہا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ گاؤں آیا تو اس کی شان ہی نرالی تھی، نئے فیشن کے کپڑوں میں وہ بہت جچ رہا تھا۔ اس کا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا لیکن میرے لیے وہی امجد تھا۔ وہ مجھ سے ملا تو اس کی باتوں میں وہی پہلے والی بے تکلفی اور شرارت تھی۔ میں کنویں پر پانی بھرنے جاتی تو وہ بھی پہنچ جاتا اور دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ میں اب بھی اس سے روٹھتی تھی اور وہ مجھے مناتا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑتا ہے، یونہی کھیلتے کھیلتے ہم جوان ہوگئے۔ جب دل میں میٹھا میٹھا درد جاگا اور اپنے اندر انجانی سی کسک محسوس ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ امجد مجھے کیوں اچھا لگتا تھا۔ اس کی جدائی مجھے کیوں ستاتی تھی۔ میرا دل خودبخود اس کی طرف کیوں کھنچتا تھا۔ اس کا خیال میرے ذہن و دل پر کیوں چھایا رہتا تھا۔

ایف اے کرنے کے بعد امجد گاؤں آگیا تھا اور اب اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کررہا تھا۔ پہلے ہم بے دھڑک ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن اب ہم پر زمانے کا خوف غالب آگیا تھا۔ یہ شاید ہمارے دل کا چور تھا ورنہ کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری بے چینیاں بڑھتی گئیں اور جذبوں میں شدت آتی گئی۔ ہم راتوں کی تاریکی میں بستی سے دور کھیتوں میں ملنے لگے۔

امجد قسمیں کھا کر اپنی محبت کا یقین دلاتا تھا۔ "شبو......! دنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے لیکن تجھے اپنی دلہن ضرور بناؤں گا۔" اس کے خوش کن وعدوں سے میں سرشار ہوجاتی اور جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھنے لگتی۔ میں بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور اس کے ایک اشارے پر مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

ایک رات میں اور امجد کھیتوں میں بیٹھے اپنے گردوپیش سے بے نیاز میٹھی میٹھی محبت بھری باتوں میں مصروف تھے۔ امجد میرے زانوں پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا، میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی کہ اچانک کوئی ہمارے قریب گرج کر بولا۔

"امجد......!"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ امجد تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے سامنے امجد کے ابا کھڑے تھے۔ اُن دنوں وہ چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے امجد کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر تین چار تھپڑ جڑ دیئے۔ امجد بھاگ کھڑا ہوا پھر وہ میری طرف مڑے، خوف سے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا، پورا جسم جیسے سن

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو کر رہ گیا تھا۔

"او کتیا...... کیوں میرے بیٹے کو تباہ کر رہی ہے تو؟ تجھ میں شرم و حیا نام کو نہیں کم ذات، جا دفع ہو جا......" غصے میں اُن کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ توہین کے احساس سے چُور چُور میں بڑی مشکل سے گرتی پڑتی گھر پہنچی۔

دوسرے دن امجد کے والد نے میرے ابو کو بلایا اور جب وہ گھر واپس آئے تو اُن کی آنکھوں میں غصہ تھا اور چہرہ سُتا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی مجھے چوٹی سے پکڑ کر بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ اماں نے مجھے بچانے کی بہت کوشش کی مگر ابو نے مجھے اُس وقت تک نہ چھوڑا جب تک میں نڈھال ہو کر بے ہوش نہ ہو گئی پھر ابو پر کچھ ایسی وحشت سوار ہوئی کہ انہوں نے میری شادی کی تیاریاں شروع کر دیں اور چند ہی روز میں عظمت سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ میں بہت روئی، بہت تڑپی مگر میری کسی نے نہ سنی۔ نکاح سے پہلے میں نے امجد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اُس کے والد نے اُسے ماموں کے پاس لاہور بھیج دیا۔

میرا شوہر عظمت ایک شریف، سیدھا سادہ اور مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ مجھ جیسی پڑھی لکھی اور خوبصورت بیوی پا کر اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا مگر میں اُسے دل سے قبول نہ کر سکی تھی پھر بھی والدین کی عزت و وقار کی خاطر میں نے کوشش کی کہ میں ایک بیوی کا حق ادا کر سکوں اور شوہر کی خدمت کروں مگر امجد کی محبت میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی، میں اسے بھلا نہ سکی۔ اسی وجہ سے میں اکثر اداس رہتی۔ میری ساس میرا بہت خیال رکھتی اور مجھے خوش رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔

گو کہ مجھ سے پہلے گھر میں ایک بہو موجود تھی مگر میری ساس کی اُس سے ذرا نہ بنتی تھی۔ میری جیٹھانی یوں تو اَن پڑھ تھی لیکن فیشن میں شہر کی لڑکیوں کو مات کرتی تھی جبکہ میری ساس کو فیشن کے نام سے چڑ تھی۔ میری جیٹھانی کا شوہر یعنی میرا جیٹھ دبئی میں تھا اور سال دو سال بعد ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آتا تھا۔

میری شادی ہوئے چار ماہ گزر گئے تھے، شوہر اور ساس کی بھرپور توجہ اور چاہت کی وجہ سے میں ازدواجی زندگی میں دلچسپی لینے لگی تھی اور امجد کو آہستہ آہستہ بھولتی جا رہی تھی کہ ایک دن امجد اچانک آ گیا اور اس نے میری پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی۔ امجد نے مجھے پیغام بھجوایا کہ رات میں مجھ سے ملو۔

میرا پریشان ہونا فطری تھا، اب میں ایک شادی شدہ عورت اور کسی کی عزت تھی اور پہلے کی طرح امجد سے راتوں کو نہیں مل سکتی تھی لیکن امجد کی محبت میرے دل میں اُمڈ آئی تھی۔ اس نے مجھے بے پناہ چاہا تھا اور میں نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ دل کہتا تھا، ایک بار ملنے میں کوئی حرج نہیں لیکن عقل اس بات کو رَد کر رہی تھی۔

آخر میں نے بہت سوچا اور فیصلہ کیا کہ میں امجد سے ضرور ملوں گی لیکن آخری بار اور اس سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اب تم میری زندگی سے نکل چکے ہو اس لیے مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھو اور قسمت کے فیصلے کو میری طرح ہنسی خوشی قبول کر لو۔

رات کو جب میں امجد کے پاس پہنچی تو وہ مجھ سے مل کر رو پڑا۔ اس کی حالت بالکل پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دل کٹ کے رہ گیا تھا لیکن میں مجبور تھی، میں بھی سوائے رونے کے اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

"امجد......! اب رونے دھونے سے کیا ہوگا، تقدیر کو یہی منظور تھا۔" میں نے اس سے کہا۔

"نہیں شبانہ......!" وہ چیخ اٹھا۔ "میں تقدیر کے اس فیصلے کو قبول نہیں کرتا، ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے، میرے ظالم باپ نے مجھے تم سے جدا کیا ہے شبانہ......! میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔" اس نے دیوانوں کی طرح کہا تو میں چونک اٹھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو امجد؟"

"ہاں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی، تم میری ہو شبانہ......! اس بندھن کو توڑ دو ورنہ میری زندگی کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ تم میرا ساتھ دو شبانہ......! میں تمہارے بنا مر جاؤں گا......"

"لیکن میرا شوہر مجھے طلاق نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، بے پناہ محبت!" میں نے بے بسی سے کہا۔

"لیکن تم مجھ سے محبت کرتی ہو شبانہ......! کیا تم اپنے وعدوں سے پھر چکی ہو؟" اس کا لہجہ زخمی تھا۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔

"امجد......! میں تمہاری محبت کو اپنے دل سے کبھی نہیں مٹا سکتی لیکن......سوچو تو اب ہمارا ملن ممکن نہیں۔"

"اگر تم میرا ساتھ دو تو ہمارا ملن ہو سکتا ہے۔" امجد کی باتوں نے میرے اندر ہلچل مچا دی اور اس کی سوئی ہوئی محبت پھر سے جاگ اٹھی۔ میں ایک بار پھر امجد کے سپنے دیکھنے لگی۔ اس کی محبت پھر میرے دل میں انگڑائیاں لینے لگی۔ اس کی چاہت نے مجھے مجبور کر دیا کہ تقدیر کے فیصلے کو تدبیر سے بدل دوں۔

شوہر سے طلاق کے لیے امجد نے مجھ سے کہا۔ "تم اپنے شوہر سے کھلم کھلا نفرت کا اظہار کرو، ساس سے بھی اپنا رویہ توہین آمیز رکھو......"

میری زندگی خوشگوار ہی نہ تھی بلکہ مثالی اور قابلِ رشک تھی مگر میں امجد کی خاطر اس جنت کو اجاڑنے پر تل گئی۔ انہی دنوں میرے ابو کا انتقال ہو گیا۔ اب میں بالکل آزاد تھی، روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے امجد کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا اور اپنی گھریلو زندگی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ ساس سے بات بے بات لڑائی ہونے لگی۔ شوہر سے بھی بات بے بات جھگڑ پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا گھر جہاں دنیا زمانے کا سُکھ چین تھا، اب اس کی فضا بے چینی سے آلودہ ہو گئی تھی۔

ایک دن میں نے جان بوجھ کر گلی میں امجد سے علیک سلیک کی اور کافی دیر تک اس سے بے تکلفی سے باتیں کرتی رہی۔ میری توقع کے عین مطابق یہ بات میری ساس اور شوہر تک پہنچ گئی مگر مجھ سے کسی نے کچھ نہ کہا البتہ میرا شوہر اداس اداس رہنے لگا۔ ساس اب یقینی طور پر مجھے بدچلن سمجھنے لگی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی، اس کی نظروں میں اب میری کوئی عزت و وقعت نہ رہی تھی۔

ایک روز چھوٹی سی بات پر میں اپنی ساس سے خوب لڑی۔ اس جھگڑے میں میری زبان سے انتہائی گھٹیا اور غیر مہذب الفاظ نکلے حتیٰ کہ میں نے اسے گالیاں تک دیں۔ اُس وقت میرا شوہر گھر میں تھا۔ گالیوں کی آواز اُس کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ وہ اپنی ماں کی یہ توہین برداشت نہ کر سکا اور غصے میں مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

شوہر سے مجھے اس وحشیانہ سلوک کی توقع نہ تھی لیکن ماں کی محبت میں وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ساس کو کوسنے اور گالیاں دیتی ہوئی اپنی اماں کے پاس آ گئی۔

دوسرے دن میرا شوہر پشیماں سی صورت لیے میرے پاس آیا اور مجھ سے اپنی زیادتی کی معافیاں مانگنے لگا۔ وہ مجھے گھر لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اور میری ماں نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا پھر وہ خود نہیں آیا بلکہ گاؤں کے معزز لوگوں کو اماں کے پاس بھیجا کہ شبانہ کو گھر بھیج دیں مگر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابھی جانا نہیں چاہتی تھی اس لیے ہر بار ٹال مٹول سے کام لیتی تھی۔

میں دو ماہ تک میکے میں بیٹھی رہی پھر الگ مکان کی شرط پر اپنے سسرال واپس گئی۔ میرے شوہر نے نہ صرف یہ شرط مان لی بلکہ چند دنوں میں اس پر عمل بھی کر دیا۔ میرے سسر کا آبائی گھر کافی عرصے سے خالی پڑا تھا اور وہ لوگ نئے مکان میں رہتے تھے۔ نیا مکان میرے جیٹھ نے بنوایا تھا۔ میرے سسر کا وہ مکان گاؤں کے عین وسط میں تھا۔ میرے شوہر نے اس کچے مکان کی صفائی کروائی اور ہم اس میں رہنے لگے۔

الگ مکان میں آنے سے یہ فائدہ ہوا کہ میری اور امجد کی ملاقاتوں میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ امجد کا گھر میرے گھر سے ایک مکان چھوڑ کر تھا۔ رات کو جب میرا شوہر عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تو امجد اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر بیچ کے مکان کی چھت سے ہوتا ہوا میرے مکان کی چھت پر آ جاتا اور میں شوہر کے آنے تک اس سے باتیں کرتی رہتی۔

پہلے ہماری محبت ہر گندگی سے پاک تھی مگر ان ملاقاتوں کے دوران ہم گناہوں کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ میں نے بھی یہ سوچ کر خود کو امجد کے حوالے کر دیا کہ بالآخر مجھے اس سے شادی کرنا ہے۔

اسی طرح چھ ماہ گزر گئے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امجد کی محبت بھی سرد پڑتی چلی گئی۔ اب وہ اکثر ایک دو دن کا ناغہ کر کے مجھ سے ملنے لگا۔ ایک روز میں نے شکوہ کیا تو اس نے نہایت بے زاری سے کہا۔

”میں صرف تمہارے ہی خیال میں تو نہیں رہتا‘ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔“ اس کی بات اور لہجے سے میرا دل انجانے وسوسوں میں گھر گیا۔ کہاں تو میرے بغیر اس کا ایک پل گزرنا مشکل ہوتا تھا اور اب وہ مجھ سے کترا رہا تھا۔ میں اس سے شادی کے متعلق بات کرتی تو وہ ٹال جاتا۔ اس حوالے سے جتنا میں سوچتی تھی‘ اتنا پریشان ہوتی کہ اگر امجد نے مجھے اس حال میں چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟

ایک رات میں اور امجد گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک عظمت آ گیا۔ میرے شوہر کو دیکھتے ہی امجد تو فوراً سیڑھیاں چڑھ کر بھاگ گیا۔ عظمت کی آنکھیں مارے غصے کے ابل پڑیں۔ اس نے ایک ڈنڈے سے مجھے اس بے دردی سے مارا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔

صبح مجھے ہوش آیا تو عظمت پشیمان سا میرے پاس بیٹھا تھا۔ میرے انگ انگ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ امجد نے مجھے گرم دودھ میں گھی ملا کر پلایا۔ مجھے عظمت پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ نادم اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دے گا۔ میں کئی روز تک بستر پر پڑی اپنی چوٹیں سہلاتی رہی پھر جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو عظمت مجھ سے بولا کہ میں تمہیں جلد ہی آزاد کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے میکے جانے کو کہا۔ اس نے یہ سب ایسے دکھی انداز میں کہا کہ میرے دل میں کہیں چوٹ سی لگی۔ اس لمحے مجھے عظمت بہت ہی عظیم لگا۔ وہ مجھ آوارہ اور بدچلن کے ساتھ بھی کتنی نرمی اور خلوص سے پیش آ رہا تھا حالانکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اس لیے اس نے مجھے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا‘ یہ فیصلہ کرتے وقت اس کے چہرے پہ زمانے بھر کی اداسی تھی۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا‘ بے پناہ محبت!

عظمت اپنا فیصلہ سنا کے گھر سے باہر چلا گیا لیکن مجھے ایک عجیب ذہنی اذیت میں مبتلا کر گیا۔ مجھے اپنا آپ بہت ہی گھٹیا اور ذلیل محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتا تھا اور مجھے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر میری خوشی کی خاطر اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ عظمت نے مجھے اماں کے گھر جانے کو کہہ دیا تھا مگر اب یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ اگر میں میکے چلی گئی تو عظمت مجھے کبھی لینے نہیں آئے گا اور مجھے طلاق دے دے گا۔

پہلے میں عظمت سے طلاق لینا چاہتی تھی مگر اب نہ جانے کیوں طلاق کے نام سے ہی مجھے خوف آنے لگا تھا۔ میں عجیب کرب و اذیت سے دوچار تھی اور فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ عظمت کا گھر چھوڑوں یا نہ چھوڑوں؟ میں اس دن ماں کے گھر نہیں گئی۔ عظمت نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ چار دن تک ہم اجنبیوں کی طرح ایک ہی گھر میں رہتے رہے۔ پانچویں دن اُس نے مجھ سے محض اتنا پوچھا تھا۔

”تم اپنے گھر نہیں گئیں؟“ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور نہ جانے کیوں میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے بعد پھر ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گئے۔ میں ہی کبھی کوئی بات کرتی تو وہ ہوں ہاں میں جواب دے دیتا لیکن بات کرنے میں کبھی پہل نہ کرتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہنے لگا تھا۔ گھر میں ہوتا تو خالی خالی نگاہوں سے خلا میں گھورتا رہتا۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ میں نے اس دوران امجد سے کہہ دیا کہ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ امجد نے پلٹ کر اس کی وجہ بھی نہیں پوچھی‘ جس شخص کی خاطر میں اپنے شوہر اور ساس سے بری بنی‘ جس کی وجہ سے میری زندگی تباہ ہوئی‘ وہی اب مجھ سے کترا رہا تھا۔ میں نے تمام حالات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ عظمت سے طلاق لینے کے بعد میں بالکل ہی تباہ و برباد اور بے آسرا ہو جاؤں گی۔ امجد سے اب مجھے کوئی خوش گمانی نہ تھی۔ آخر بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ عظمت کے قدموں میں گر کر اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں گی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے معاف کر دے گا کیونکہ وہ بہت اچھا انسان تھا۔ اُس رات یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔ میں نے سوچا‘ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے عظمت کو مناؤں گی لیکن اگلی صبح وہ میرے جاگنے سے پہلے ہی گھر سے نکل چکا تھا۔ وہ تمام دن گھر سے باہر رہا اور رات ہونے کے بعد گھر آیا۔ میں کھانا تیار کر چکی تھی۔ میں نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کھانا کھایا۔ میں برتن اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جب میں واپس صحن میں آئی تو عظمت گھر سے نکل رہا تھا۔ اُس وقت مسجد سے عشاء کی اذان گونج رہی تھی۔ اُس وقت میں نے اُسے روکنا مناسب نہ سمجھا مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ چاہے وہ آدھی رات کو ہی کیوں نہ واپس آئے‘ میں اس کے انتظار میں جاگتی رہوں گی اور جب وہ آئے گا تو اس کے قدموں میں گر جاؤں گی۔ میں رات گئے تک جاگتی رہی تھی پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اٹھی تو ہر طرف یہی آوازیں تھیں۔ ”عظمت قتل ہو گیا...... عظمت کو کسی نے مار دیا......“ میں اپنی داستان حیات سنا کر خاموش ہو گئی۔ تھانے دار بغور میری شکل دیکھ رہا تھا۔

اُس نے میری تمام باتیں پوری توجہ سے سنی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہاری یہ کہانی اگر حقیقت ہے تو پھر تمہارے شوہر کے قتل کی دو وجوہ سامنے آتی ہیں‘ ایک تو تمہارا معاشقہ جس میں تم اور امجد دونوں ہی یہ جرم کر سکتے ہو‘ دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہارے شوہر نے تمہاری طرف سے مایوس ہو کر کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار کر لیے ہوں اور اس عورت کے وارثوں میں سے کسی نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو لیکن میں فی الحال کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں اپنی تحقیقات جاری رکھوں گا اور جلد ہی اصل معاملہ سامنے آ جائے گا۔ اگر تمہیں اپنے مقتول شوہر کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہو تو بلا تاخیر مجھے بتا دینا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

اس کے بعد پولیس کی تحقیقات کی کہانی کافی طویل ہے، جہاں تک امجد کا تعلق ہے، وہ صاف بچ نکلا تھا کیونکہ واردات کی رات سے دو دن قبل ہی وہ لاہور چلا گیا تھا اور اب بھی وہیں تھا۔ ویسے بھی امجد کے والد نے اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال کیا تھا۔ اس قتل میں صرف میری ہی ذات مشکوک تھی یا پھر بقول تھانے دار، کسی غیر عورت کے تعلقات ہی اس کی موت کا سبب ہو سکتے تھے لیکن تھانے دار اب تک ایسی کسی عورت کا سراغ لگانے میں ناکام رہا تھا۔

تھانے دار نے مجھ سے کئی بار پوچھ گچھ کی تھی مگر اس نے مجھے حراست میں نہیں لیا تھا۔ میں بہت خوف زدہ تھی اور مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ تھانے دار چاہتا کیا ہے؟ وہ کسی اور نکتے پر اپنی تحقیقات کر رہا تھا لیکن پھر اچانک ایک اور سنسنی خیز اور شرمناک انکشاف ہوا جس نے تمام الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا دیا۔

میرا جیٹھ گزشتہ پندرہ برس سے دبئی میں تھا۔ وہ سال میں ایک دفعہ یا کبھی دو سال میں ایک دفعہ پاکستان آتا تو گاؤں بھر کی عورتیں ہمارے گھر جمع ہو جاتی تھیں اور اس کی لائی ہوئی قیمتی چیزوں اور کپڑوں کو حیرت سے دیکھتی تھیں۔ میرا جیٹھ دوبئی میں خوب دولت کما رہا تھا۔ اسی کی کمائی سے میرے سسرال والوں نے ایک وسیع و عریض اور نہایت خوبصورت مکان بنایا تھا۔ میرے جیٹھ کے پاس پیسے کی فراوانی تھی، اس وجہ سے والدین بھی اس سے دبتے تھے۔

اس کی بیوی ذکیہ بالکل اَن پڑھ تھی لیکن اسے فیشن کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھ دیکھ کر خود کو ہیروئن سمجھتی تھی۔ وہ نت نئے فیشن کے کپڑے سلوایا کرتی اور ہر وقت بنی سنوری رہتی تھی۔ اس کے میک اپ کے سامان اور خوشبوؤں کا ایک ڈھیر تھا۔

اسے یہ غرور بھی تھا کہ سارا خاندان اس کے شوہر کی کمائی پر پل رہا ہے۔ وہ بات بے بات ساس کو طعنے دیتی، ہر بات میں اپنی من مانی کرتی، اسی وجہ سے میری ساس نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ آزاد پرندے کی طرح جہاں چاہتی، چلی جاتی، نہ اس پہ کوئی روک ٹوک تھی اور نہ ہی کوئی اسے کچھ کہہ سکتا تھا۔

میرے شوہر کے قتل کے ایک ماہ بعد ذکیہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ میرے سسر اسی وقت ایک لیڈی ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے ذکیہ کو دیکھتے ہی بتا دیا کہ اس نے زہر کھایا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے ایک اور سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ذکیہ ماں بننے والی ہے۔ میری ساس اور سسر دونوں گنگ رہ گئے، ان کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ پھر اس کے پیٹ میں کس کا گناہ تھا؟ یہ سوال سانپ بن کر ہر ایک کو ڈسنے لگا۔ اب ذکیہ کے زہر کھانے کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی، اپنا گناہ چھپانے کے لیے اس نے مرنے کی کوشش کی تھی۔ اس انکشاف سے میرے شوہر کے قتل کا معمہ بھی حل ہو گیا۔

تھانے دار جو اپنے طور پر قتل کی تحقیقات کر رہا تھا، میں نے یہ خبر فوراً تھانے دار تک پہنچا دی۔ وہ اسی وقت میرے سسر کے گھر پہنچ گیا۔ یہ شرمناک بات ابھی تک عام نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے افراد اور ایک پڑوسی کے علاوہ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ مجھے بھی اس کے پڑوسیوں کے ذریعے اطلاع ملی تھی۔ تھانے دار کو دیکھ کر میرے سسر حیران رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ خبر اتنی جلدی پولیس تک پہنچ جائے گی۔

تھانے دار نے ذکیہ سے پوچھ گچھ کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اب ہوش و حواس میں تھی۔ وہ تو اپنے گناہ کے انکشاف سے پہلے ہی خوف زدہ تھی، تھانے دار کو دیکھ کر مزید گھبرا گئی، اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھی کہ تھانے دار اسے اقدام خودکشی کے کیس میں گرفتار کرنے آیا ہے لیکن اس کے برعکس تھانے دار کا پہلا سوال ہی بوکھلا دینے والا تھا۔

"تمہاری وجہ سے عظمت مارا گیا، بتاؤ، اسے کس نے قتل کیا، تمہارے باپ نے یا بھائی نے؟" ذکیہ گھبراہٹ میں رونے لگی۔ تھانے دار نے اسے نرمی سے سمجھایا کہ اگر وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے گی تو سزا سے بچ جائے گی، چنانچہ اس نے سب کچھ اگل دیا۔

ذکیہ نے گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر اسکول ماسٹر سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے جس کا نتیجہ اس کی تباہی اور بربادی کا باعث بن گیا۔ وہ ماسٹر چار برس سے گاؤں کے اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ دم درود بھی کرتا تھا اور تعویذ گنڈے بھی دیتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے عامل کامل سمجھتے تھے اور اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ بچوں کو قرآنِ پاک بھی پڑھاتا تھا۔

ذکیہ کا میکہ اسکول کے بالکل ساتھ تھا۔ وہ اپنے شوہر کو اسی ماسٹر سے خط لکھوایا کرتی تھی۔ پہلے تو صرف یہ تعلق خط لکھوانے اور پڑھوانے تک محدود رہا پھر ذکیہ نے ماسٹر سے اپنے شوہر کو اپنا غلام بنانے کے لیے تعویذ وغیرہ بھی لینا شروع کر دیئے۔ ان تعویذ گنڈوں کی آڑ میں ماسٹر اسے دونوں ہاتھ سے لوٹتا رہا۔ وہ دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی اسی ماسٹر کے پاس اپنے اپنے روگ دور کرانے کی خاطر جاتی رہتی تھیں اسی لیے ذکیہ کے اس سے ملنے پر کسی کو اعتراض نہ ہوا۔

ذکیہ اس ماسٹر کو بہت قابلِ احترام سمجھتی رہی۔ اس نے بتایا کہ ایک دفعہ جب میرا شوہر دبئی سے آنے والا تھا تو ماسٹر نے مجھ سے کہا کہ تم رات کو میرے پاس آنا، میں تمہیں ایک بہت خاص تعویذ دوں گا۔ ذکیہ اَن پڑھ اور توہم پرست تھی اس لیے بغیر سوچے سمجھے رات کو ماسٹر کے پاس چلی گئی۔ اس رات ماسٹر نے اسے اپنا گھناؤنا روپ دکھایا، اس نے ذکیہ کو نجانے کیا چیز سنگھائی کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ لٹ چکی تھی، وہ روتی دھوتی گھر آ گئی۔

شوہر کے آنے کے بعد وہ اس بات کو بھول گئی لیکن شوہر کے دبئی جاتے ہی وہ پھر ماسٹر کے پاس جانے لگی لیکن اب وہ اپنی مرضی سے وہاں جاتی تھی کیونکہ شوہر کی غیر موجودگی میں ماسٹر اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ اگر کبھی نہ بھی چاہتی تو اسے ماسٹر کے پاس جانا پڑتا کیونکہ ماسٹر نے اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ذکیہ گناہ کی اس تاریکی میں ڈوبتی چلی گئی اور بالآخر اس کے گناہ کا پھل سامنے آ گیا۔ ذکیہ کو اس لرزہ خیز حقیقت کا علم بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس نے اس مصیبت کا ذکر ماسٹر سے کیا تو اس نے کوئی توجہ نہ دی اور بے پروائی سے کہہ دیا کہ میں اس مصیبت سے جلد ہی تمہیں چھٹکارا دلا دوں گا۔ اس کے بعد ماسٹر نے ذکیہ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ ذکیہ اس صورت حال سے بہت پریشان اور فکر مند رہنے لگی۔ جب اس کا گناہ ظاہر ہونے لگا تو اس نے ماسٹر کو خدا اور رسولؐ کے واسطے دیئے کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے کسی طرح اس بدنامی اور ذلت سے بچاؤ۔ ماسٹر نے اس سے رات کو گاؤں سے باہر ملنے کا وعدہ کیا۔

وہ دونوں رات کو گاؤں سے باہر ایک کھنڈر میں ملے۔ ذکیہ نے رو رو کر اس سے اپنی مصیبت بیان کی۔ اس پر ماسٹر بولا۔ ”تم بہت بھولی ہو ذکیہ......! تم سمجھتی ہو تمہارا گناہ میں اپنے سر لے لوں گا اور اپنی عزت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا لوں گا۔ اپنا گناہ میرے سر کیوں تھوپتی ہو؟“ یہ سن کر ذکیہ طیش میں آ گئی اور اسے بے نقط سنائیں۔ رات کے سناٹے میں دونوں کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ ذکیہ پر جنون سوار تھا' اس نے غصے میں ماسٹر کی قمیص تار تار کر دی۔

جب ان میں تکرار ہو رہی تھی تو میرا شوہر عظمت یہ آوازیں سن کر وہاں آ گیا۔ اس نے ان دونوں کو پہچان لیا اور اچانک اس نشیب میں اتر آیا جہاں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش غیرت میں عظمت نے اس پر حملہ کر دیا۔

ماسٹر جسامت میں عظمت سے کہیں زیادہ تھا' اس نے عظمت کا گلا دبوچ لیا اور اس وقت تک دباتا رہا جب تک عظمت بے دم ہو کر ڈھے نہ گیا۔

پھر ان دونوں کو ہوش آیا' وہ دونوں بہت بری طرح گھبرا گئے۔ اب ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ بے گناہ کے خون سے داغ دار ہو گئے تھے۔ ذکیہ تو اس وقت خوف سے اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھی تھی۔ ماسٹر نے اس وقت اسے سمجھایا کہ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا' بس سب کچھ غیر متوقع طور پر ہو گیا تھا۔ اب ہمیں اس مصیبت سے نبٹنے کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔

وہ لوگ کافی دیر تک اس سے چھٹکارا پانے کے منصوبے بناتے رہے پھر انہوں نے اپنا جرم میرے سر تھوپنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ماسٹر اور ذکیہ جانتے تھے کہ میری اور عظمت کی ازدواجی زندگی اور میرا چلن کیا ہے' انہوں نے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مجھے مجرم ٹھہرانے کا مکمل منصوبہ تیار کیا۔ ماسٹر نے ذکیہ سے کہا کہ عظمت کی بیوی کے استعمال کی کوئی چیز یہاں لا کر ڈال دو تا کہ قتل کا شبہ فوراً اس پہ جائے۔ ذکیہ گھر آ کر وہی دوپٹہ لے گئی جو اس نے کافی عرصے پہلے میرے بکس سے چرایا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ دوپٹہ یوں کسی کے کام آئے گا۔ اس نے تو محض خوبصورت اور قیمتی سمجھ کر دوپٹہ چرا لیا تھا۔ اس نے اس دوپٹے کو عظمت کی لاش کے پاس ڈال دیا اور یہی اس کی بنیادی غلطی تھی۔

تھانے دار نے مجھے بتایا کہ میں جائے واردات پر وہ دوپٹہ دیکھ کر ہی کھٹک گیا تھا کیونکہ کوئی بھی شخص خواہ کتنا ہی جاہل اور بے وقوف کیوں نہ ہو ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا قاتل نے اپنا جرم کسی اور پر تھوپنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی عورت اگر کسی مرد کو قتل کر سکتی ہے تو وہ اتنی بے وقوف ہرگز نہیں ہو سکتی کہ جائے واردات پر دوپٹہ ہی بھول جائے۔ تھانے دار نے اسی لیے مجھے حراست میں نہیں لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر جائے واردات پر وہ دوپٹہ نہ ہوتا تو وہ مجھے ضرور گرفتار کر لیتا۔

ماسٹر کو اسی دن گرفتار کر لیا گیا اور میں ناکردہ گناہ کی زد میں آنے سے بچ گئی۔ تھانے دار کی ذہانت اور خدا کی مہربانی تھی جس نے مجھ گناہ گار کو قانون کے پھندے سے بچا لیا تھا۔

ذکیہ کے زہر کھانے پر اس کے خلاف الزام خودکشی کا کیس بنا تو اس نے عدالت میں بتایا کہ میں نے خود نہیں کھایا تھا بلکہ ماسٹر نے مجھے دوا کے طور پر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جرم کے احساس نے میری راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔ میں نے ماسٹر سے ذکر کیا تو اس نے نیند کی دوا کے طور پر زہر کی پڑیا مجھے تھما دی۔ زہر کی یہی پڑیا میرے لیے تریاق بن گئی تھی۔

میری جیٹھانی ذکیہ اس وقت تو بچ گئی لیکن بعد میں اس نے کنویں میں ڈوب کر جان دے دی...... اس بے چاری کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ شوہر نے بھی اسے طلاق دے دی تھی۔ والدین نے بھی دھتکار دیا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے موت کے دامن میں پناہ ڈھونڈی۔ اس کا انجام بہت عبرت ناک ہوا تھا۔

اصل مجرم پکڑے جانے کے بعد مجھے بڑی امید تھی کہ امجد آئے گا اور مجھے میری محبت' میری قربانی کا صلہ ضرور دے گا۔ میری زندگی کی ڈوبتی ناؤ کو اسی کا سہارا کنارے پر لا سکتا تھا۔ میری آنکھیں اس کے انتظار میں پتھرا گئیں لیکن وہ نہ آیا۔

چھ ماہ گزر گئے' جب وہ آیا تو اکیلا نہیں تھا' اس کے ہمراہ اس کی بیوی تھی۔ اس نے اپنی ماموں زاد سے شادی کر لی تھی۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو دل مسوس کر رہ گئی۔ اس روز میں جی بھر کے روئی تھی۔ میرے یہ آنسو پچھتاوے کے تھے۔

کاش...... کاش...... میں نہ بھٹکتی...... ایک بے وفا شخص کی خاطر' ایک لٹیرے کی خاطر...... کاش...... میں اپنے شوہر' اپنے سہاگ سے وفا کرتی تو میری زندگی یوں برباد نہ ہوتی۔ کتنی چاہتیں تھیں میرے پاس۔ میں نے ایک خود غرض کے لیے اپنی تمام خوشیاں تباہ کر دیں۔ آج میں اپنے دکھوں' اپنی محرومیوں اور پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہوں اور نہ جانے کب تک جلتی رہوں گی' نہ جانے کب تک......؟؟؟

......☆☆......

غزل

تم کوئی سوال مت کرنا
آنسوؤں کا خیال مت کرنا

یاد کر کے پچھلی یادوں کو
اپنا جینا محال مت کرنا

تیرے لفظوں سے کوئی زخمی ہو
ایسی قائم مثال مت کرنا

زندگی کا سفر کوئی بھی ہو
چاہتوں کو نڈھال مت کرنا

کچھ دنوں میں ہی لوٹ آنا تم
جا رہے ہو تو سال مت کرنا

رنج رانا جو پہنچے اس دل کو
ایسا کوئی سوال مت کرنا

قدیر رانا

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ سچ بیتی سنانے والے آپ کے اور ہمارے درمیان ہی موجود ہیں

نیلم الماس مغل

روپ بہروپ

ارتضاء وارثی کا خیال

کھوئی ہوئی سی چشمِ حقیقت نگر ہے آج
حُسنِ نظر بھی ایک فریبِ نظر ہے آج

اُس روپ کی رانی کا قصہ۔ جس نے بہروپ تو بھرا تھا مگر......!



پچھتاوا ناسور کی طرح ہوتا ہے جو کبھی بھی نہیں بھرتا ہمیشہ رستا رہتا ہے اور انسان کو دیمک زدہ لکڑی کی طرح چاٹ جاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر کام کو اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد کرنا چاہیے۔ ایسا فیصلہ ایسی بات یا ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو بعد میں پچھتاوے کا موجب بنے۔

میرا نام حماد علی رضوی ہے۔ میں ایم بی اے کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا ہوں۔ بظاہر تو میری زندگی بہت مطمئن اور بڑی شان سے رواں دواں ہے لیکن میرے اندر کا پچھتاوا مجھے مارے دیتا ہے۔ میں لمبے عرصے سے اس بوجھ کو اپنے سینے میں دبائے پھر رہا ہوں۔

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب مجھے اس فرم کو جوائن کیے ہوئے ڈھائی ماہ ہوئے تھے کہ مشعل نامی ایک لڑکی نے ہمارے آفس کو جوائن کیا۔ مشعل حد سے زیادہ حسین تھی اور دوستانہ مزاج کی لڑکی تھی۔ سادہ دل' پُرخلوص' سیدھی دل میں اتر جانے والی' اس کی لمبی لمبی سیاہ بھنورا آنکھوں اور دودھ جیسے سفید بے داغ چہرے کو جو کوئی ایک بار دیکھتا' دوبارہ دیکھنے کی چاہ ضرور کرتا۔

میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو میرے دل کے تار چھڑ گئے۔ مجھے لگا جیسے مجھے میرے خوابوں کو ملکہ مل گئی ہو۔ میرے خوابوں میں بھی ایسی ہی حسینہ کا گزر ہوتا تھا۔

وہ تھی ہی ایسی بلا کی پرکشش' حسن و معصومیت کا مکمل امتزاج' مجھے اس سے دوستی کرنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ وہ اپنی فرینک نیچر کی وجہ سے نا صرف میری بلکہ فرم کے دوسرے کولیگز کی بھی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ ہر قسم کے موضوعات پر ڈھیروں باتیں کرنا اس کی ہابی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ باقی کولیگز کے مقابلے میں مشعل کا جھکاؤ میری طرف زیادہ تھا۔ ایک تو میں اس سے عمر میں بھی کچھ خاص بڑا نہ تھا اور دوسرا مجھے باتیں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اگر یوں کہا جائے کہ میں باتوں کا ماہر یا لفظوں کا کھلاڑی ہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ خود کے بارے میں میرا کہنا یہ تھا کہ میں اپنی باتوں سے کسی کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اسی لیے میں پوری دلجمعی سے مشعل کو متاثر کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا اور جس میں مجھے کامیابی بھی حاصل ہو رہی تھی۔

وہ سردیوں کے شروع کے دن تھے' موسم کی طرح میرا موڈ بھی بہت فریش تھا۔ اُس روز میں آفس میں پہنچا تو دو تین کولیگز ہی آئے تھے۔ میری کیبن پر فائلز کا انبار سا پڑا ہوا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے طبیعت پر سستی سی چھائی رہی تھی جس کی وجہ سے میں اپنا کام مکمل جانفشانی سے کر ہی نہیں سکا تھا اور کل باس کی ڈانٹ سننے کے بعد مجھے کام کرنے کا خیال آیا تھا۔

باس نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔ ''اگر آپ کو اس جاب کی ضرورت ہے تو سیریس ہو جائیں' بصورتِ دیگر میرے پاس محنتی اور ٹیلنٹڈ لوگوں کی کمی نہیں ہے۔'' باس کے الفاظ مجھے تیر کی مانند لگے تھے۔ اگرچہ باس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ جائز تھا مگر اس کے باوجود میرا موڈ خراب ہو گیا تھا کیونکہ بے عزتی خواہ جائز ہو یا ناجائز' کسے اچھی لگتی ہے۔

میں خلافِ معمول اپنے کام میں مصروف تھا جبکہ مشعل خوب چہک رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی کام کم اور باتیں زیادہ کرنے کی عادی تھی اور آج تو اس کی چہکار کا جواب دینے کے لیے کاشف بھی موجود تھا۔ کاشف بھی اس ادارے میں میرے ساتھ ہی اپائنٹ ہوا تھا۔ وہ حد سے زیادہ باتونی اور شوخ طبیعت والا لڑکا تھا۔ اس کی کمپنی میں کوئی بور نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوسکتا تھا، پر میری اس سے نہیں بنتی تھی، مجھے وہ ایک نمبر کا لوفر لگتا تھا۔ میں اس قدر مصروف رہا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

لنچ ٹائم ہو رہا تھا، میں نے وقت دیکھا تو دو بجنے میں صرف چند منٹ ہی باقی تھے۔ بھوک کی وجہ سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں تمام ضروری فائلز کو کیبنٹ میں رکھ کر لاک لگانے لگا اور اس سے پہلے کہ میں مشعل کو رکنے کے لیے آواز دیتا، وہ امبرین اور کاشف کے ساتھ چلی گئی۔ میرے دل پہ جیسے بچھو نے ڈنک مارا، جب سے مشعل نے آفس جوائن کیا تھا، تب سے ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا ہم نے ساتھ لنچ نہ کیا ہو اور آج جب وہ میرے بغیر ہی لنچ کرنے چلی گئی تو میرے دل کو جیسے کچوکے سے لگے۔ میرے موڈ کا ستیاناس ہو گیا۔ بھوک کی وجہ سے میرے پیٹ میں ناچتے کودتے چوہے یکدم ہی ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے اور میں اپنے دونوں ہاتھ میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

پھر اکثر یونہی ہونے لگا، وہ میرے علاوہ دوسروں کے ساتھ بھی لنچ کرنے لگی تھی۔ میں روز بروز اپنے کام میں مصروف ہوتا گیا اور وہ مجھ سے دور ہوتی گئی۔ یہ میرا خیال تھا جبکہ اس کے مطابق تو وہ اب بھی مجھ سے پہلے کی طرح ہی ٹریٹ کرتی تھی۔ بقول مشعل کہ میرا شمار اب بھی اُس کے بیسٹ فرینڈز میں ہوتا تھا۔

خیر، یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر ایک دن جب وہ مجھے برتھ ڈے وِش کرنا بھول گئی تو میرا غصے کی وجہ سے برا حال ہو گیا اور میں نے اس سے بات ختم کر دی۔

وہ پورا ایک ہفتہ میری منتیں کرتی رہی، مجھ سے ناراضگی کی وجہ پوچھتی رہی، مجھے منانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی، تب کہیں میرا دل پسیج گیا اور جب میں نے اسے اپنی ناراضگی کی وجہ بتائی تو وہ کتنی ہی دیر تک مجھے حیران نظروں سے دیکھے گئی۔

”کیا تم واقعی اس وجہ سے مجھ سے ناراض تھے؟“ وہ گویا ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

”ہاں۔“ اس کی حیرانگی نے مجھے خجل سا کر دیا۔

”اوہ گاڈ! تو تم اس لیے اتنا ناراض تھے مجھ سے؟ یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی ناراض ہونے کی، تم جانتے ہو میری بھلکڑ طبیعت کو میں تو اکثر اپنا برتھ ڈے بھی بھول جاتی ہوں۔“ اپنی بات پہ وہ خود ہی مسکرائی۔

”اپنا برتھ ڈے تو اکثر لوگ بھول جاتے ہیں۔ لاسٹ ٹائم تو مجھے بھی یاد نہیں رہا تھا لیکن دوستوں کا برتھ ڈے یاد رکھنا چاہیے، نہ صرف یاد رکھنا چاہیے بلکہ انہیں وِش بھی کرنا چاہیے۔“

”او کے، فائن اینڈ سوری، اب ایسا نہیں ہوگا۔ آئندہ سے نا صرف میں تمہارا برتھ ڈے یاد رکھوں گی بلکہ سب سے پہلے وِش بھی کروں گی۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”او کے۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔

”اب تو ناراض نہیں ہو ناں؟“

”نہیں۔“

”اچھا، کافی منگوالوں میں؟“

”ہاں، منگوالو۔“ میں نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر دی۔

مشعل کو کاشف کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا دیکھ کر میرے دل میں جو لاوا پکتا تھا، میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا۔ جیلیسی، حسد، نفرت یا شاید کچھ اور......!

میں ظاہری طور پر مطمئن نظر آنے کی کوشش کرتا، کوئی بات بری لگتی تو تب بھی خاموش رہتا یا مسکرانے کی کوشش کرتا اور حتی الامکان اس میں

کامیاب بھی رہتا لیکن میرے دل کی حالت یکسر مختلف تھی۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ میرے اکلوتے ہونے کی وجہ سے میرے ماں باپ نے اپنی تمام تر شفقت و محبت مجھ پر نچھاور کر دی تھی۔ ان کی خوشیوں و امیدوں کا مرکز صرف میری ہی ذات تھی۔ امی کو دن رات میری شادی کی فکر ستائے رکھتی، آئے دن وہ میرے سامنے لڑکیوں کی تصویریں رکھ دیتیں اور میں ہمیشہ کنی کترا جاتا لیکن کب تک میں انہیں ٹالتا، آخر وہ ماں تھیں، اُن کے بھی ارمان تھے، انہوں نے میری شادی کے حوالے سے کتنے ہی خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ میں کب تک ان کے ارمانوں کا خون کرتا، دوسرے مشعل کے علاوہ کسی اور کا تصور کرنا بھی میرے لیے محال تھا اس لیے میں نے اس سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا، چاہے وہ کچھ بھی کہے، مجھے اس سے بات کرنی تھی۔

اُس دن موسم بہت خوشگوار تھا، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے جب جسم سے ٹکراتے تو سردی کی لہر پورے وجود میں سرایت کر جاتی۔ اتنے اچھے موسم میں میرا موڈ بھی خوشگوار تھا۔ مجھے آج مشعل سے بات کرنی تھی لیکن اندر ہی اندر کوئی احساس مجھے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ شاید ٹھکرائے جانے کا خوف تھا۔

میں فطرتاً اپنی ذات کے حوالے سے خاصا حساس واقع ہوا تھا۔ مجھے اپنی ذات کی نفی کسی صورت بھی گوارہ نہ تھی تو پھر میں ٹھکرائے جانے کے احساس کو کیسے سہہ پاتا؟

مشعل بہت حسین تھی، پڑھی لکھی تھی، اسے بھلا رشتوں کی کیا کمی تھی لیکن میں نے بھی ہمت کر کے موقع دیکھ کر اس سے اپنے دل کی بات کر ہی لی۔ میرے پروپوز کرنے پر ہمیشہ کی طرح وہ پہلے تو حیران ہوئی پھر شرما کر اپنی نظریں جھکا گئی۔ یہ اس کی رضامندی کا مشرقی قسم کا اظہار تھا۔ سدا کی بولڈ اور ماڈرن لڑکی کا یہ روپ میرے دل پہ جیسے نقش ہو کر رہ گیا۔ بعد کے مراحل بہت تیزی سے انجام پائے۔ اماں میری خوشی میں خوش تھیں اور میں اپنی خوش قسمتی پہ نازاں۔ جب میں نے اس کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تو خوشی کے مارے میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔

ہماری فرم میں لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں اور لڑکے بھی لیکن مشعل کی لڑکیوں کے بجائے لڑکوں سے زیادہ بنتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فرم کی تمام لڑکیاں اس سے جلتی ہیں اور دوسروں سے جلنے والے اسے زہر لگتے ہیں۔

وقت بہت اچھا گزر رہا تھا، پر لگا کر اڑتے وقت میں ٹھہراؤ اُس وقت آیا جب حالات نے تیزی سے پینترا بدلنا شروع کیا۔ کچھ دنوں سے مجھے لگ رہا تھا، مشعل کچھ بدل رہی ہے، کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ! پہلے بھی وہ نان اسٹاپ بولتی تھی لیکن اب تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ پہلے جو باتیں مجھے نظر نہ آئی تھیں، اب وہ بالکل واضح ہو کر جیسے سامنے آ گئی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال سوئی کی نوک کی طرح چبھتا تھا کہ مشعل، کاشف کی کمپنی کو اتنا انجوائے کیوں کرتی ہے؟ میں نے اسے آفس میں کبھی بھی کسی لڑکی کے ساتھ ہنس کر بات کرتے نہیں دیکھا جبکہ کاشف کی باتوں پر اس کے قہقہے تھمنے میں ہی نہ آتے۔ پہلے مجھے مشعل کی ہنسی بہت خوب صورت لگتی تھی، جھیل کے جھرنوں کی طرح شفاف...... اور اب جب وہ کاشف یا کسی اور کی بات پر قہقہہ لگاتی تو مجھے اس کی ہنسی میں بے حیائی یا بے باکی سی نظر آتی تھی۔ میں اسے ہر اس بات پر ٹوکنے لگا جو مجھے ناپسند ہوتی۔ کبھی کبھی وہ میری بات

WWW.PAKSOCIETY.COM

مان جاتی اور کبھی بہت بری طرح جھنجلا جاتی تھی۔
ہمارے درمیان اب ذرا ذرا سی بات پہ نوک جھونک ہونے لگی تھی۔ انہی دنوں ہمارے آفس میں ایک نئی لڑکی جمیلہ کا اپائنٹمنٹ ہوا۔ وہ قدرے مختلف لڑکی تھی۔ ہروقت سر کے بالوں کو اسکارف سے ڈھانپے رکھتی، میک اپ سے عاری چہرہ جس پر ہمہ وقت گہری سنجیدگی رہتی تھی۔ میں نے اسے کبھی کسی بات پہ مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ہی پراسرار لگنے لگتی تھی۔
شاید یہ اس کی سادہ شخصیت کا اثر تھا یا میری باتوں کا اثر کہ آہستہ آہستہ مشعل خود کو میری پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے کہنے پر وہ حجاب لینے لگی۔ میک اپ بھی کافی لائٹ کرنے لگی لیکن جہاں بات آئی اس کے منہ پھاڑ کر ہنسنے کی اور کاشف سے دوستی کی تو اس معاملے میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے براہ راست کبھی بھی کاشف سے بات کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ اگر کرتا تو شاید وہ میری یہ بات بھی مان جاتی۔ مشعل بہت ہی سادہ مزاج کی لڑکی تھی اور مجھے اس کی اس قدر سادگی سے ڈر لگتا تھا۔ ہر کسی کے ساتھ مخلص اور ہمدرد، مجھے اس کا ہر کسی سے خصوصاً کاشف سے بات کرنا بہت ہی برا لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ میری اس سے ناراضگی ضرورت سے زیادہ رہنے لگی تھی۔ ایک ہی آفس میں کام کرنے کے باوجود ہفتوں گزر جاتے مجھے اس سے بات کیے ہوئے، پر اس نے بھی نہ تو کبھی مجھ سے اس بے رخی کا شکوہ کیا اور نہ ہی مجھے کبھی منانے کی کوشش کی۔ اس کی یہی بے نیازی مجھے کھولائے رکھتی تھی۔
پھر نجانے کب میرے رویئے میں یہ تبدیلی آئی کہ میں مشعل کو جمیلہ سے کمپیئر کرنے لگا۔ وہ بھی خوب صورت تھی، پڑھی لکھی تھی، گفتگو کا نہایت شائستہ، سلجھا ہوا محتاط انداز اور اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ نہ کسی سے فضول بات، نہ ہنسی مذاق اور ایک مشعل تھی جس کی بے مہار زبان اور بے باک ہنسی کو کنٹرول کرنا میرے اختیار میں نہ تھا یا شاید ایسا کرنا اس کے اپنے اختیار میں بھی نہ تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی، اس کی جن باتوں نے مجھے اس کی طرف مائل کیا تھا، آج انہی نے شاکی کر دیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس سے بے زاری سی ہونے لگی، نجانے کیوں؟
شاید اس وجہ سے کہ وہ پہلے میری صرف گرل فرینڈ تھی اور اب فیوچر وائف۔ مرد کو جو باتیں اپنی گرل فرینڈ میں اچھی لگتی ہیں، وہی اُس کی وائف میں ہوں تو زہر لگتی ہیں۔ ماڈرن، بولڈ، فیشن ایبل لڑکی کو گرل فرینڈ تو بنایا جا سکتا ہے، پر بیوی نہیں، بس یہیں پر مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں بھی مردوں کی اُس قسم میں سے تھا جو جمیلہ مظاہر جیسی بے زبان اور سیدھی سادی عورتوں کو اپنا شریکِ سفر بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں جن کے منہ میں نہ تو زبان ہوتی ہے اور نہ ہی احتجاج کرنے کی صلاحیت۔
میری شادی میں دو ماہ رہ گئے تھے مگر اب مجھے ایسا لگنے لگا جیسے جلد بازی میں مجھ سے کوئی غلط فیصلہ ہو گیا ہے جس پر مجھے کچھ کچھ پچھتاوا سا ہونے لگا تھا۔ میں جب بھی جمیلہ مظاہر کو دیکھتا تو یہ پچھتاوا سوا ہو جاتا۔ اب مجھے مشعل کا آفس میں جاب کرنا بھی سخت برا لگتا تھا۔ اسے میں نے جاب چھوڑنے کا کہا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اسی بات کو لے کر میں نے اس کی امی کو فون کر دیا۔ میری بات سن کر وہ کچھ دیر کے لیے تو سن رہ گئیں۔
"حماد بیٹا......! تم فکر نہ کرو، میں سمجھاؤں گی مشعل کو، وہ ضرور میری بات سمجھ جائے گی۔"
"ٹھیک ہے آنٹی! آپ اُسے اچھی طرح سے سمجھا دیجیے گا۔ مجھے لڑکیوں کا فضول میں گھر سے باہر

مارا مارا پھرنا سخت ناپسند ہے۔"
پھر آنٹی نے بھی اُسے سمجھایا مگر وہ جاب کرنے پر بضد رہی۔ نوکری چھوڑنے پر وہ بالکل تیار نہ تھی، اس کا کہنا تھا کہ میں نے اتنی تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی کہ اُسے گھر بیٹھ کر ضائع کر دوں۔ میرے لیے مسئلہ اس کے جاب کا نہیں تھا، ان لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا تھا جو مجھے سخت ناپسند تھے۔ اب عالم یہ تھا، وہ مجھ سے خفا تھی اور میں اُس سے۔ نہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی میں اُس سے۔ پورا اسٹاف حیران تھا کہ آخر ہم دونوں کو ہوا کیا ہے؟ آفس میں کسی کے سامنے ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اس لیے سب ہی ہمارے جھگڑے سے لاعلم تھے۔
پچھلے کچھ دنوں سے مجھے ایک عجیب سا احساس ہونے لگا تھا، جب بھی میرا جمیلہ مظاہر سے سامنا ہوتا یا وہ میرے پاس کسی کام کے سلسلے میں آتی تو اُس کی نظریں میرے چہرے پر ہی جمی ہوتیں اور میں جب اس کی طرف دیکھتا تو وہ جھٹ سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیتی۔ یہ ایک عجیب، انوکھا اور پرلطف سا احساس تھا جسے محسوس کر کے میرے رگ وپے میں ایک سرور کی سی کیفیت چھا جاتی تھی لیکن جب مجھے اپنی فیوچر وائف کا خیال آتا تو ساری خوشی اڑن چھو ہو جاتی۔ میں اپنی اس رنگ بدلتی فطرت سے خود ہی حیران رہ گیا، کہاں تو میں اُس کے لیے مرا جا رہا تھا اور اب کہاں وہ مجھے حلق میں پھنسی ہوئی اس ہڈی کی مانند لگ رہی تھی جسے نہ تو میں نگل سکتا تھا اور نہ ہی اگل سکتا تھا۔
اُس روز میں اپنے کیبن میں بیٹھا تھا کہ کاشف بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔
"حماد......! ایک بات پوچھوں تم سے؟"
"ہاں پوچھو۔" میں نے اپنی فائل پر جھکے ہوئے کہا۔
"یہ تم، مشعل سے ناراض کیوں ہو؟ دیکھو، جاب نہ کرنا اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے جس کو اتنا سنگین بنا لیا جائے؟"
"کیا مطلب؟" میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔
"مطلب یہ کہ اگر مشعل جاب کرنا چاہتی ہے تو اسے کرنے دو۔ تمہیں کیا پرابلم ہے؟ یہ تو اس کا ذاتی مسئلہ ہے ناں کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتی ہے یا کیا نہیں؟ جاب کرنے کا اسے جنون ہے اور تم ایویں ہی اسے پریشان کر رہے ہو؟"
"تمہیں کس نے بتایا ہے یہ سب؟" میں نے کمالِ ضبط کا مظاہرہ کیا۔ مجھے حیرت تھی، جو بات آفس میں کسی کو معلوم نہیں تھی، وہ اُسے کیسے پتا چلی؟
"ظاہری بات ہے، مشعل نے بتائی ہے مجھے بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے اس کی۔ وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتی ہے۔ اسی نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں سمجھاؤں۔"
"مشعل......! ادھر آؤ۔" میں نے تقریباً چلاتے ہوئے اُسے پکارا تھا۔ پہلے تو وہ میرے اس طرح کے انداز پر حیران ہوئی پھر آہستگی سے چلتی ہوئی ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔
"جی، کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے؟" وہ خفا سے انداز میں بولی۔
"کیا کہا ہے تم نے کاشف سے؟"
"کچھ بھی غلط نہیں کہا جو بات ہے، وہی بتائی ہے اور دیکھو، یہ تو میری بات سمجھ گیا ہے، پر پتا نہیں، تم کیوں نہیں سمجھ رہے؟" اس نے شکایتی انداز میں کہا اور میں چاہ کر بھی اُسے یہ نہیں کہہ سکا کہ تمہارا

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاب کرنا مجھے کبھی بھی برا نہیں لگا' برا تو اس سے بات کرنا لگتا ہے۔ آفس ٹائم آف ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی ضروری فائلز لاکڈ کیں۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا اور کہنا چاہتا بھی تھا لیکن اس کے باوجود ایک لفظ بھی کہے بنا اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔

اگلے چند دنوں تک میں اُس سے ناراض رہا پھر اُس دن کے بعد کاشف نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

پھر ایک دن تو جیسے انہونی ہوگئی' مشعل نے ریزائن کر دیا۔ پورا اسٹاف حیران تھا اُس کے اچانک فیصلے سے۔ ایک لحہ کو تو میں بھی چکرا گیا تھا۔ اُس نے میری بات مان لی تھی۔ اصولاً تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا پھر بھی پتا نہیں' کیوں؟ ایک نامعلوم سی اداسی میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔

مشعل کی سیٹ پر اب جمیلہ مظاہر بیٹھ گئی تھی جو عین میرے سامنے تھی۔ میں نے بغور اُس کا چہرہ دیکھا جو ہمیشہ کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی بھی بات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میری شادی محض چند دنوں بعد تھی۔ اگر وہ مجھے پسند کرتی تھی تو اُسے غمگین یا پریشان نہیں تو تھوڑا اداس تو ضرور ہونا چاہیے تھا۔

'ہوسکتا ہے' مجھے غلط فہمی ہوگئی ہو یا میرا وہم ہو کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ جمیلہ مظاہر تو بہت شریف اور باکردار لڑکی ہے۔' میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا جب اس نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے میں بھی بری طرح چونک گیا۔ اپنی چوری پکڑے جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی آنکھوں سے۔ اس کا چہرہ ضرور بے تاثر تھا' پر اس کی آنکھیں بے تاثر نہیں تھیں۔ کچھ تھا اس کی آنکھوں میں جو مجھ پر اس کے اندر کے بہت سے راز منکشف کر رہا تھا۔ یکا یک اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور میں بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ چھٹی والے روز میرا اشیڈول ہفتے کے باقی دنوں سے مختلف ہوتا تھا۔ میں ہفتے کو لیٹ نائٹ موویز دیکھا کرتا تھا اور اتوار کو دن چڑھے تک سوتا رہتا تھا۔ وہ دن بھی معمول کی طرح خوب صورت تھا۔ میں اُس وقت سو رہا تھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک بار' دو بار' تین بار' میں نے سوچا امی ہوں گی اور پھر سے کروٹ بدل کر سو گیا مگر دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ امی نے ویسے تو مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کیا تھا' آج کیا مصیبت آ گئی ہے؟ میں نے غصے سے کمبل پرے پٹخا۔ دروازے پر لگاتار دستک ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پاؤں میں چپل پہنی۔

''آ رہا ہوں۔''

''کیا قسطوں میں آ رہے ہو دروازہ کھولنے؟''

میری بات کے جواب میں جو آواز گونجی' وہ یقیناً امی کی نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے میرا دوست سعد کھڑا تھا' اسے دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔

''کیا ٹرین چھوٹ رہی تھی تمہاری؟'' میں اُس سے بغلگیر ہوتے ہوئے بولا۔

''ہاں' یہی سمجھ لو اور تم کیا شریف عورتوں کی طرح گھر میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے ہو؟ کم از کم اپنی شکل ہی دکھا دیا کرو۔''

وہ دن میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ بھرپور طریقے سے گزارا۔ رات تقریباً گیارہ بجے کے قریب جب میں اپنے گھر واپس آنے لگا تو دوستوں نے مجھے روک لیا۔

''چل یار' آج ایک جگہ تمہیں لے کے چلیں۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ادھر پاس ہی ایک ڈانس کلب ہے' وہاں......''

''ارے نہیں یار' میں ایسی جگہوں پہ نہیں جاتا۔'' میں نے اپنی جان چھڑائی۔

''جانتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' سعد نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں قدرے چونک سا گیا۔

''یار' میری ایک فرینڈ ہے پنکی' وہ اس کلب میں ڈانسر ہے بلکہ بہت مشہور ڈانسر ہے' کیا کمال کا ناچتی ہے وہ' اس کے سامنے تو مادھوری ڈکشٹ اور ایشوریہ رائے بھی پانی بھرتی نظر آئیں......''

''تو میں کیا کروں؟'' رضا کو اس لڑکی کی قصیدہ خوانی کرتے دیکھ کر میں بےزارگی سے بولا۔

''کرنا کیا ہے یار' ان لوگوں کو اس سے ملوانے لے جا رہا ہوں' ساتھ تم بھی چلو۔''

''نہیں یار' مجھے نہ تو شوق ہے اور نہ ہی ضرورت۔'' میرے رکھائی سے بولنے پر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

پھر رضا نے اپنی فرینڈ پنکی کے بارے میں وہ گل افشانیاں کیں کہ جنہیں سننے کے بعد میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس دنیا میں عورتوں کی کتنی اقسام ہیں۔ ایک وہ ہے جمیلہ مظاہر' عورت کا پاکیزہ' دلکش روپ جسے دیکھنے کے بعد عورت کی عزت کرنے کا دل چاہتا ہے۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ ''تم واقعی نہیں چل رہے؟'' مجھے اپنی سیٹ پر جما دیکھ کر وہ تینوں ایک ساتھ بولے۔

''نہیں' میں گاڑی میں ہی بیٹھوں گا' تم لوگ جاؤ اور جلدی آ جانا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''او کے!'' اُن لوگوں نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اُس لڑکی کو دیئے ہوئے ٹائم کے مطابق تینوں آل ریڈی لیٹ ہو چکے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں نے سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکا لیا۔

پتا نہیں' میں مشعل کے ساتھ نباہ کر سکوں گا یا نہیں؟ اگر کرنا چاہوں بھی تو کیسے؟ میں جب بھی اکیلا ہوتا تھا' سوچیں مجھے گھیر لیتی تھیں اور مجھے اکیلا ہی نہ ہونے دیتیں۔ اُس وقت تو مجھے اُس کی صرف برائیاں ہی نظر آ رہی تھیں' خوبیاں تو جیسے کہیں کھو گئی تھیں۔

بہت سے لمحے یونہی خاموشی اور تنہائی کی نذر ہو گئے پھر دور کہیں سے آتی آوازیں سنائیں دیں کسی کی ہنسی کی' کسی کی ہیل کی ٹک ٹک کی' کسی کی باتوں کی' کسی کے قہقہوں کی' آہستہ آہستہ یہ آوازیں میرے قریب آتی گئیں' نزدیک اور نزدیک پھر سے دور......

''ٹھک......ٹھک......'' کی آواز پر میں چونکا۔ میں نے جھٹ سے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا' کوئی میری گاڑی کے شیشے پر ناک کر رہا تھا۔ میں ڈور کھول کر نیچے اتر آیا۔ وہ میرا دوست سعد تھا جو ابھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی آیا تھا۔

''یار' گاڑی باہر روڈ پر لے آؤ' ہم بھی وہیں ہیں۔'' اپنی بات کہہ کر وہ جن کی طرح غائب ہو گیا۔

میں نے بھی شکر کا سانس لیا کیونکہ مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی روڈ پہ ڈال دی۔ سامنے ہی وہ لوگ مجھے کھڑے نظر آئے۔ میں نے گاڑی اُن کے پاس لے جا کر روک دی۔

''آ جاؤ ناں اب۔'' میں نے اشارے سے اُن لوگوں کو بلایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''تم آؤ ناں۔'' بجائے خود آنے کے' الٹا رضا مجھے ہی بلانے لگا۔ میں نے سنی اَن سنی کر دی۔

''ایک منٹ کے لیے آ جاؤ یار!'' کچھ توقف کے بعد سعد میرے پاس چلا آیا۔ ''کیا کہے گی وہ کہ کتنے بداخلاق ہو تم؟'' میں نے گھور کر سعد کو دیکھا اور پھر اُن موصوفہ کو دیکھا جن کی پشت میری طرف تھی۔

''کیا اس لڑکی کو پتا ہے کہ مینرز کسے کہتے ہیں؟''

''بکومت اور چلو۔'' اس نے خود ہی فرنٹ ڈور کھول دیا۔

''اچھا چلو۔'' میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

''شکر ہے' تم نے اپنی قسم تو توڑی۔'' مجھے دیکھتے ہی عذیر نے شوخی سے کہا۔

''یہ ہمارا سب سے شرمیلا اور ضرورت سے زیادہ ہی شریف دوست ہے۔'' سعد کی بات پر اُن چاروں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ میں نے تیز نظروں سے سعد کو دیکھا۔

''اس نے تو کچھ کہنا ہے نہیں' تم ہی حال احوال پوچھ لو اس بے چارے کا۔'' عذیر کی شوخی عروج پر تھی۔

سعد کے کہنے پر ان موصوفہ نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ کھولے جو سیٹی کے انداز میں ہی کھلے رہ گئے اور میں بھی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا' ساتوں آسمان سر پہ گرنا اور زمین پیروں کے نیچے سے کھسک جانا کسے کہتے ہیں' یہ بات اُس وقت مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ ہمیشہ سے اسکارف میں لپٹے رہنے والے لمبے سیاہ' گھنے بال اُس وقت اسٹرائیکنگ کٹنگ کی صورت میں اس کے شانوں اور پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہمیشہ میک اپ سے عاری رہنے والا چہرہ اس وقت میک اپ میں لتھڑا ہوا تھا۔ ہمیشہ حجاب کی شکل میں خود کو مقید رکھنے والی کو اس وقت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس نام سے بھی آشنائی نہیں رکھتی۔ تنگ فٹنگ والی قمیص' ٹخنوں سے اونچا پاجامہ' دوپٹے سے بے نیاز' وہ اس جمیلہ مظاہر کی ضد تھی جسے میں جانتا تھا یا شاید یوں کہنا چاہیے کہ جمیلہ مظاہر کا یہ روپ اس بہروپ سے بالکل مختلف تھا جو میں نے دیکھ رکھا تھا۔ میں نے اسے اپنے دل میں جو مقام دے رکھا تھا' وہ ایک چھناکے سے پاش پاش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش میں اپنے لب کھولے جو محض پھڑ پھڑا کر ساکت ہو گئے۔ میں نے ایک نظر اس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھا اور پھر بمشکل تمام اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے۔ ''کتاب کو پڑھے بغیر اس کے بارے میں کوئی بھی رائے دینا سراسر بے وقوفی ہے۔''

جس طرح کوئی انسان کتاب کو پڑھے بغیر اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا' ٹھیک اسی طرح انسان بھی ہوتے ہیں جن کو سمجھے بغیر' پرکھے بغیر' جانے بغیر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی' ان پہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ایسا کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کی اچھائی یا برائی کو پرکھا جا سکے۔

واپسی تو ہر انسان کی ہوتی ہے' میری بھی ہوئی تھی اور ہوئی ہے اپنی منگیتر کی طرف' اپنی زندگی کی طرف' میری منگیتر جسے میں نے پہلی نظر میں پسند کیا تھا۔ وہ جو بھی تھی' جیسی بھی تھی' میرے سامنے تھی۔ اس نے خود کو کسی بہروپ میں پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھی۔

......☆☆......

نازیہ بتول رضا

جانا تو ہوتا ہے

طلعت اخلاق احمد کا خیال

سارے رستے بھول گئی
لوٹ کے کیسے گھر جاؤں

ایک ایسی مظلوم لڑکی کا قصۂ غم، سسرال جس کے لیے جہنم بن گیا تھا



WWW.PAKSOCIETY.COM

ہر لڑکی کی زندگی میں ایک دن ایسا آتا ہے جب اُسے پیا گھر جانا ہوتا ہے۔ اُسے سجایا سنوارا جاتا ہے' اُس کے گھر والے مل کر اچھے سے اچھا انتظام کرتے ہیں کہ کوئی کمی نہ رہ جائے' جہیز کے معاملے میں چھوٹی سے چھوٹی چیز کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی چیز کی کمی سے ہماری بیٹی کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے' الغرض والدین' بیٹی کی خوشیوں کے لیے اپنی بساط و حیثیت کے مطابق ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی وہ دن آیا جب مجھے پیا گھر جانا تھا' ایک نیا گھر بسانا تھا۔ میرے والدین نے بھی میری شادی کی بڑھ چڑھ کر تیاریاں کیں' کوئی کمی نہیں چھوڑی لیکن میری قسمت' وہ میری قسمت کی کمی کو تو دور نہیں کر سکتے تھے۔

میری شادی جس گھر میں ہو رہی تھی' وہ بھرا پرا گھرانہ تھا۔ میرے جیٹھ جیٹھانی بھی تھے اور دیور اور نندیں بھی۔ میرے شوہر سے سب بڑے تھے سوائے ایک بھائی کے۔

خیر' میں بہت دھوم دھام سے پیا گھر سدھاری۔ گھر میں سب ہی اچھے تھے لیکن ساس سسر کے ہوتے ہوئے بھی گھر میں جیٹھ اور نندوں کی حکمرانی تھی۔ گھر میں ہر کام جیٹھ اور نندوں کی مرضی سے ہی ہوتا تھا جس پر فی الحال مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ بہرحال وہ سب مجھ سے بڑے تھے اور میں اُن سب کی دل سے عزت کرتی تھی' ویسے بھی میں بچپن ہی سے خاصی ڈرپوک اور دبو قسم کی تھی' ہر بڑے کی بات ماننا اور عزت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی لیکن کبھی کبھی عجیب بھی لگتا تھا کہ شادی شدہ نندیں ہمارے مسئلوں میں ٹانگ اڑاتی تھیں' ہر بات میں اپنا فیصلہ صادر کرتی تھیں لیکن میں یہ سوچ کر سر جھٹک دیتی تھی کہ ہلکی پھلکی نوک جھونک تو ہر گھر میں ہوتی ہے اور پھر مجھ سے تو براہِ راست کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا کیونکہ میں کسی کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیتی تھی'

ہر کام وقت سے پہلے کرنے کی تو میری عادت تھی' سارا دن گھر کے کاموں میں چکر گھنی بنی رہتی۔ (یہ فیصلہ بھی میری نندوں کا تھا کہ گھر کا سارا کام میں ہی کروں گی۔) ہر ایک کی خدمت کرتی' اپنے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائے میں اپنی زندگی میں مگن تھی اس لیے سب مجھ سے خوش تھے۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا' میرے شوہر مسعود ایک سیدھے سادے اور اچھے انسان تھے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی بلکہ میری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کا ساتھ پا کر کوئی بھی عورت فخر کر سکتی تھی تو پھر میں کیوں نہ کرتی؟ کیوں رب کی ناشکری بنتی؟ کیا ہوا اگر مجھے گھر کے تمام کام کرنا پڑتے تھے' کیا ہوا جو مجھے ہر ایک کی بات سننا پڑتی تھی' میں اپنے شوہر کی خاطر ہر دکھ' ہر تکلیف سہتی تھی' دن بھر کی تھکن کے بعد جب رات میں اپنے شوہر کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھتی اور اُن کی محبتیں دیکھتی تو میری دن بھر کی تھکن اتر جاتی اور میں پھر سے دوسرے دن کے صبر آزما حالات کے لیے تیار ہو جاتی۔ زندگی یونہی گزرتی رہی اور قدرت نے میری جھولی میں تین پھول ڈال دیئے تھے' سب سے بڑا ایان پھر بیٹی ایمان اور پھر سب سے چھوٹا اور چہیتا شایان جو گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھا۔

بچوں اور اپنے شوہر کے پیار میں مگن میری زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی۔ پتا ہی نہیں چلا اور بارہ سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران میرے پیارے ابو اور میرے ساس' سسر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ساس' سسر کے گزر جانے کے بعد اب میں اپنے جیٹھ جیٹھانی کو ساس' سسر کا درجہ دیتی تھی۔ عزت تو اُن کی پہلے بھی کرتی تھی' اب اور زیادہ احترام بڑھ گیا تھا۔

میرے جیٹھ تو مجھے بیٹی کہتے نہ تھکتے تھے۔ ''بیٹی! آسیہ یہ کام کر دو''

''بیٹی! ذرا میرے کپڑے استری کر دو۔'' اور میں بھاگ بھاگ کر اُن کے تمام کام نمٹا دیتی۔ زندگی کے سفر میں اچانک تقدیر نے پلٹا کھایا اور میری ہنستی کھیلتی زندگی دکھوں میں تبدیل ہو گئی۔

اُس روز میں معمول کے کاموں میں مصروف تھی' شوہر آفس اور بچے اسکول جا چکے تھے کہ ایک فون آیا جس کے ذریعے یہ اندوہناک خبر ملی کہ میرے شوہر ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ میرے تو ہوش اڑ گئے' میرے چاروں طرف جیسے اندھیرا چھا گیا' مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور میں غم کی شدت سے نڈھال بے ہوش ہو گئی۔

شوہر کا جنازہ کب اٹھا' کب تدفین ہوئی' مجھے کچھ خبر نہ تھی' مجھے تو اپنا ہوش نہ تھا۔ بچے کس حال میں تھے' میں نہیں جانتی تھی۔ رو رو کر میرے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

خدا جب غم دیتا ہے تو اُسے سہنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی صبر آ گیا' میں بچوں میں مگن ہو کر دوبارہ جینے لگی لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ ابھی میرا امتحان ختم نہیں ہوا تھا' ابھی میری تقدیر کے ترکش میں مجھ پر برسانے کے لیے اور بھی تیر باقی تھے۔

شوہر کے چہلم کے اگلے روز میں اداس و ملول سی اپنے کمرے میں بیٹھی سب سے چھوٹے بیٹے کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی جو اپنے پاپا سے بہت انسیت رکھتا تھا اور اب ہر دم اُن کو یاد کرتا رہتا تھا کہ میری بڑی نند کمرے میں داخل ہوئیں اور بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی پہلو بدلتی رہیں۔ میں کن انکھیوں سے اُن کا مشاہدہ کر رہی تھی' وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھیں لیکن ہچکچا رہی تھیں۔ اُن کا تذبذب دیکھ کر میں اندر ہی اندر ہول رہی تھی۔

نہ جانے وہ کیا کہنے والی ہیں؟ کہیں مجھے گھر سے جانے کا تو نہیں کہیں گی یا پھر میری دوسری شادی!!

نہیں' نہیں' بھلا وہ میری دوسری شادی کیوں کروانے لگیں' میں الجھن میں خود سے سوال جواب کر رہی تھی' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میری نند بول اٹھیں۔

''دراصل میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔ اگر تم میری بات مان لو گی تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ پھر......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے تکنے لگیں۔ اُن کی نگاہوں میں اُس وقت ایسی سختی اور سفاکی تھی کہ میں پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔

''باجی......! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں' میں کچھ سمجھی نہیں؟'' میں الجھتے ہوئے بولی۔

''میں چاہتی ہوں بلکہ ہم سب چاہتے ہیں کہ......'' وہ ذرا رک کر مجھے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔ ''کہ تم دوسری شادی کر لو۔''

''کیا......! باجی......! آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں' میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' وہ لفظ چباتے ہوئے بولیں۔ ''اور اب تم بھی یہ بات اچھی طرح جان لو کہ عدت کے بعد تمہیں دوسری شادی کرنی ہے۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے کافی وقت ہے۔ میں نے اسی لیے ابھی سے یہ بات تمہارے کان میں ڈال دی ہے تاکہ تم اس عرصے میں خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو اور ہاں' یاد رہے' تمہارا فیصلہ شادی کے حق میں ہونا چاہیے ورنہ......'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولیں۔

''ورنہ......ورنہ......کیا باجی؟ اگر میں انکار کر دوں تو؟'' میں سختی سے بولی۔ اُن کے لہجے اور باتوں کو سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ مجھے اُن لوگوں سے یہ توقع نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اپنی بھابھی کے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟ میں اُن کے بھائی کی بیوی تھی' اُن کے گھر کی عزت تھی پھر......پھر وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی تھیں؟ اُن

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ارادے کیا تھے؟ یا اس میں اُن کا کیا فائدہ تھا؟ میرے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔

"ورنہ تم مامتا کے سکون سے محروم کردی جاؤ گی۔ ہم تمہیں اس گھر سے نکال کر بچے اپنے پاس رکھ لیں گے......" وہ نہایت سفاکی سے بولیں۔ میں اندر تک لرز کر رہ گئی۔ اُن کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ارادے میں بہت مضبوط تھیں۔ وہ جو کہہ رہی تھیں' کر گزریں گی۔

مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگا اور میں کپکپاتے لہجے میں بولی۔ "باجی! آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟ آپ بھی تو ایک عورت ہیں' ایک ماں ہیں' اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں' کیا آپ اپنے بچوں کے بغیر رہ سکتی ہیں؟"

میرے اس جذباتی سوال پر وہ لمحہ بھر کو ٹپٹا گئیں پھر سنبھلتے ہوئے بولیں۔ "تم مجھے خوامخواہ کی جذباتی باتوں میں مت الجھاؤ۔" پھر قدرے نرم انداز میں کہا۔ "دیکھو آسیہ......! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو' میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں اور پھر میں تمہیں اس گھر سے دور تو نہیں بھیج رہی ہوں' میں تو چاہتی ہوں کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہے۔"

"مطلب؟" میرا ماتھا ٹھنکا۔ "گھر میں کون مجھ سے شادی کرے گا؟"

"ادریس بھائی......!" انہوں نے میرے سسر جیسے جیٹھ کا نام لیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔

"باجی......! آپ ہوش میں تو ہیں؟ میں ادریس بھائی کو ابو (سسر) کی جگہ دیتی ہوں اور وہ بھی مجھے بیٹی کہتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں' اس بات سے انہیں کتنی تکلیف ہوگی؟"

"زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے' اس میں ادریس بھائی کی بھی مرضی ہے۔" وہ بڑے آرام سے بولیں اور میرے سر پر جیسے چھت گر پڑی۔ میں ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑائی۔

"خدارا......! باجی......! ایسا ظلم مت کریں' یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔ اگر آپ سب پر میں اور میرے بچے بوجھ ہیں تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" میں اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

"تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی' تمہیں اسی گھر میں رہنا ہے اور اس فیصلے کو ہر صورت ماننا ہے ورنہ اپنے نقصان کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔" وہ وارننگ دیتی ہوئی بولیں۔

میں جانتی تھی کہ اس صورتِ حال سے نکلنا اتنا آسان نہیں کیونکہ انکار کی صورت میں وہ میرے بچے مجھ سے چھیننے کی بات کر رہی تھیں۔ میں بہت بڑی مشکل میں تھی۔ مجھے فی الحال حکمتِ عملی سے کام لینا تھا چنانچہ میں سنبھلتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے باجی......! اگر آپ سب کا یہی فیصلہ ہے تو میں سوچ کر جواب دوں گی۔"

میری بات سنتے ہی وہ نرم پڑ گئیں۔ "میں جانتی ہوں' تم بہت سمجھدار ہو' جو فیصلہ کرو گی' بہتر ہوگا تمہارے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ آج حقیقت میں' میں خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ یہ سب چکر کیا تھا؟ دراصل میرے سسر سے ملنے والے حصے کو میرے شوہر نے میرے اور بچوں کے نام کر دیا تھا۔ اب اگر میں یہ گھر چھوڑتی یا کسی اور سے شادی کرتی تو لازماً میرے سسرال والوں کو مجھے میرا حصہ دینا پڑتا جو وہ نہیں چاہتے تھے۔ اسی دولت کے لالچ میں میرے جیٹھ جو مجھے بیٹی کا درجہ دیتے تھے' اب مجھ سے ہی شادی کے خواہش مند تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تقدیر میرے ساتھ ایسا گھناؤنا مذاق کرے گی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے انتہائی پریشان کن تھی کیونکہ میرے پیچھے کسی کی سپورٹ نہیں تھی' میں یہ پریشانی کس کے ساتھ شیئر کرتی؟ بھائی کوئی تھا نہیں' ابو کی وفات ہو چکی تھی۔ ایک امی کا وجود ہی تھا جو زندگی کے تپتے صحرا میں میرے لیے شجرِ سایہ دار سے کم نہیں تھا مگر یہ سب بتا کر میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ بے چاری پہلے ہی اپنی بیماریوں سے نبرد آزما تھیں اور ابو کے بعد تو ویسے بھی وہ آدھی رہ گئی تھیں پھر میں نے اپنے رَب سے لَو لگالی کیونکہ وہی تو ہے جو ہماری رَگِ جاں سے بھی نزدیک ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے حال جانتا ہے۔ اسی کے آگے میں نے اپنا مقدمہ پیش کر دیا اور دن گزرتے گئے۔ میں ہر روز دُعا کرتی کہ کاش! دن طویل ہو جائیں لیکن لگتا تھا جیسے دنوں کو پَر لگ گئے ہیں' تیزی سے گزرتے ہی جاتے تھے۔ انہی دنوں میرے بڑے بیٹے کی طبیعت خراب رہنے لگی' جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو اُسے آغا خان کے ڈاکٹرز کو دکھایا گیا۔ وہاں اُس کے تمام ٹیسٹ ہوئے تو یہ دل دہلا دینے والا انکشاف ہوا کہ ایان کو برین ٹیومر ہے۔ گھر میں سب ہی ایان کے لیے پریشان ہو گئے۔ اسے آغا خان میں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ میں ایان کی لمبی عمر کی دُعائیں مانگتی۔ وقتی طور پر میری شادی کا مسئلہ ٹل گیا تھا لیکن اُن دنوں میں بہت پریشان رہتی تھی۔ مجھے صرف اور صرف فکر تھی تو ایان کی!

آخر ڈاکٹرز کی کوششوں' سب کی دُعاؤں اور رَبِ کریم کی مہربانی سے میرا ایان روبہ صحت ہونے لگا۔ میں اپنے رَب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ ایان کو نئی زندگی ملی تھی' میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میری نند نے میری شادی کی بات چھیڑ کر میری خوشیوں کو تہس نہس کر ڈالا۔

"پھر تم نے کیا سوچا آسیہ......؟" ایک روز وہ اچانک بولیں۔

"کس بارے میں باجی؟" میں نے چونک کر کہا۔

"اب اتنی انجان نہ بنو' اس بارے میں تم سے پہلے بات ہو چکی ہے۔ تم نے سوچنے کا وقت مانگا تھا؟" وہ تڑخ کر بولیں۔ میں حیران پریشان اُن کی شکل تکنے لگی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ خطرہ ٹل گیا ہے مگر وہ تو میرے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں؟ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"باجی......! کچھ خیال کریں' ایان ابھی ہاسپٹل میں ہے' گھر میں سب پریشان ہیں اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں؟"

"میں تمہیں صرف اطلاع دے رہی تھی کہ ایان کے ڈسچارج ہوتے ہی ہم تمہارا نکاح ادریس بھائی سے کر دیں گے۔ یوں بھی بھابھی کے انتقال کے بعد سے بھائی خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگے ہیں اور میں اپنے بھائی کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میرا مطلب؟" انہوں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"جی باجی......!" میں فقط اتنا ہی کہہ پائی کیونکہ ان کے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اگر میں ذرا بھی چوں چرا کرتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ابھی میرا نکاح پڑھوا دیتیں اسی لیے میں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی جبکہ میری خاموشی کو وہ میری رضامندی سمجھیں اسی لیے پھر کچھ نہیں بولیں۔

مزید دو دن گزر گئے' میں ہاسپٹل میں ہی تھی لیکن ہر دَم سوچ کی سولی پر لٹکی رہتی تھی' عقل ماؤف ہو چکی تھی' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ گھر جانے کے دن قریب آ رہے تھے اور میرا دل حلق میں آ رہا تھا۔ میں' ادریس بھائی سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور بچے بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی خاص طور پر شایان کو کیونکہ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا' اُسے میری ضرورت تھی۔

آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

فیصلہ کیا اور فوراً اس پر عمل بھی کر ڈالا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اب میرا فیصلہ صحیح تھا یا غلط یہ میں نہیں جانتی تھی، بس مجھے یہی بہتر لگا تھا۔

دن میں جب میری نند ہاسپٹل آئیں تو میں نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کیا کرنے والی ہوں۔ میں نارمل انداز میں ان سے ملی، ان سے باتیں کیں اور پھر پروگرام کے مطابق بولی۔

"باجی......! کیا آپ دو گھنٹے مزید یہاں رک سکتی ہیں؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں، کوئی کام ہے کیا؟"

"وہ......دراصل میں گھر جا کر نہانے کا سوچ رہی تھی، ذرا فریش ہو جاتی اور شایان کو نہلا دیتی۔"

"ٹھیک ہے، چلی جاؤ لیکن جلدی آنا۔" میری نند نے تاکید کی۔

اجازت ملنے کی دیر تھی، مجھے جیسے آزادی کا پروانہ مل گیا، میں نے سوتے ہوئے ایان کے ماتھے پر طویل محبت بھرا بوسہ دیا کہ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ شایان کو گود میں اٹھایا اور ہاسپٹل سے نکلتی چلی گئی۔ باہر آ کر ایک رکشہ روکا اور اپنی امی کے گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ جی ہاں، میں اپنی امی کے پاس جا رہی تھی ہمیشہ کے لیے!

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، تمام راستے میری آنکھوں سے اشک بہتے رہے۔ میں اپنے دو جگر گوشوں کو چھوڑ آئی تھی۔ اس دنیا کی سفاکی نے میرے بچے مجھ سے جدا کر دیئے تھے، میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر اتر کر کتنی دیر سوچتی رہی کہ امی سے کیا کہوں گی پھر کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گیٹ امی نے ہی کھولا۔ میری اجڑی اور روئی روئی شکل دیکھ کر وہ پریشان ہوگئیں اور مجھے اندر لے گئیں۔

"خیریت بیٹا؟ ایسے اچانک کیسے آنا ہوا؟ ایان کیسا ہے اب؟ اور ایمان کہاں ہے؟" انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور میں اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ امی مزید پریشان ہوگئیں۔

"بیٹی......! کچھ بتا تو سہی، ایسے رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اور مجھے بھی ہولا رہی ہے؟"

پھر میں آہوں اور سسکیوں کے درمیان تمام روداد کہتی چلی گئی۔ امی ششدر رہ گئیں۔

"بیٹی......! اتنی بڑی بات تُو مجھ سے بھی چھپا گئی؟ اکیلی سہتی رہی؟ ارے، بچوں کا ہاتھ تھام کر چلی آتی۔ میرے لیے تُو اور بچے بوجھ نہیں ہیں۔" امی یہ کہتے کہتے رو پڑیں۔

"نہیں امی......! یہ اتنا آسان نہیں تھا، مجھ پر گھر سے باہر نکلنے پر پابندی تھی۔ اگر آج نہیں آتی تو پھر آنا ممکن نہیں تھا اسی لیے میں نے اپنی ممتا کی قربانی دی ہے اور میں اُس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہوں۔ اب میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی......" میں نے امی کی گود میں سر رکھ لیا اور آنکھیں موند لیں۔

"ممکن ہے، آپ کو میرا فیصلہ ٹھیک نہ لگے لیکن ان حالات میں مجھے یہی ٹھیک لگا۔" امی کے گھر میں رہتے ہوئے مجھے ایک سال ہو گیا، اس عرصے میں میں نے انصاف کے لیے ہر در کھٹکھٹایا لیکن کہیں سے انصاف نہ ملا۔ میرے سسرال والے بڑے اثر و رسوخ والے ہیں، ان کے پاس دولت کی طاقت بھی ہے۔ بھلا میں غریب اور بے سہارا عورت ان کا کیا بگاڑ لوں گی؟ میری ممتا اپنے دو بچوں کے لیے تڑپ رہی ہے لیکن میں مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکتی سوائے دُعا کے۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن میری دُعائیں رنگ لائیں گی اور مجھے انصاف ملے گا، مجھے میرے بچے ملیں گے، انشاء اللہ!

......☆☆......

یاسمین چودھری

بیتے دنوں کی یاد!

شاہد بخاری کا خیال

دل سے اک ہُوک سی اٹھتی ہے تو لگتا ہے مجھے
مندمل ہو تو گیا زخم کسک باقی ہے

فریبِ محبت کا شکار ہونے والے نوجوان کی یادوں سے آراستہ رُوداد



WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ابھی گھر سے دفتر کے لیے نکلا ہی تھا کہ گوتم تیز رفتاری سے اسکوٹر چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوا اور میرے قریب آ کر اسکوٹر روکتے ہی بولا۔

''نورالدین! چل میرے ساتھ بیٹھ جلدی کر۔''

''ابے یار' خیر تو ہے؟ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے' بات کیا ہے؟''

''تو بیٹھ تو سہی! کہیں چل کر بیٹھتے ہیں پھر بتاتا ہوں۔'' میں اسکوٹر پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو گوتم نے پھر تیز رفتاری دکھائی اور گلی سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا۔

''ارے یار گوتم' ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے پھر سوال کیا تھا۔

''ابے یار' تو چپ نہیں بیٹھ سکتا؟ کہاں جا رہے ہیں' ابھی پتا چل جائے گا۔'' وہ جھلا کر بولا تھا۔

گوتم کی عادت ہی ایسی تھی کہ ہر بات میں سسپنس پیدا کر دیتا تھا۔ وہ میرے بچپن کا بڑا ہی پکا دوست تھا اور ہم ایک دوسرے سے ہر قسم کی ذاتی و غیر ذاتی باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔

..............*.......*

میں ہندوستان کے علاقے یوپی کے شہر سہارن پور سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ ابا میرے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ یہ شکر ہے کہ اماں اپنی زندگی ہی میں بہنوں کی شادیاں کر گئی تھیں۔ ہمارا آبائی گھر دو منزلوں پر مشتمل تھا' اوپر کی منزل میں میرے چچا اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے کا پورشن ہمارے پاس تھا۔ چچا سعودی عرب میں کام کرتے تھے اور معاشی طور پر اُن کی فیملی ہم سے زیادہ آسودہ تھی اور خاندانوں کی طرح ہمارے یہاں بھی وہی روایتی مسئلہ موجود تھا کہ چچا کی فیملی اور ہماری بنتی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ بول چال بھی بند تھی۔ میری چچی ستارہ بیگم بڑی سخت مزاج واقع ہوئی تھیں اور انہیں گویا ہم سے بہت نفرت تھی' وہ ہم سے کسی بھی قسم کے تعلقات رکھنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ابا کے انتقال کے بعد اماں نے بڑے مشکل حالات میں ہماری پرورش کی تھی۔

سہارن پور میں یوں تو مسلمان' ہندو' سکھ اور عیسائی سب ہی رہتے تھے مگر سب لوگ مختلف آبادیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی آبادی میں ہندو نہیں رہتے تھے اور ہندوؤں کی آبادی میں مسلمان رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مذاہب کی بنیاد پر آبادیوں کی واضح تقسیم تھی۔ ہمارا گھر سہارن پور شہر کے مشہور علاقے نخاسہ بازار میں واقع تھا اور اس آبائی گھر کی پراپرٹی چچا اور ہمارے درمیان جھگڑے کا باعث تھی۔

میں نے بہت شوق اور محنت سے تعلیم حاصل کی تھی تاکہ اپنے مستقبل کو سنوار سکوں' اس سلسلے میں کسی کی مدد حاصل نہیں کی تھی اس لیے جو بھی کرتا تھا' اپنے بل بوتے پر ہی کرتا تھا۔ میں ابتدا میں ٹریول ایجنٹ کا کام کرتا رہا تھا اور پھر میں نے پولیس کی نوکری کر لی جہاں مجھے ایس پی او (اسپیشل پولیس آفیسر) کی پوسٹ پر بھرتی کر لیا گیا تھا۔

..............*.......*

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا' گوتم اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتا تھا مگر اس دن تو کوئی خاص بات ہی تھی جو وہ اتنی افراتفری میں میرے پاس آیا تھا۔ ہم مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے کیلاش پور ایمبیسیز گڑھ پارک پہنچے تھے جسے گاندھی پارک بھی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ اسٹیڈیم بھی موجود ہے۔

پارک میں پہنچ کر گوتم گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ ''بڑی ضروری بات کرنی ہے تم سے۔''

''تو یہ بات کہنے کے لیے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ضروری بات تو وہاں بھی ہو سکتی تھی!''

''ہو تو سکتی تھی مگر یار' کچھ باتوں کے لیے ماحول کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو وہاں نہیں تھا۔'' گوتم نے میرے سوال کے جواب میں خاصے سنجیدہ لہجے

میں کہا تھا پھر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ''یاد ہے ناں' میں نے تجھ سے وجنتی کے نام لو لیٹر لکھوایا تھا؟''

''اوہ' تو یقیناً تیرا خط وجنتی کے بھائیوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اور اب تو ان سے چھپتا پھر رہا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

''ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں' وجنتی نے تو جواب دیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی گوتم نے جیب سے خط نکالا تھا۔ ''یار! تو نے میرے جذبات کی صحیح لفاظی کی تھی' وجنتی بھی مجھ سے پیار کرتی ہے اور ملنا چاہتی ہے۔''

''تو پریشانی کی کیا بات ہے؟ ملاقات کر لے۔'' میں نے اسے مشورہ دیا تھا۔

''یہی تو مسئلہ ہے کہ ملاقات کب اور کہاں کروں؟ تم مشورہ دو اور وجنتی کے لیٹر کا جواب بھی لکھ دو۔''

''میرے بھولے دوست' جواب لکھنے کے لیے کاغذ' قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''وہ میں ابھی لے کر آتا ہوں' جب تک تو یہ وجنتی کا پتر پڑھ۔'' گوتم تو خط میرے ہاتھ میں پکڑا کر چلا گیا اور میں ہاتھ میں تھامے خط کو دیکھ کر اپنے ماضی میں کھو گیا تھا۔

..............*.......*

میں بتا چکا ہوں کہ چچا کی فیملی سے ہمارا ملنا جلنا نہیں تھا حالانکہ ہم ایک ہی عمارت میں رہتے تھے مگر میں اپنے دل کا کیا کرتا جس سے مجبور ہو کر میں اکثر چچا کی بیٹی سمیرا کو چوری چوری دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت پسند تھی اور اگر کبھی آتے جاتے آمنا سامنا ہوتا تو مجھے اس کی بولتی آنکھوں میں بھی اپنے لیے پیار ہی پیار نظر آتا تھا اور پھر میں نے ہمت کر کے اُسے اپنے دل کا حال بتانے کے لیے ایک خط لکھا تھا لیکن وہ خط پکڑا گیا تھا' بڑا ہنگامہ اور جھگڑا ہوا تھا' ناراضگیاں اور بڑھ گئی تھیں۔

وقت گزرتا رہا اور سمیرا سے میری محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پروان چڑھتی رہی تھی۔ اس دوران میں سمیرا کی منگنی بھی کر دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ مجھے جب کہیں نظر آتی تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو' اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے پیار نظر آتا تھا' دوسری طرف میں بھی اکثر دوستوں سے اُس کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ گھر میں بہنیں جب یہ کہتی تھیں کہ بھائی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کر کے شادی کر دی جائے تو میں فوراً منع کر دیتا اور صاف کہتا کہ شادی کروں گا تو سمیرا کے ساتھ ورنہ کنوارا رہوں گا۔ اس بات پر گھر والوں سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ گوتم کاغذ' قلم لے کر آ گیا تھا۔

''لے یار' یہ کاغذ اور قلم' خط تو تم نے پڑھ لیا ہوگا' اب خوبصورت سا جواب لکھ دے۔''

میں نے کاغذ' قلم لے کر گوتم کے خط کا جواب لکھ دیا تھا۔ اس دوران وہ نجانے کیا کیا بولتا رہا تھا' ویسے ایک بات پکی تھی کہ گوتم بہت خوش تھا اور اس کی خوشی کا مجھ سے زیادہ کون احساس کر سکتا تھا کیونکہ میں تو اس مرحلے سے گزر چکا تھا۔

..............*.......*

سمیرا اور میری محبت کی کہانی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ سمیرا کی جو منگنی ہو چکی تھی' وہ تین سال رہی' اس دوران میرا اس سے کبھی کبھار سامنا ہوتا رہا تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ سمیرا کا منگیتر اچھا شخص نہیں تھا' ڈرنک وغیرہ بھی کرتا تھا مگر یہ بات میں سمیرا کو نہیں بتا سکتا تھا اور پھر سمیرا کو اس بارے میں ہی پتا نہیں چل گیا تھا بلکہ اس نے اپنے منگیتر کو کسی اور لڑکی کے ساتھ بھی دیکھ لیا تھا اور پھر یہ منگنی ٹوٹ گئی تھی۔

منگنی ٹوٹنے کے بعد دوبارہ' ہم قریب آتے گئے تھے' ہمارا گھر سے باہر ملنا جلنا بڑھ گیا تھا لیکن یہ بات

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابھی ہمارے گھر والوں کے علم میں نہیں تھی اور آخرکار ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ہمیں شادی کر لینی چاہیے لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ ہمارے گھر والے کبھی بھی ہماری شادی پر رضامند نہیں ہوں گے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ کورٹ میرج کر لیتے ہیں اور یوں ہم نے گھر والوں کی لاعلمی میں کورٹ میرج کر لی تھی اور نکاح کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

یہ بات دو تین دن تو چھپی رہی تھی مگر کسی جاننے والے نے ہمیں کورٹ میں دیکھ لیا تھا لہٰذا اُس نے آ کر ہمارے گھروں میں یہ اطلاع دی تھی۔ اس بات کا پتہ چلنا تھا کہ ایک زلزلہ آ گیا' بہت شور شرابہ ہوا' جھگڑا ہوا۔ سمیرا کے گھر والے بضد تھے کہ میں اُسے طلاق دے دوں لیکن میں نہیں مانا اور ڈٹا رہا۔ سمیرا کے گھر والوں سے بھی جھگڑا مول لیا اور اپنے گھر والوں سے بھی باتیں سنتا رہا۔ آخرکار خاندان کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ ہماری شادی کو منظور کر لیا جائے مگر سمیرا کی والدہ یعنی میری چچی ستارہ بیگم اپنی بیٹی کی طلاق پر بضد تھیں اور جب سمیرا کے گھر والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں اُسے طلاق نہیں دوں گا تو انہوں نے سعودی عرب میں مقیم سمیرا کے بھائی کو بلوایا تھا۔ اُس نے گھر پہنچ کر بہن کو بہت ڈرایا دھمکایا اور مارا پیٹا تھا اور یہاں تک کہا تھا کہ اگر تم نے کہنا نہیں مانا تو میں تم پر تیزاب ڈال دوں گا۔

سمیرا نے اُس رات گھر والوں سے چھپ کر مجھے فون کیا تھا اور تمام روداد سنا کر بولی تھی۔ ''میں کل صبح سات بجے ریلوے اسٹیشن پہنچ جاؤں گی' مجھے اپنی زندگی کا خطرہ ہے۔ تم آؤ نہ آؤ مگر میں واپس گھر نہیں آؤں گی۔'' میں صبح اسٹیشن پہنچ گیا۔ سمیرا بھی خاموشی سے گھر سے نکل کر چھپ چھپا کے اسٹیشن پہنچ گئی تھی اور پھر اُس نے مجھے ساری بات تفصیل سے بتائی تھی۔ اُس کی بات سن کر میں نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور سمیرا کے ساتھ چندی گڑھ روانہ ہو گیا تھا۔ میرا پروگرام چندی گڑھ سے ہو کر شملہ جانے کا تھا۔

•......•......•......•

شملہ میں ہم تقریباً آٹھ دن رہے تھے۔ اس دوران گھر والوں سے فون پر رابطہ کیا تو کہا گیا تھا کہ ''تم لوگ واپس آ جاؤ۔'' مگر ہم ڈرے ہوئے تھے کہ وہ ہمیں بہانے سے بلا رہے ہیں مگر میرے گھر والوں نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ واپس آ جاؤ اور یہاں سہارن پور میں اپنی بیوی کے ساتھ رہو۔ ہم نے سمیرا کے گھر والوں کو بھی منا لیا ہے اور اب ان کا کہنا ہے کہ اُن کی بیٹی جہاں جی چاہے رہے' انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اس یقین دہانی کے بعد ہم واپس سہارن پور آ گئے تھے جہاں حالات کافی حد تک نارمل تھے۔ میں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ ہمارا یہ کرائے کا گھر ہم دونوں کے گھروں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں میرے گھر والے تو مجھے ملتے تھے مگر سمیرا کے گھر والوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

•......•......•......•

ہمیں اس کرائے کے گھر میں رہتے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے کہ ایک دن دوپہر کے وقت میرے آفس میں سمیرا کا فون آیا تھا کہ اُس کی ماں ستارہ بیگم گھر کے دروازے پر کھڑی ہے اور ہمیں برا بھلا کہہ رہی ہے۔

''دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سمیرا نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اُس کی ماں تھوڑی دیر دروازہ کھٹکھٹا کر اور باتیں بنا کے چلی گئی تھی۔

کچھ دن خیریت سے گزرے تھے اور ہم دونوں اپنی نئی زندگی میں مگن' بہت خوش تھے اور میں تو کچھ زیادہ ہی خوش تھا کہ میں نے اپنی محبت کو پا لیا تھا اور وہ

اُن دنوں امید سے تھی۔ اُس روز جب میں گھر لوٹا تھا تو سمیرا کو پریشان پایا تھا' وہ مجھے دیکھتے ہی بولی تھی۔

''آج تو حد ہو گئی! اماں آئی تھیں' میں نے پہلے تو دروازہ نہیں کھولا تھا' انہوں نے پتھر مارنے شروع کر دیئے تھے' محلے والوں کو جمع کر لیا تھا تو مجھے دروازہ کھولنا پڑا تھا۔ اماں مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھیں۔ وہ مجھے اپنی قسم دے کر گئی ہیں کہ ہم دونوں اُن سے ملنے جائیں۔''

میں نے ساری بات توجہ سے سنی تھی اور کہا تھا۔ ''مجھے تمہاری اماں کا بھروسہ نہیں ہے مگر کیونکہ انہوں نے تمہیں قسم دی ہے تو ضرور چلیں گے۔''

دوسرے دن میں سمیرا کو لے کر اُس کی ماں کے گھر گیا تھا۔ وہ ہم دونوں سے بڑے پیار سے پیش آئی تھی اور بڑی آؤ بھگت کے بعد بولی تھی۔

''بیٹا! سمیرا اب کچھ دن یہیں رہے گی۔ چند دن میں' میں اس کی رخصتی کروں گی تا کہ خاندان بھر میں منہ دکھانے کے قابل تو ہو جاؤں۔ تم مجھے اتنا موقع تو دو کہ میں بدنامی کے داغ کو دھو سکوں' لوگوں کی زبانیں بند کر سکوں!''

میری ساس نے یہ باتیں کچھ اس طرح کی تھیں کہ ہمیں ماننی پڑی تھیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ چند دنوں کی تو بات ہے پھر ہم ہوں گے اور ہماری زندگی! مگر میری ساس نے تو چند ہی دنوں میں اپنی اصلیت دکھانی شروع کر دی تھی اور سمیرا کو کچھ الٹا سیدھا کھلا کر بچہ ضائع کر دیا تھا اور پھر اُس کے علاج اور تندرستی کے بہانے رخصتی کے لیے بھی ٹال مٹول کرنے لگی تھی اور ایک روز یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ''کوئی مکان وغیرہ میری بیٹی کے نام کرو پھر رخصتی کروں گی۔'' اور میرے ساتھ ظلم یہ ہوا تھا کہ اُس نے سمیرا کو بھی ایسی پٹی پڑھائی تھی کہ وہ بھی ماں کی باتوں میں آ کر اُس کی طرف داری کرنے لگی تھی۔

میں نے اپنی ساس کی یہ بات نہیں مانی تھی تو اُس نے مطالبہ کیا تھا کہ میں سمیرا کو طلاق دے دوں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا تھا تو انہوں نے مجھ سمیت میرے بھائی اور بہنوں تک پر اپنی بیٹی سمیرا کے اغوا کا پرچہ کروا دیا۔

پولیس کیس کے بعد مجھے بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ میں خود پولیس میں ایک اچھی پوسٹ پر تھا' بڑی مشکل سے وارنٹ کینسل کروائے تھے اور ضمانتیں کروائی تھیں اور پھر آخرکار دوست احباب کے سمجھانے پر بات چیت سے ہی یہ مسئلہ حل کرنا پڑا تھا۔

ستارہ بیگم نہایت تیز' ہوشیار اور چالاک عورت تھی' باوجود اس کے کہ میں حقِ مہر کی رقم پہلے ہی سمیرا کو دے چکا تھا' اس کے علاوہ بھی مجھے ایک لاکھ روپے ان لوگوں کو دینے پڑے تھے اور گھر کا سامان بھی انہوں نے ضبط کر لیا تھا۔ یہ سب ماننے اور کرنے پر میں مجبور تھا' مجھے اپنے گھر والوں کو اس عذاب سے نکالنا تھا اور یوں میں نے سمیرا کو طلاق دے دی تھی جس کا مجھے بہت دکھ تھا۔

میں سمیرا سے واقعی بہت محبت کرتا تھا' اتنی محبت کہ اپنی عدت کی مدت کے دوران مجھے سمیرا نے ایک دن فون کر کے کہا کہ ''نور' تم یہ شہر چھوڑ دو!'' اُس کی بات سن کر ہی سناٹے میں آ گیا تھا اور پھر میں اُس کی خوشی کی خاطر اپنا شہر' اپنا سہارن پور چھوڑ کر ممبئی چلا گیا تھا۔

•......•......•......•

زندگی اب بھی رواں دواں ہے۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ بھی کر لیا ہے مگر میں اب بھی سمیرا کو بھلا نہیں پایا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے سمیرا کو ٹوٹ کر چاہا تھا مگر شاید میری تقدیر ہی ایسی ہے۔ آج سمیرا تو میرے ساتھ نہیں ہے مگر ہر لمحے اُس کی باتیں میرے ساتھ رہتی ہیں! اور شاید زندگی بھر میرے ساتھ ہی رہے گی۔ میں چاہوں بھی تو سمیرا کو نہیں بھلا سکتا!!

......☆☆......

WWW.PAKSOCIETY.COM

زیرِ فگر کے ساتھ۔ سچ بتاؤ حسن' کیا میں موٹی دھوبن لگتی ہوں اور اب کوئی بھی ڈریس میرے اوپر سُوٹ نہیں کرتا؟''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے جانم' تم اب بھی اتنی ہی خوبصورت اور چارمنگ ہو جتنی شادی کے دن تھیں بلکہ شادی والی رات تو تم بادلوں میں ڈھکا چاند تھیں تو اب چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور چمکدار ہو اور حسن ترمذی مابدولت سمیت طٰہٰ ترمذی' بلال ترمذی اور مائرہ ترمذی' تمہارے گرد ستاروں کی مانند ٹمٹماتے ہیں۔''

''ہاں' ہاں' بنالو حسن' مجھے تم' زبان سے تو تم مجھے چاند کہہ رہے ہو اور دل میں کہہ رہے ہو گے کہ پہلے پہلی تاریخ کا نازک سا ہلالِ عید تھیں اور اب چودھویں کا موٹا تازہ گول مٹول چاند ہو۔''

''جانِ من' تمہیں سمجھانا تو جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے' تم نے تو چاند کی توہین میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا ہو گیا اگر تم ہلالِ عید نہیں ہو' پورن ماشی (پورا چاند) ہو۔ میرے لیے چاند تو چاند ہوتا ہے' چاہے ہلالِ عید ہو باریک لکیر کی طرح یا پورن ماشی ہو۔ اچھا چھوڑو' جلدی کرو' گاڑی میں بیٹھو' ایک گھنٹے کا تو راستہ ہی ہے' اگر دیر ہو گئی تو تمہاری چھوٹی بہنا جی اپنے جیجا جی سے سخت ناراض ہو جائیں گی اور یہ جو تم میرے سر پر چند بال بچے دیکھ رہی ہو ناں' یہ بھی اُس کی نذر ہو جائیں گے۔''

وہ سب تیار تو ہو ہی چکے تھے لہٰذا باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر شادی ہال کی طرف روانہ ہو گئے۔

سائرہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں نازک' چلبلی اور شرارتی دھان پان سی لڑکی ہوا کرتی تھی جو کہ مختلف تقریری مقابلوں' شعر گوئی' نعت خوانی' ملی نغموں سمیت نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتی تھی۔ نازک سی شخصیت' سیاہ گھنے لمبے بالوں اور حسین چہرے کی معصومیت کے ساتھ ایک دن ڈائس پر کھڑی اپنے خیالات کا اظہار اس پُرجوش انداز میں کر رہی تھی کہ لگتا تھا' بدن کا سارا خون چہرے کی طرف رواں ہو گیا تھا' پسینے سے تر ہوتی پیشانی پر آئی بالوں کی لٹ کو سائرہ نے جھٹک کر پیچھے کیا اور پُرجوش آواز میں بولی۔

''جنابِ جج صاحب......! عورت اگر بیٹی کے روپ میں ہو تو باپ کے لیے سراپا دُعا ہوتی ہے۔ عورت اگر بہن کا روپ لیے ہو تو بھائی کے سر کی چھایہ ہے۔ بہو کے روپ میں سسرال کا نُور ہے تو بیوی کے روپ کے کیا کہنے' ہر روز آتشِ جوالہ ہے اور ہاں' عورت اگر فضلِ خدا سے ماں کے عہدے پر متمکن ہو جائے تو جنت اُس کے قدموں تلے آ جاتی ہے۔ واقعی عورت رگوں میں بہتے خون کی روانی ہے' جذبوں میں بہتی جوانی ہے' کائنات کا حسن ہے' واقعی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''

اور جب اپنی انتہائی جذباتی تقریر کے بعد وہ اپنے دوپٹے کا پلو اپنی مٹھی میں مروڑتے ہوئے اسٹیج سے نیچے اتری تو جج سیٹ پر بیٹھے فائنل ایئر کے حسن ترمذی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سائرہ بانو نے مٹھی میں اپنے دوپٹے کا کونا سختی سے نہیں تھاما بلکہ حسن ترمذی کا دل تھام لیا ہے اور اب اس کے اندر کسی اور پری وش کے جلوے کی تاب لانے کی سکت نہیں ہے۔

اس تقریری مقابلے کے بعد فائنل ایئر کے سوبر اور چارمنگ حسن یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغ عامہ کے چکر لگانے پر مجبور ہو گئے۔ دوستوں نے معاملات کی سُن گن لینے کی کوشش کی مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ حسن نے

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد برسرِ روزگار ہوتے ہی سائرہ بانو کے گھر رشتہ بھیجا جہاں سے مناسب چھان بین کے بعد حسن ترمذی کے رشتے کی منظوری دے دی گئی۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا مقولہ اُن پر پوری طرح صادق آیا اور ایک رات سائرہ دُلہن بنی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ حسن کے سامنے موجود تھی۔

سائرہ نہ صرف ایک اچھی مقررہ' ادیبہ اور شاعرہ تھی بلکہ شادی کے بعد وہ ایک اچھی بیوی' بہو' بھابھی اور ماں بھی ثابت ہوئی' پے در پے تین بچوں کی ولادت اور تیسری بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی ساس کی بیماری نے سائرہ کو گھریلو کاموں میں اتنا مصروف کر دیا کہ وہ اپنی فٹنس کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اس کا وزن بڑھتا گیا۔ حسن کی والدہ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں کہ اللہ نے اُن کو اتنی اچھی بہو سے نوازا تھا جس نے بیٹی کی کمی پوری کر دی اور جو دیگر بہوؤں کی طرح فٹنس سینٹر' یوگا' ایروبکس کلاسز جانے کے بجائے اُن کے لیے سُوپ اور جوسز بنانے کی فکر کرتی تھی اور اپنا بھرپور وقت گھر کو ایک ذمہ دار ماں اور بہو کے طور پر دیتی تھی۔

سائرہ بھی ویسے تو ہر طرح مطمئن تھی مگر اُس کا مسئلہ یہ تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ اسے اپنا بڑھا ہوا وزن ازحد ناگوار لگنے لگا تھا' وہ حسن سے اس حوالے سے بات کرتی تو حسن ٹال جاتا مگر گزرتے وقت کے ساتھ سائرہ کے دماغ میں یہ بات پختہ ہوتی چلی گئی کہ اُس نے ہر حال میں وزن کم کرنا ہے' بچوں کے اسکول جانے اور ساس کو ناشتا دینے کے بعد اکثر اوقات کچن کے دوسرے کاموں کے دوران کسی نہ کسی چینل پر مارننگ شو دیکھنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا جو جلتی پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ اکثر اُن شوز میں موٹاپے کا شکار بیویوں کے شوہروں کا دوسری اسمارٹ خواتین کے ساتھ چکر چلانے سے لے کر شادی تک کے واقعات کچھ اس طرح سے نمک مرچ لگا کر بتائے جاتے کہ سائرہ اپنے وزن کو کم کرنے اور موٹاپا ختم کرنے کے لیے خاصی محنت کرنے لگی تھی۔ پڑوسنوں کے گھر جانا' کسی پارٹیز اور ہر قسم کے سوشل سرکل کا اُس نے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک وہ دبلی پتلی اور اسمارٹ نہیں ہو جاتی' وہ کہیں نہیں جائے گی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ گھر پر بیٹھنے اور کہیں نہ آنے جانے کی وجہ سے اس کا دو چار کلو وزن اور بھی بڑھ گیا۔ اب تو سائرہ کی پریشانی مزید بڑھ گئی' سونے پہ سہاگہ' ایک روز اُس کی چند دوستیں ملنے کے لیے گھر آ گئیں۔

باتوں باتوں میں ایک تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''سائرہ! تم تو موٹی ہو گئی ہو' پچھلے مہینے کے مقابلے میں پیٹ بھی کافی نکل آیا ہے' کہیں......؟؟؟'' اس بات پر باقی سب دبی دبی ہنسی ہنسنے لگیں۔

''ارے نہیں' پچھلے مہینے ساس کی طبیعت خاصی خراب تھی' مصروفیت کی وجہ سے بیلی بیلٹ (Belly belt) وغیرہ کا استعمال نہیں کر سکی ناں' اس لیے۔''

اُس نے توجیہہ پیش کی۔

''ارے نہیں' چھپاؤ نہیں' بتادو' کوئی بات نہیں۔'' اور سائرہ جھینپی سی ہنسی ہنس دی۔

دوستوں کے جانے کے بعد تو وہ مزید پریشان ہو گئی اور دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے' وہ اپنا وزن کم کر کے ہی رہے گی۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ اس کے تین بچے ہیں تو اسے موٹاپے کا سرٹیفکیٹ مل گیا یا یہ کہ اسے کوئی بیماری شوگر' بلڈ پریشر وغیرہ نہیں تو موٹاپا جائز ہے' ارے' موٹاپا تو خود ایک بیماری سے کم نہیں اور اب میں اسے ہر حال میں کم کر کے رہوں گی' میں ضرور اسمارٹ ہو جاؤں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گی۔

دس پندرہ دن کے فاقوں، ٹریڈمل کی واک، نہار منہ گرم پانی اور نہ جانے کون کون سے ٹوٹکے آزمانے کے بعد بھی جب سائرہ کو مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوئے تو وہ شدید ڈپریسڈ ہوگئی، اچانک اسے خیال آیا کہ ایک دن اُس کی دھان پان زیرو فگر والی ماسی کہہ رہی تھی کہ ایک بابا جی ہیں، وہ ہر قسم کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔ اُس نے فوراً بتول کو آواز لگائی۔

''بتول......! ذرا اِدھر تو آؤ، وہ...... ایک دن تم کیا بتا رہی تھیں، تمہارے کوئی بابا ہیں جو ہر کام کر دیتے ہیں، تمام مسئلوں کا حل ہوتا ہے اُن کے پاس؟''

''جی باجی......!'' بتول بولی۔ ''وہ تیلی والے بابا بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جی، اللہ بخشے، میری ساس کہا کرتی تھیں، اُن کی منجھلی بیٹی چھیماں کے یہاں چودہ سال سے بچہ نہ ہوا تھا۔ بابا جی نے ایسا تعویذ اور چورن دیا کہ چوتھے ہی ماہ اُس کو خوشخبری مل گئی۔ شکورن کی بیٹی کو یرقان ہوگیا تھا جی، وڈے وڈے ڈکٹروں نے جواب دے دیا تھا جی، اسے پر بابا جی کے پڑھے ہوئے بیر کے پتوں کا ہار اور چورن استعمال کر کے وہ بھلی چنگی ہوگئی اور تو اور باجی، وہ جو شکورن کی دیوارنی تھی نا، وہ ایک دفعہ میری جگہ آپ کے پاس کام بھی کرنے آئی تھی، تھوڑی بھینگی اور بہت موٹی سی تھی وہ تو جی......!'' بتول سے ایک بات کر کے دیکھو، وہ تو پوری داستان شروع کر دیتی تھی۔

''اچھا، اچھا، بس بھی کرو بتول!'' سائرہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہارے بابا جی کے پاس موٹاپا ختم کرنے کا بھی کوئی علاج ہے؟''

''یہ کیا بات کر دی آپ نے بی بی جی، اُن کے پاس موت کے سوا ہر چیز کا علاج ہے۔ میری خالہ کی بیٹی کی شادی موٹا ہونے کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی، بابا جی نے ایسا تعویذ اور چورن دیا کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہی اس کے جسم کی ساری فالتو چربی گھل گئی اور آناً فاناً اُس کی شادی ہوگئی۔''

''بتول، تمہاری خالہ کی وہی بیٹی ناں جو شادی کے نویں مہینے وفات پا گئی تھی؟''

''ہاں جی، وہی مگر اُس کی موت کی وجہ تو زچگی میں ہوئی تھی باجی، ورنہ وزن تو اس کا اتنا ہولا تھا کہ جی، ہتھیلی پر اٹھا لو، پھول کی طرح نازک اور وہ جو باجی، ٹی وی پر چل رہا ہے نا، ڈرامہ، اُس کی جو ہیروئن ہے نا، آپ کو یاد ہوگا، وہ کتنی موٹی تھی جی، وہ جی، میں نے خود اُس کو بابا جی کی کٹیا میں دیکھا تھا۔ آپ نے دیکھا، اب اُس کو کتنی نازک اور سمارٹ ہوگئی ہے وہ، یہ سب بابا جی کے تعویذ اور چورن کا کمال ہے۔ سچ بتاؤں باجی، یہ جو مارننگ شو والی باجیاں ہیں ناں، سب کو تو نہیں پہچانتی مگر اُن میں سے کیئوں کو میں نے بابا جی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے جی، اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے، سب کی سب کیسی سمارٹ دِکھتی ہیں نا باجی، نازک سی پریاں اور بولتی کیسا اچھا ہیں صبوح صبوح (صبح صبح) دل کرتا ہے جی، بس اُن کو سنتے ہی رہو، ٹی وی کے آگے سے ہٹو ہی نہ، پر کیا کریں، غریب ہیں ناں جی، پاپی پیٹ کا ایندھن بھرنے کے سوا ہمیں کچھ سوجھتا ہی ناں ہے جی!''

''اچھا، اب بس بھی کر دو بتول، بہت بولتی ہو تم۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھے بابا جی کے پاس لے چلو گی؟ میں بھی اپنے وزن کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

''ست بسم اللہ، بی بی جی......!'' بتول فوراً

بولی۔ ''میں آپ کو ضرور لے چلوں گی، بس آپ ذرا یہ بات بھائی صاحب (بتول کے میاں) اور اماں (بتول کی ساس) کے کان میں نہ پڑنے دیں۔ آپ کو تو پتا ہے ناں جی، اماں مجھے بھی اُس بابا جی کے پاس جانے سے منع کرتی ہیں۔ آپ کو تو جی، وہ ہرگز اجازت نہ دیں گی۔''

''ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے، تم بے فکر رہو بتول، میں کسی سے تذکرہ نہیں کروں گی۔''

مارننگ شو والی باجیاں، ہیروئنیں...... ہاں، شاید میں نے بھی کہیں پڑھا تھا کہ بڑے بڑے سیاست دان اور فلم میکر وغیرہ بھی اُن باباؤں وغیرہ کے پاس آتے جاتے ہیں اپنے کاموں اور مسئلوں کے سلسلے میں۔ سائرہ کے روشن خیال اور پڑھے لکھے دماغ میں یہ بات بیٹھتی چلی گئی کہ ان باتوں میں کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہوگی اور اگر میرا وزن کم ہوگیا تو ضرور حسن اور بچے بھی خوش ہوں گے۔ وزن کم ہو جائے ایک بار پھر میں حسن کو سب کچھ بتا دوں گی خود ہی، میرا مقصد کوئی چھپانے کا تو ہرگز نہیں ہے، بس سرپرائز دوں گی حسن کو، وہ کتنا خوش ہوں گے مجھے اسمارٹ دیکھ کر۔

سائرہ نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت ساری دلیلوں سے مطمئن کر لیا کہ وہ کون سا ناجائز کام کرنے جا رہی ہے اور کون سا ایک دفعہ جاتے ہی میں اُس پر اندھا اعتقاد کر لوں گی، میں تو اتنی براڈ مائنڈڈ اور ایجوکیٹڈ ہوں، بس میں نے اپنا تھوڑا وزن ہی تو کم کرنا ہے۔ وہ مصمم فیصلہ تو کر ہی چکی تھی کہ ہر حال میں وزن کم کرنا ہے لہٰذا اگلی صبح حسن کے آفس اور بچوں کے اسکول جانے کے بعد اُس نے اپنی ساس کو ناشتا دیا اور یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئی کہ وہ پڑوس میں جا رہی ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ بتول اُس کے انتظار میں باہر کھڑی تھی،

دونوں بابا جی کی رہائش گاہ پہنچیں تو ایک لمحے کو سائرہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟ مگر پھر اُس نے اپنے اندر کی آواز کو اگنور کر دیا اور اپنی تمام روشن خیالی اور تعلیم بالائے طاق رکھ دی کہ اُس کا مطمع نظر صرف اور صرف اپنا موٹاپا ختم کرنا تھا۔

سائرہ نے سوچا، وزن کی زیادتی حسن و خوبصورتی کے لیے دشمن ہے اور بابا جی کے توسط سے میں یقیناً دوبارہ سے سلم اور اسمارٹ ہو جاؤں گی اور حسن کو سرپرائز دوں گی۔ بتول کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سائرہ، بابا جی کے حجرے میں داخل ہوگئی۔

عجیب قسم کا ماحول تھا، قدرے اندھیرا اور دھواں دھواں سا تھا، کسی قسم کی عجیب سی تیز شدید چبھتی ہوئی سی بُو بھی ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ پتا نہیں، کافور تھا یا زعفران یا کوئی اگربتی۔ سائرہ نے اپنے دماغ میں اٹھتے سوالات کو سر جھٹک کر دور کیا اور بتول کے ساتھ بابا جی کے سامنے بیٹھ گئی۔

''جی بابا جی......! آج میں نہیں آئی آپ کے پاس، یہ میری باجی آئی ہیں اپنا مسئلہ لے کر۔''

''ہمیں معلوم ہے، تمہاری باجی کا کام ہو جائے گا۔'' بابا جی گرجدار آواز میں بولے۔ ''بس شرط یہ ہے کہ پکا اعتقاد ہونا چاہیے ہمارے چورن پر۔'' انہوں نے ایک ٹرانسپیرنٹ جار میں مٹی کے رنگ کا سفوف کاغذ کی تھیلی میں ڈالا اور سائرہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''جی بابا جی......!'' سائرہ کے منہ سے صرف یہی الفاظ ادا ہوئے۔ ''کیا ہدیہ ہوگا اس کا؟''

''کوئی ہدیہ نہیں ہے، ہم سب کام فی سبیل اللہ کیا کرتے ہیں۔'' بابا جی گرجدار آواز میں بولے۔ ''بس کونے میں جو ایک کپڑے سے ڈھکا باکس پڑا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے' اس میں اپنی مرضی سے اللہ کے نام پر جو ہو سکے' ڈال دو' ہمیں دنیاداری کی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں' ہر شئے فانی ہے۔ بس اللہ لافانی ہے۔" سائرہ دل ہی دل میں متاثر ہوگئی کہ ایسے مزاروں اور حجروں میں بیٹھے بابا صاحبان تو آنے والوں کو خوب لوٹتے ہیں اور پیسے لیتے ہیں مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بتول کے ٹہوکا دینے پر سائرہ آگے بڑھی اور کونے میں رکھے کپڑے سے ڈھکے ڈبے کے منہ میں اُس نے ہزار کا نوٹ ڈال دیا جو اُس نے پہلے سے اپنے پرس سے نکال کر اپنی مٹھی میں دبایا ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہزار روپے میں اگر اُس کا موٹاپا ختم ہو جائے اور وہ پہلے کی طرح اسمارٹ' سلم اور فٹ ہو جائے تو سودا برا نہیں تھا۔ بہرحال وہ گھر واپس آ گئی اور باباجی کی ہدایت کے مطابق' صبح ناشتے سے پہلے اور رات سونے سے پہلے ایک ایک چمچہ چورن گرم پانی کے ساتھ استعمال کرنے لگی اور تعویذ بھی اپنے تکیہ کے غلاف میں رکھ لیا۔ چورن کا سفوف بے ذائقہ تھا جس کا کوئی مضر اثر سامنے نہیں آیا۔ باباجی نے کہا تھا' پندرہ دن کے بعد وزن کرنا' انشاء اللہ' تمہاری دلی مراد بر آئے گی۔ پندرہ دن کے متواتر چورن کے استعمال کے بعد اسے واقعی محسوس ہوا کہ اُس کے وزن میں نمایاں کمی آئی ہے۔ وینگ اسکیل (weighing scale) پر وزن کرتے ہوئے تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی' پورے پانچ پاؤنڈ وزن کم تھا اس کا اور سائیڈ افیکٹ (side effect) بھی کوئی نہیں۔ اگلے دن اُس نے بتول کو ہزار کا نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا کہ پندرہ دن کا چورن اور لے آئے اور باباجی کو میرا سلام بھی دینا۔

"اچھا بی بی جی......!" بتول جاتے جاتے بولی اور واقعی اگلے پندرہ دن کے چورن کے استعمال سے اُس کا وزن مزید پانچ پاؤنڈ کم ہو چکا تھا۔

اس رات وہ واقعی بہت خوش تھی' اپنا ایک قدرے پرانا فٹنگ والا ڈریس پہن کر حسن کو دکھاتے ہوئے بولی۔ "حسن' دیکھیں' میرا وزن اور موٹاپا کچھ کم لگ رہا ہے ناں؟"

"ہاں جان......! تم تو ہمیشہ چاند کی طرح لگتی ہو' وزن زیادہ ہو یا کم' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح ٹالتے ہوئے بولے۔

سائرہ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "یاہو......! اگلے مہینے ضرور میں دس پاؤنڈ وزن مزید کم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی پھر اپنے گھر میں میلاد اور قرآن خوانی کی تقریب رکھ لوں گی۔ ساسو ماں بھی صحت مند ہو گئی تھیں اور طہٰ کا رزلٹ بھی شاندار آیا تھا۔ میں سب دوستوں اور پڑوسنوں کو اپنی اسمارٹ نیس دکھا کر متاثر کروں گی مگر باباجی کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتاؤں گی ورنہ سارے مل کر میرا مذاق اڑائیں گے کہ اتنی پڑھی لکھی روشن خیال کن چکروں میں پھنس گئی؟" وہ دل ہی دل میں کافی حد تک باباجی کی قائل ہو چکی تھی۔

ایک ہفتہ بھی گزر گیا اور اب تو سائرہ کے وزن میں نمایاں طور پر کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ جسم سڈول اور اسمارٹ ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹ بھی اندر ہو چکا تھا۔ سائرہ بہت ہی مسرور تھی' اُس نے ساس کی صحت یابی کی خوشی میں گھر پر میلاد اور قرآن خوانی کی تقریب رکھی جس میں اُس نے اپنی تمام دوستوں اور پڑوسی خواتین کو دعوت دی۔ سب ہی نے اُس کے وزن میں نمایاں کمی کو خوب سراہا مگر اُسے لگا جیسے جلنے والے ابھی بھی اُس سے کچھ جل رہے ہیں۔

ایک نے کہا۔ "ہاں سائرہ' وزن میں کمی تو ہوئی ہے' تم اسمارٹ بھی لگ رہی ہو مگر سچی بات تو یہ ہے' تم پہلے جیسی فریش نہیں لگ رہی ہو' تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو رہے ہیں۔"

دوسری بولی۔ "مجھے تو گردن کی جلد بھی کچھ ڈھلکی ہوئی لگ رہی ہے۔"

تیسری نے طنز کیا۔ "سائرہ......! مجھے تو تمہارے بال بھی بہت ہلکے لگ رہے ہیں' جب تم موٹی تھیں تو تمہارے بال بھی کس قدر موٹے' صحت مند' سیاہ اور سلکی تھے۔ اب دیکھو تو کس قدر بے جان و بے رونق اور ہلکے لگ رہے ہیں۔" سائرہ نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا' واقعی رمشاء سچ کہہ رہی تھی۔ تین مہینوں میں پہلی بار سائرہ کا دل ڈوبا۔

'کیا یہ باباجی کے چورن کا سائیڈ ایفیکٹ ہے؟ نہیں' نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔' اس نے اپنے سر کو جھٹکا پھر اسے خیال آیا کہ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی ماسی بتول شکایت کر رہی تھی کہ باجی' آپ نے یہ کیا واش روم کے فرش پر بالوں کا ڈھیر لگایا ہوا ہے' ساری نالیاں جب بند ہو جائیں گی تو آپ مجھ کو الزام دو گی۔ اپنے گرتے ہوئے بالوں کو سنبھالا کرو' ویسے بھی سر کے گرے ہوئے بال پیروں میں آئیں تو سر میں درد ہوتا ہے جی......!"

"بس کرو بتول' ہر وقت توہم پرستی کی باتیں کرتی رہتی ہو۔ جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ کل میلاد کے برتن اور پھیلاوا ابھی سمیٹنا ہے ابھی۔" دل ہی دل میں کل کی اپنی دوستوں کی باتوں کی وجہ سے پریشان تھی۔ سر میں درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ آئینہ دیکھتی تو سوچتی' واقعی میری مانگ سامنے سے بہت زیادہ چوڑی ہو گئی ہے اور آج کل اٹھتے بیٹھتے گھٹنوں میں بھی درد محسوس ہو رہا ہے۔

سائرہ بہت پریشان ہو گئی' رات میں اُس نے حسن کو ساری باتیں بتا دیں اور اپنے وزن کم ہونے کا راز بھی بتا دیا۔ حسن نے بہت ڈانٹا اور فوراً باقی بچے ہوئے چورن کا جار لے جا کر باہر کوڑے دان میں پھینک دیا۔

"آئندہ اس قسم کی کوئی واہیات' فضول دوا استعمال مت کرنا اور کسی ڈھونگی' فراڈیئے باباجی کے پاس جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے' پتا نہیں' یہ لوگ چار پیسوں کے لیے کس طرح انسانی جان سے کھیلتے ہیں اور سائرہ' تم اس قدر پڑھی لکھی اور روشن خیال ہوتے ہوئے بھی ایسے جعلی پیروں' فقیروں کے چنگل میں پھنس گئیں اور مجھے بتایا تک نہیں؟" سائرہ سہم گئی' اس نے کبھی حسن کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا لیکن جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا۔ اب وہ اللہ سے دُعا کر رہی تھی کہ یا اللہ! اب کچھ برا نہ ہو' سب خیر رہے۔

حسن دہاڑا۔ "ہاں......ہاں......زہر پھانک لو......پھر مصلے پر بیٹھ کر دُعائیں مانگو کہ یا اللہ! موت نہ آئے۔ سائرہ......! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی کچھ دے کر اور کبھی کچھ لے کر آزماتا ہے۔ موٹاپا اور اسمارٹ نیس سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں' اعتماد' دوسروں کا خیال رکھنے کی عادت اور احساسِ ذمہ داری نے اپنا گرویدہ بنایا تھا نا کہ تمہاری جسمانی خوبصورتی نے مانا کہ تم اُس وقت خوبصورت تھیں' اسمارٹ تھیں' موٹی بھی نہیں تھیں مگر سائرہ' تم یہ حقیقت بھول گئیں کہ وقت کے ساتھ تبدیلی ہی انسانی زندگی کا حسن ہے۔ تم خوبصورت' اسمارٹ رہتیں زیرو فگر کے ساتھ مگر تمہارے بچے نہ ہوتے یا پھر بچے بھی ہوتے' تم دبلی پتلی بھی رہتیں مگر بیمار ہوتیں' شوگر' بلڈ پریشر یا کینسر جیسی کسی بیماری کا شکار ہوتیں تو کیا ہوتا سائرہ' ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تم صحت مند تھیں' خوش تھیں' اگر وزن کم کرنا اتنا ہی ضروری تھا تو تھوڑی ڈائٹ کنٹرول کرتیں' واک وغیرہ کرتیں۔ تم ان جعلی پیروں' فقیروں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

چکر بازیوں میں آ گئیں' یہ تم نے کیا کیا سائرہ؟'' وہ سر پکڑ کر بیٹھے تھے کہ اچانک سائرہ کو ابکائی محسوس ہوئی' وہ واش روم کی طرف بھاگی' حسن بھی پیچھے پیچھے آئے' واش بیسن میں جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ سائرہ خوف زدہ ہوگئی اور حسن مزید پریشان...... ایک ہفتے کے اندر اندر ہی سائرہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے' اس کا وزن مزید کم ہوگیا اور سر کے بال بھی تیزی سے جھڑنے لگے' سر کے سامنے مانگ والے حصے پر تو سر کی جلد تک نظر آنے لگی تھی جو بال بچے تھے' وہ بھی بے رونق' کمزور اور بے جان ہوگئے تھے۔ اُسے ہر وقت متلی محسوس ہوتی تھی اور بے انتہا کمزوری بھی' وہ وزن جسے وہ پہلے کم کرنا چاہتی تھی' اب تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ وہ تو بس جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ ساس جن کی کبھی وہ خدمت کیا کرتی تھی' اب اُس کی خدمت کر رہی تھیں۔ وہ عمر رسیدہ اور فربہ ہونے کے باوجود صحت مند تھیں جبکہ وہ خود دائمی مریضہ معلوم ہوتی تھی جس کے سر پر برائے نام بال تھے' بے رونق اور بے جان' چہرے کے ساتھ زرد پیلی رنگت...... آئینے کے سامنے وہ اپنے آپ کو پہچان ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی' اس کے آنسو چہرے کو بھگو رہے تھے۔

''اب کیا ہوگا حسن......؟ اب کیا ہوگا میرے بچوں کا' میرا' کیا میں مر جاؤں گی؟'' وہ زار و قطار رو رہی تھی' اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔

''ہاں اور کھاؤ زہر پھر کہو' میں مروں بھی نہیں' حیاتِ ابدی کے مزے لوٹوں۔'' حسن کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔ اس کا رونا مزید شدت اختیار کر گیا' چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا۔

وہ رو رہی تھی' سسک رہی تھی۔ ''یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ آئندہ میں ان جعلی پیروں' فقیروں اور باباؤں کی باتوں میں نہیں آؤں گی بلکہ دوسروں کو بھی منع کروں گی۔ یا اللہ! اپنے رسولؐ کے صدقے' مجھے معاف کر دے۔ میرے بچوں کو میری ضرورت ہے' مجھ گناہ گار کی دُعا سن لے میرے اللہ! یا اللہ!''

''سائرہ' کیا ہوا؟ کیوں بڑبڑا رہی ہو؟'' حسن نے نیند میں کروٹ بدلی اور اُس کی طرف منہ کرتے ہوئے بولے۔ ''ارے' تم تو پسینے میں شرابور ہو رہی ہو' کیا ہوا تم کو؟'' وہ پریشانی میں اٹھ کر بیٹھ گئے اور اُس کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔ ''کیا ہوا سائرہ' کیا بات ہے؟ آنکھیں تو کھولو جانِ من' کیوں بڑبڑا رہی ہو؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟''

وہ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ ''یا اللہ! مجھے معاف کر دے میرے مولا!'' پسینے سے شرابور وجود کے ساتھ جو اُس نے آنکھیں کھولیں تو سر تا پا پیار لٹاتی آنکھوں کے ساتھ حسن اُس کی نظروں کے سامنے موجود تھا اور اُس کے قدرے فربہ مگر صحت مند وجود کے ساتھ صحت مند چمک دار بال ماتھے اور چہرے کے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں دونوں ہاتھوں سے مَلتے ہوئے سائرہ نے سوچا۔

'اوہ...... تو کیا وہ سب خواب تھا؟ ہاں' یقیناً۔' اُس نے دل میں سوچا۔ 'آج ہی تو مجھے بتول کے ساتھ باباجی کے پاس جانا تھا۔ نہیں...... نہیں...... مجھے کہیں نہیں جانا' میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'

''کیا کہہ رہی ہو جانِ حسن......! تم کیسے ٹھیک ہو؟'' حسن نے مخمور نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سائرہ نے مسکراتے ہوئے حسن کے شانوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

......☆☆......

الماس فاطمہ ارمان

غربت کا سودا

رسا چغتائی کا خیال

ہنگامہ ہائے گرمیِ بازار لے چلے
تہمت سی شے اٹھا کے خریدار لے چلے

زندگی کے بازار میں غربت کے ہاتھوں بکنے والی عورت کا قصہ عبرت



WWW.PAKSOCIETY.COM

میں جو کہانی رقم کر رہی ہوں' یہ ایک غریب لڑکی کی ہے۔ وہ چھ بہنوں میں سب سے بڑی بہن تھی۔ غربت کی چکی میں پسی ہوئی یہ غریب لڑکی غریب آباد کی رہائشی تھی۔ میری ملاقات اُس سے لیاری میں ہوئی تھی جہاں میں اپنی دوست کی بیٹی کی شادی میں گئی تھی۔ وہ میری برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے پہلی نظر میں وہ دکھی اور کھوئی کھوئی سی لگی۔ میں کافی دیر تک اس کے چہرے پر چھائی حسرت اور دکھ کو بغور دیکھتی رہی۔ آخر مجھ سے صبر نہ ہوا اور میں نے اس کے اندر کا دکھ جاننے کے لیے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔ سلام و دُعا کے بعد اُس نے اپنا نام سُنبل بتایا۔ وہ اچھی' خوش شکل تھی۔ چہرے کے نقش و نگار بتا رہے تھے کہ کبھی ہم پر بہار تھی۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میں ایک معمولی سی رائٹر ہوں' چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ لیتی ہوں۔ میری بات پر وہ کھوسی گئی۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے اس کو کریدا۔

''سُنبل......! لگتا ہے' تمہارے اندر بھی کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے؟''

''ہاں! میری کہانی بہت درد بھری ہے۔ کیا تم مجھ پر بیتی لکھوگی؟''

''آف کورس! اس طرح تمہارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔''

پھر سنبل نے فون نمبرز کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جلد ہی آپ کے گھر آؤں گی۔'' ایک مہینہ گزر گیا' اُس روز اس کا فون آیا۔

''الماس! آپ گھر پہ ہیں' میں آ جاؤں؟''

''آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ دوپہر تک وہ میرے گھر پہ موجود تھی۔ لنچ کے بعد میں سنبل کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

''اب تم آرام سے مجھ سے اپنے دل کی تمام باتیں کہہ ڈالو۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر پریشانی سے بولی۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتا' میں کہاں سے شروع کروں؟ کس زبان سے بتاؤں کہ میں کیا ہوں؟''

''تم ریلیکس ہو کر سکون سے سب بتا دو' ٹھیک ہے؟'' میری بات سے اسے حوصلہ ملا اور اس نے کہنا شروع کیا۔

''میرے ابا لالوکھیت میں حلیم اور چاول کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ ان کی کمائی سے اماں نے کمیٹی ڈال کر ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ اماں' ابا کا برابر سے ساتھ دیتیں۔ اماں کی تلے اوپر سات بیٹیاں ہوئیں۔ ہر سال بیٹے کی آرزو میں سات بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اماں جوڑوں کے مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ سارا دن ہائے ہائے کرتیں اور ہم بہنوں کو گالیوں اور کوسنوں سے نوازتی رہتیں۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا' ہم چار بہنیں جوان ہو گئیں تو مہنگائی اور غربت سے ابا کی کمر اور جھک گئی۔ ابا دن رات محنت کرنے سے بیمار رہنے لگے تھے۔ رمضان کے مہینے میں ابا کا ٹھیلا بند رہتا تو وہ گلی گلی ٹھیلے پر سبزی فروخت کرتے۔

اُن دنوں رمضان ہی تھے' پندرہویں روزے کو ابا گھر سے نکلے تو اُن کی طبیعت ناساز تھی۔ اُن کے سینے میں ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا' میں نے اور اماں نے انہیں کہا کہ مت جاؤ مگر وہ جانتے تھے' شام کا چولہا بھی جلنا ہے اسی لیے وہ ٹھیلا لے کر نکل گئے۔ شام پانچ بج گئے' ابا نہیں آئے۔ ہم سب کا روزہ بھی تھا۔ وہ ٹھیلا لے کر آتے تو ہمارے لیے پھل فروٹ بھی ساتھ لے کر آتے پھر روزے کا ہی ٹائم ہو گیا۔ ہم نے جیسے تیسے روزہ کھولا پھر رات ہوئی۔ اماں پڑوس میں خالہ سلیمہ کے گھر گئیں کہ ابا کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں کیونکہ اُن کے میاں بھی سبزی کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ رات بارہ بجے اچانک گلی میں شور اٹھا' تب ہمیں یہ روح فرسا خبر ملی کہ ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور اُن کا جنازہ آیا تھا۔ پورا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ سات بیٹیوں کا باپ دنیا چھوڑ کر اور اپنی بیٹیوں کو یتیم کر کے منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔

کچھ روز تک محلے والوں نے ہماری مدد کی پھر گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگی۔ میں سب سے بڑی تھی' چنانچہ میں نے اماں سے کہا۔

''مجھے اور سونیا کو کسی فیکٹری میں کام کرنے دیں۔'' اماں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا' اُن کی خاموشی ہمارے لیے اجازت نامہ تھا۔ میں نے پڑوس میں سلیمہ خالہ سے کہا کہ مجھے اور سونیا کو بھی کسی فیکٹری میں کام دلا دیں' انہوں نے ہمیں فیکٹری میں لگوا دیا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ ہم دونوں بہنیں محنت سے کام کرتے تھے۔ کچھ روز سے میں محسوس کر رہی تھی کہ فیکٹری کا سپروائزر مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں اپنے کام سے کام رکھتی تھی مگر سپروائزر یوسف مجھ سے قریب ہونے کے بہانے ڈھونڈتا۔ ایک دن کھانے کے ٹائم پر اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں ڈرتے ہوئے گئی۔

یوسف نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''سنبل......! آج تم کھانے میں کیا لائی ہو؟''

''سر...... آلو پالک کی ترکاری ہے۔''

''اچھا' تم اپنا کھانا مجھے بھیج دو اور میرا کھانا جو آرڈر سے منگایا ہے' کھا لو۔ میں گھر کا کھانا کھانے کے لیے ترس گیا ہوں۔'' میں نے اپنا کھانا یوسف کو بھیج دیا۔ اس طرح یوسف سے راہ و رسم کا آغاز ہو گیا۔

یوسف ایک خوبصورت اور ایسا پرکشش لڑکا تھا جس کے لیے ہر لڑکی متلاشی ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجھے بھی یوسف سے لگاؤ ہو گیا۔ ایک دن میں اس کے کمرے میں کھانا دینے گئی' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سنبل......! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو' کیا ہم تم کہیں باہر مل سکتے ہیں؟''

''یوسف......! تمہیں پتا ہے' میرے ساتھ میری بہن سونیا بھی ہوتی ہے؟''

''ارے' تم سونیا کی فکر مت کرو' میرا دوست عاطف' سونیا کو پسند کرتا ہے اور وہ دونوں بھی اکیلے میں باہر ملنا چاہتے ہیں۔''

عاطف ہمارا انچارج تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ سونیا کو پسند کرتا ہے۔ میں نے سونیا سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''باجی......! میں نے کبھی عاطف سے بات نہیں کی مگر وہ مجھے ہر روز پرچی تھما دیتا ہے جس پر یہی لکھا ہوتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں' تم مجھ سے کہیں باہر ملو مگر باجی......! آپ کو کس نے بتایا؟''

''مجھے یوسف نے بتایا ہے کیونکہ یوسف کا بھی میرے لیے یہی حال ہے' وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' ٹھیک ہے سونیا' تم' عاطف اور میں' یوسف سے مل کر دیکھتی ہوں۔'' سونیا خوشی سے سرشار تھی۔

دوسرے دن میں نے یوسف کو کہا کہ میں اور سونیا باہر جانے کے لیے تیار ہیں مگر کام کا کیا ہوگا؟

''وہ ہم سنبھال لیں گے' تم آس پاس کام کرنے والی عورتوں کو بتا دینا' ہم کل نہیں آئیں گے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم نے اسی طرح کیا' دوسرے دن ہم بہنیں تیار ہو کر گھر سے نکلے۔ عاطف اور یوسف مخصوص جگہ پر ہمارے منتظر تھے۔ وہ ایک کار میں تھے۔ وہ گاڑی سے ایسے راستے سے لے کر جا رہے تھے کہ پتا نہیں چل سکا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ خاصی دیر بعد آبادی سے بہت دور سنسان جگہ پر ایک عمارت کے قریب انہوں نے گاڑی روکی اور پھر کچھ دیر بعد ہم اس عمارت کے ایک فلیٹ میں تھے۔ وہ تین کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ ایک کمرے میں سونیا اور عاطف تھے جبکہ دوسرے کمرے میں یوسف اور میں۔ فلیٹ میں ہر چیز موجود تھی۔ کچھ دیر بعد یوسف کولڈ ڈرنک لے آیا جسے پی کر میں مدہوش ہوگئی۔ سونیا کے ساتھ بھی یہی ہوا اور پھر ہم دونوں یوسف اور عاطف کے ہاتھوں لٹ گئے۔ شام میں ہمیں ہوش آیا تو یوسف اور عاطف کے علاوہ دو آدمی اور تھے جن میں ایک فیکٹری کا منیجر اور دوسرا کوئی اجنبی تھا جسے میں نہیں جانتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا جس سے اس نے ہماری عزت پامال ہونے کا تمام منظر فلم بند کر لیا تھا۔ جب ہم ہوش میں آئے تو غصے سے ہمارا برا حال تھا۔ ہم نے یوسف اور عاطف کو گریبان سے پکڑ لیا' مجھ سے زیادہ سونیا پاگل ہو رہی تھی' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عاطف کو جان سے مار دیتی۔ ان دونوں نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر تم نے کسی کو کچھ بتایا تو ہم یہ فلم سب کو دکھا دیں گے پھر تم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گی۔ ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔

"ٹھیک ہے' ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب تم بہنیں فیکٹری نہیں جاؤ گی بلکہ صبح تیار ہو کر ہمارے ساتھ اسی فلیٹ پر آؤ گی' تم اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ عاطف تمہیں گاڑی میں تمہارے گھر کے پاس چھوڑ دے گا۔" میں نے اور سونیا نے اپنا حلیہ درست کیا۔

یوسف نے مجھے اور سونیا کو دو دو ہزار روپے تھماتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' تم پورے مہینے بھی محنت کر کے اتنا نہیں کما سکتی ہو۔ ہمارے کہنے پر چلو گی تو تم اپنے گھر کی حالت بدل سکتی ہو۔"

اُس وقت سونیا اور میں ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ گھر آ کر میں نے ہمت کر کے سونیا کو تسلی دی۔

"تم پریشان نہ ہو۔ میں ان کے لیے کام کروں گی۔ اگر ہم نے ان کے خلاف آواز اٹھائی تو ہمارے ساتھ ساتھ ہماری چھوٹی بہنوں کی زندگی اور عزت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"آپا......! مجھے لگتا ہے' یہ پورا گینگ ہے جو ہم جیسی "معصوم لڑکیوں" کو پھانس کر یہ دھندہ کر رہا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو سونیا' مگر اب تم نہیں جاؤ گی' صرف میں ان کا ساتھ دوں گی۔"

"نہیں آپا......! میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" پھر میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ صبح مجھ سے پہلے تیار ہو کر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

ہم دونوں بہنیں یوسف کے بتائے ہوئے راستے پر کھڑے ہو گئے۔ ٹھیک گیارہ بجے عاطف گاڑی لے کر آ گیا۔ فلیٹ پر جانے کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے۔ آج فیکٹری کے منیجر کی جگہ دو لڑکے کمرے میں موجود تھے جو کسی امیر فیملی کے بگڑے ہوئے نوجوان تھے' ان کے پاس شراب کی بوتل بھی تھی جسے وہ کولڈ ڈرنک ملا کر پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں یوسف کے ساتھ ایک لڑکی نمودار ہوئی جس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے کہا۔

"تم میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آؤ۔"

"نہیں' میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"اٹھ حرام زادی...... تجھے میں قتل نہیں کر رہی' یوسف نے کہا ہے تجھے تیار کرنے کو' آج تجھے بتاؤں گی' روز تجھے تیار ہو کر کمرے میں آنا ہوگا۔" اس نے میری کلائی پکڑی اور کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں سونیا تیار ہو رہی تھی۔ سونیا پر میری نظر پڑی تو شرم کے مارے سردی میں بھی میرے پسینے چھوٹ گئے' سونیا کا لباس اتنا مختصر تھا جس کا پہننا' نہ پہننا برابر تھا۔

"آپا......! آپ بھی میری طرح خاموشی سے تیار ہو جائیے' کیا فائدہ شہلا آپ کو گالیوں سے نوازے۔" شہلا اس لڑکی کا نام تھا جو مجھے پہلے ہی گالی سے نواز چکی تھی۔ سونیا میک اپ کے بعد اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ جب میرے کپڑے آئے تو وہ بھی سونیا سے مختلف نہیں تھے۔ میں نے منع کیا تو شہلا نے قدرے پیار سے کہا۔

"دیکھو سنبل......! میں بھی تمہاری طرح ان لوگوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی ایک غریب لڑکی ہوں' میری ماں ہسپتال میں زندگی اور موت سے لڑ رہی ہے' اسے کینسر ہے جس کا علاج بہت مہنگا ہے' اسی لیے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ عزت سے پیسا نہیں ملتا تو ہم جیسی لڑکیاں اپنے جسم کا سودا کر کے گھر کو چلانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم نے یوسف کا کہنا نہ مانا تو وہ ہمارے منہ پر تیزاب پھینک کر ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گا۔ میں نے چار لڑکیوں کا انجام دیکھا ہے۔ باغی ہونے پر یوسف نے ان زندہ پر تیزاب ڈال کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آج تک کوئی یوسف جیسے درندے کو پکڑ نہ سکا۔ یوسف اس گینگ کا سربراہ ہے' بڑے بڑے لوگ اس کے پیچھے ہیں۔ اس فلیٹ کے علاوہ اور بھی فلیٹس ہیں جہاں لڑکیاں دھندہ کرتی ہیں۔"

یہ تمام باتیں سن کر میرے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ شہلا نے میری حالت کو دیکھتے ہوئے پاس رکھے جگ سے مجھے پانی پلایا اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں میری جب ضرورت پڑے' اس نمبر پر فون کر کے مجھ سے بات کر سکتی ہو۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گی۔

سونیا الگ کمرے میں چلی گئی تھی اور میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ دونوں لڑکے نشے میں مدہوش ٹی وی پر فحش فلم دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں عمر میں مجھ سے بھی چھوٹے تھے' وہ مجھے دیکھتے ہی پاگلوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ شام تک وہ مجھے نوچتے رہے۔ جب ان کا دل بھر گیا تو وہ چلے گئے اور میں اپنی بدبختی پر آنسو بہانے لگی۔ رو دھو کر خود کو سنبھالا۔ کچھ دیر بعد یوسف آ گیا اور ہم دونوں بہنوں کو دو دو ہزار روپے تھما دیئے۔

اب یہ ہمارا معمول بن گیا' ہم روز اسی طرح گھر سے نکلتے اور شام گئے لوٹتے۔ ماں نے کتنی دفعہ پوچھا کہ یہ کیسا کام ہے جو اتنی دیر میں آتی ہو؟ ہم نے ماں کو تسلی دی کہ ہم اوور ٹائم لگاتے ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ پیسے کما کر گھر کے حالات بہتر بنا سکیں۔

عزت کے بدلے آنے والی رقم سے ہمارے گھر کے حالات اچھے ہونے لگے۔ وقت گزرتا رہا اور چھوٹی بہنیں بھی بڑی ہو گئیں۔ ثمینہ اور نازو کے محلے میں سے رشتے آنے لگے۔ میں نے اماں سے کہا کہ ان کی شادی کر دو۔ میں نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہتی تھی' اُن کا انجام ہماری طرح ہو۔ اس طرح میں نے اور سونیا نے لڑکوں کو پسند کر کے دونوں بہنوں کی شادی عزت کے ساتھ کر دی۔ ابھی تین بہنیں اور تھیں جن کی فکر مجھے اور سونیا کو تھی۔ اماں چاہتی تھیں' پہلے ہماری شادی ہو جائے' میرے اور سونیا کے بھی رشتے آئے مگر ہم دونوں نے اماں کو سمجھایا کہ اگر ہم شادی کر کے بیٹھ گئے تو گھر اور چھوٹی بہنوں کا کیا ہو گا؟ وقت کا پہیہ تیزی سے گھومتا گیا۔ اس دوران جانے کب سونیا کو انجکشن کے نشے کی لت لگ گئی' شاید وہ اس طرح اپنا غم بھولنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانی' اس کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ بہر حال اسی طرح پانچ سال گزر گئے' ہمارے گھر کے حالات روز بروز بہتر ہوتے چلے گئے۔ ہمارا گھر پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ صائمہ اور روبی کی بھی شادی ہو گئی۔ چھوٹی بہن کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا لٰہذا اسے پڑھنے دیا گیا۔

ایک دن یوسف' عاطف اور شہلا فلیٹ پر آئے تو کچھ پریشان سے تھے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''سنبل......! ہم کچھ دن کے لیے لاہور جا رہے ہیں۔ کچھ لڑکیاں خرید کر لانا ہیں۔ جب تک ہم نہیں آ جاتے' تم ہر چیز کا خیال رکھو گی۔ فلیٹ کی چابی سونیا کے پاس ہے' اس کا بھی خیال کرو۔ وہ بہت زیادہ نشہ کرنے لگی ہے۔'' ان کے جانے کے تیسرے دن جناح اسپتال سے فون آیا کہ ان تینوں کا راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ جناح ہسپتال میں ہیں۔ سونیا اور میں پہنچے تو پتا چلا کہ عاطف اور شہلا مر چکے تھے جبکہ یوسف ICU میں تھا۔

یوسف کی موت پر سونیا اتنا روئی جیسے وہ اس کا سہاگ تھا۔ شاید وہ اب بھی عاطف سے پیار کرتی تھی۔ جب یوسف کو ہوش آیا تو میں ہی اس کے قریب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''مجھے معاف کر دو سنبل......! میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں تو معافی کے قابل بھی نہیں ہوں۔ خدا بھی شاید مجھے معاف نہ کرے مگر مجھے حالات نے ایسا بنا دیا۔ میں بھی اچھی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔''

میں چپ چاپ یوسف کی باتیں سن رہی تھی' اس سے کیا کہتی کیونکہ عورت ایک بار کسی سے محبت کرتی ہے تو پھر ہمیشہ اس کے دل میں وہ محبت رہتی ہے۔ میں بھی یوسف سے اب بھی محبت کرتی تھی۔ ایک ہفتہ بعد یوسف بھی دنیا چھوڑ گیا۔ کچھ دن گزرنے پر میں نے فلیٹ فروخت کر دیا اور اماں سے کہا کہ غریب آباد کا گھر بیچ کر ہم کسی اور جگہ گھر لے لیتے ہیں۔ اس طرح ہم نے لیاری میں پلاٹ لیا اور اچھا سا گھر بنوایا۔ ایک فلور پر اماں کو ایک مدرسہ بنوا دیا۔ اب اماں تمام دن غریب بچوں کو قرآن کی مفت تعلیم دیتی ہیں اور اپنی دنیا میں مگن رہتی ہیں۔ چھوٹی بہن صفیہ دو سال بعد ڈاکٹر بن جائے گی۔ ہاں' سونیا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ بس میں زندہ ہوں' دیکھیے میری زندگی کا اختتام کب ہوتا ہے۔ بیتے دنوں کو میں بھولنا چاہتی ہوں مگر بھلا نہیں پاتی۔ بس اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرتی اور دُعا کرتی ہوں۔ خدا ہر غریب کی بیٹی کی عزت سلامت رکھے اور بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔ اب میرا صرف ایک ہی خواب ہے کہ میرا رب میری بہن صفیہ کو جلدی سے ڈاکٹر بنا دے پھر میں سکون سے مر سکوں۔

......☆☆......

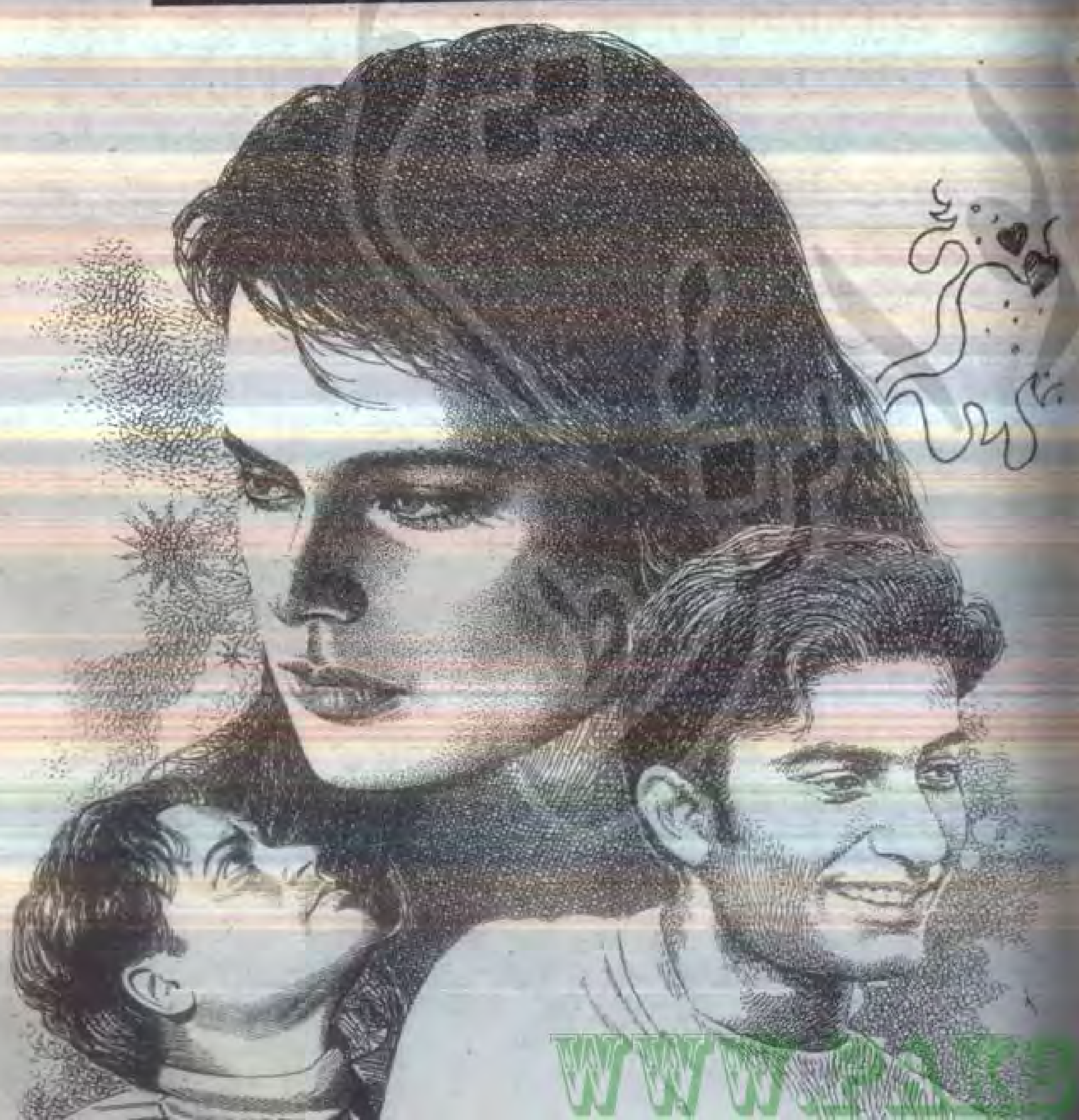
نسیم سحر

ایسی دیوانگی نہ دیکھی

طلعت اخلاق احمد کا خیال

آؤ ہم چاہتوں کی کاشت کریں
پت جھڑوں کے عذاب رہنے دو

شہر محبت میں شان سے جینے والوں کی ایک یادگار کہانی



WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت دن ہوگئے تھے' وقار بھائی ہمارے گھر نہیں آرہے تھے۔ میں نے رضی بھائی سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وقار آج کل مصروف ہے اور پریشان بھی۔

وقار بھائی ہمارے محلے میں رہتے تھے اور ہمارے رضی بھائی کے بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے اسکول' کالج ساتھ ہی پڑھا تھا۔ دونوں گھرانوں کے افراد کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ وقار بھائی کی کوئی بہن نہیں تھی' ایک بھائی نادر تھا۔ وہ ہمیں اپنی سگی بہنوں کی طرح سمجھتے تھے۔ ہمارا اُن کے گھرانے سے تعلق رشتے داروں سے بڑھ کے تھا۔ وقار بھائی بہت سلجھی ہوئی طبیعت کے نرم خُو انسان تھے۔ ہر ایک کی مدد کرنا' لوگوں کے کام آنا اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ جب وقار بھائی کالج میں تھے تو ہم نے سنا تھا کہ کوئی لڑکی اُن کو پسند کرنے لگی ہے۔ یہ بات رضی بھائی نے ہمیں بتائی تو ہم بہت حیران ہوئے تھے کیونکہ وقار بھائی ان چیزوں سے کوسوں دور تھے۔ اُس روز جب وقار بھائی گھر آئے تو میں نے اُن کو چھیڑا۔

''وقار بھائی......! کیا چکر ہے' یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟''

''کیا بات ہے؟ کیا سنا ہے؟'' انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''اوہو' اب بنیں نہیں' سب پتا ہے مجھے۔'' میں نے رضی بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے رضی بھائی کی طرف دیکھا تو رضی بھائی نے آنکھوں آنکھوں میں انہیں اشارتاً کچھ کہا جس پر وقار بھائی سٹپٹا گئے۔

''وہ......وہ......'' اُن کے منہ سے نکلا۔

''ارے بھئی' اب بتا بھی دیں' آخر ہم ہی کام آئیں گے۔ آخر خالہ کو کون منائے گا؟'' میں نے شرارت سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں' جب ہوگی' بتا دوں گا۔'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

دن گزرتے رہے' رضی بھائی اور وقار بھائی دونوں نے تعلیم مکمل کی اور پھر عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔ ملازمت ملتے ہی امی نے رضی بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کردیں' جلد ہی ایک لڑکی پسند آگئی اور ہم نے شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔ اپنے دوست کی شادی میں وقار بھائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہر کام آگے بڑھ بڑھ کر انجام دیا۔ پوری شادی کے دوران ہم انہیں چھیڑتے رہے کہ چاہیں تو آپ بھی کوئی لڑکی پسند کرلیں مگر ہماری چھیڑ چھاڑ پر وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے۔ ہمارے بھائی کی شادی کے بعد اب وقار بھائی کی امی یعنی خالہ بھی چاہتی تھیں کہ وہ اُن کی بھی شادی کردیں۔ خالہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر انہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتائیں ورنہ پھر وہ اپنی پسند سے کردیں گی۔ کچھ دنوں بعد ہم نے سنا کہ اس کالج والی لڑکی نے خود ہی وقار بھائی کو پروپوز کردیا کیونکہ اُس نے ابھی تک اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مسلسل فون کرتی تھی اور ملنے کا بھی اصرار کرتی۔ اس کا نام آمنہ تھا۔ خوبصورت اور اچھے خاندان کی تھی۔ پڑھی لکھی تھی اور وقار بھائی کو دیوانگی کی حد تک پسند کرتی تھی۔ وہ جتنی جذباتی تھی' وقار بھائی اتنے ہی ٹھہرے ہوئے مزاج کے تھے۔ کم گو اور سادہ طبیعت کے مالک حالانکہ کالج میں کئی لڑکیوں نے اُن کے قریب ہونے کی کوشش کی مگر اُن کی سرد مہری دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی تھیں مگر آمنہ تو دیوانی تھی' اُس نے کالج کے بعد بھی اُن سے رابطہ رکھا اور آخر ایک دن اُس نے

انہیں پروپوز کردیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر وہ شادی نہیں کریں گے تو وہ خودکشی کرلے گی۔ اس صورتِ حال میں وقار بھائی کا پریشان ہونا فطری تھا۔ انہوں نے ماں کو بتایا۔ ماں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا' وہ رشتہ لے کر گئیں۔ جب دونوں طرف پسندیدگی تھی تو پھر کیا مسئلہ' جلد ہی دونوں کی شادی ہوگئی اور آمنہ بیاہ کر وقار بھائی کے گھر آگئی۔ وہ اچھی بیوی اور سگھڑ بہو ثابت ہوئی تھی۔ خالہ کو اُس سے کوئی شکایت نہ تھی اور وقار بھائی کی تو وہ دیوانی تھی' وہ ایک منٹ بھی اُن کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وقار بھائی آفس میں ہوتے تو وہ بہانے بہانے سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد فون کرتی۔ جب اُن کے گھر آنے کا ٹائم ہوتا تو تیار ہوکر دروازے پہ ہی کھڑی ہوجاتی۔ اُن کی پسند' ناپسند کا خیال رکھتی۔ غرض کہ بس خالہ حیران تھیں کہ وہ اُن کے بیٹے کو اتنا چاہتی ہے۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور اُن دونوں کی شادی کو تین سال ہوگئے۔ وقار بھائی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی جبکہ اس عرصے میں رضی بھائی کے دو بچے ہوگئے تھے۔ جب گھر کا آنگن سُونا رہا اور رشتے داروں میں بھی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں تو خالہ کو بھی احساس ہوا' اُن کی بھی خواہش تھی کہ گھر میں پوتا' پوتی کی رونق آئے۔ وقار بھائی کو بھی بیٹی کی خواہش تھی کیونکہ اُن کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ایک روز خالہ نے باتوں باتوں میں آمنہ سے ہسپتال چلنے کا کہا تو وہ ہنس کر ٹال گئی۔ اس طرح مزید دو سال گزر گئے۔ آمنہ میڈیکل چیک اپ کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھی اور اس معاملے میں وہ اپنے محبوب شوہر وقار بھائی کا کہنا بھی نہیں مان رہی تھی۔

اُن دنوں وقار بھائی کو چند دنوں کے لیے آفس کے کام سے شہر سے باہر جانا پڑا۔ آمنہ بھی اُن کے ساتھ چلی گئی۔ گھر میں خالہ اور نادرہ رہ گئے۔ خالہ کئی دنوں سے گھر کی صفائی کا سوچ رہی تھیں۔ اب اُن کے جانے کے بعد خالہ نے سوچا کہ کمرے خالی ہیں تو صفائی کرلی جائے۔ انہوں نے ماسی کے ساتھ کمروں وغیرہ کی صفائی شروع کردی' پردے وغیرہ بدلوائے' آمنہ کے کمرے میں ماسی سے بیڈ وغیرہ بھی صاف کرنے کا کہا۔ ماسی نے جھٹکنے کے لیے جیسے ہی بیڈ کا گدا اٹھایا تو اس میں سے ٹیبلیٹس کے پتے گرے۔ خالہ نے جھک کر اٹھائے تو حیرت سے اُن دوائیوں کو دیکھنے لگیں۔ شام میں وہ اُن گولیوں کو قریبی میڈیکل اسٹور پر لے گئیں تو اُن پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ یہ مانع حمل گولیاں تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اُن کی بہو آمنہ یہ حرکت بھی کرسکتی ہے۔ اب وہ بے چینی سے بہو بیٹے کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ روز بعد جب وہ دونوں واپس آئے تو انہوں نے قدرے نرمی سے اُن دوائیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔

''میں اپنے اور وقار کے بیچ میں کسی کو بھی برداشت نہیں کرسکتی اسی لیے یہ دوائیاں استعمال کرتی ہوں۔''

''کیا......؟'' وقار بھائی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''مگر وہ ہماری اولاد ہوگی۔''

''کوئی بھی ہو۔'' آمنہ کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا' پاگل ہوگئی ہو؟'' وقار نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

یہ بات جب آمنہ کے گھر والوں تک پہنچی تو انہوں نے بھی بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ آخر وقار بھائی نے اس سے بات چیت بند کردی۔ آمنہ سے اپنے محبوب شوہر کی بے رخی برداشت نہ ہوئی لہٰذا اسے اولاد کے لیے راضی ہونا پڑا۔ آخر اللہ کے فضل و کرم سے چند ماہ بعد گھر میں یہ خوشی کی خبر گونجی کہ آمنہ امید سے ہے۔ وقار بھائی بے حد خوش تھے۔ خالہ کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ آمنہ کے گھر والے بھی خوش تھے' غرض سب ہی نہال تھے سوائے آمنہ کے' وہ خاموش سی ہوگئی تھی۔ سب نے وقتی غصہ سمجھ کر اُس کی خاموشی پر خاص توجہ نہیں دی البتہ اُس کا خیال رکھنے لگے مگر آمنہ دن بہ دن کمزور ہونے لگی حالانکہ ڈاکٹر اُس کا مستقل چیک اپ کر رہی تھی اور اُسے اچھی غذا فراہم کی جا رہی تھی۔ حمل کے پانچویں ماہ میں الٹراساؤنڈ کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکی ہے۔ وقار بھائی بہت خوش ہوئے۔ تھوڑے دن اور گزرے تو آمنہ کی حالت خراب ہونے لگی' اُس سے کچھ کھایا پیا ہی نہیں جاتا تھا' کمزوری انتہا کی ہوگئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ سب ہی اُس کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ آٹھویں ماہ اُس کی حالت مزید بگڑنے لگی تو اُسے ہاسپٹل میں داخل کرانا پڑا' تب پتا چلا کہ اُس نے مسلسل کئی سال جو مانع حمل گولیاں کھائی تھیں' ان ہی کی وجہ سے اندرونی پیچیدگی ہوگئی تھی۔ آمنہ رونے لگی تھی' اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ بچے اور وقار کے ساتھ بھی بہت زیادتی کی تھی۔ ڈاکٹر کو خدشہ تھا کہ ہونے والی بچی ایب نارمل ہو یا ماں اور بچے کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ سب ہی پریشان تھے' سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ جیسے جیسے ڈیلیوری کے دن قریب آرہے تھے' آمنہ پر گھبراہٹ طاری ہورہی تھی' وہ روتی جاتی تھی اور سب سے معافی مانگتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر زیادہ پرامید نہیں تھے۔ خالہ اور آمنہ کی امی نمازیں پڑھ کر دُعائیں کررہی تھیں۔

ایک صبح آمنہ کی حالت بگڑنے لگی تو اُس کو لیبر روم لے جایا گیا۔ اُس وقت میکے اور سسرال کے سب لوگ جمع ہوگئے اور دُعائیں کرنے لگے۔ تقریباً چار' پانچ گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد تھکی تھکی سی ڈاکٹر باہر آئی تو سب ہی بے قراری سے اُس کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی کہ ماں اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ اس خبر پر سب ہی نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ وقار بھائی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ وہ اپنے مہربان رَب کا شکر اَدا کرنے لگے۔ واقعی اللہ کا کرم تھا کہ دونوں ماں بیٹی بچ گئی تھیں۔

آج وہ بچی ماشاء اللہ ایک سال کی ہے اور آمنہ اُسے بے حد پیار کرتی ہے۔ پہلے اُس نے ممتا کے جذبے کو محسوس ہی نہیں کیا تھا مگر جب وہ حمل سے ڈیلیوری تک کے مراحل سے گزری' اس تکلیف نے اُسے باور کرایا کہ دنیا میں محبت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں' صرف وہی محبت نہیں ہوتی جو وہ وقار سے کرتی تھی بلکہ ممتا کی محبت بھی خاص رتبہ رکھتی ہے۔ وقار کی محبت نے اُسے یہ رتبہ دلایا تھا۔ وہ اب بھی وقار بھائی سے بہت محبت کرتی ہے مگر جذباتی انداز میں نہیں اور وقار بھائی بھی پہلے سے زیادہ اُس کا خیال رکھتے ہیں اور وہ دونوں مل کر اپنی بیٹی کا۔ خالہ بھی بہت خوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی پاگل بہو کو بے حد چاہتی ہیں جو اُن کے بیٹے کی دیوانی ہے۔

......☆☆......

جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

پروین حیدر

رزقِ آتش

پروین حیدر کا ہی خیال

کرب ملے ہیں ضبط سے بڑھ کے
لمحہ عمر ہے، عرصہ ماتم

سانحہ عباس ٹاؤن سے مربوط ایک غم آلود، زندہ کہانی



WWW.PAKSOCIETY.COM

ساری عمر ہجوم سے بچ کر رہنے والا اتنے پر ہجوم لوگوں کے کاندھوں پر اپنی آخری منزل تک جائے گا' یہ تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ کتنی آوازیں ہوں گی جو بامِ عرش تک گئی ہوں گی' کتنی سسکیاں ہوں گی جو در و دیوار سے نکل کر سُو بہ سُو پھیل رہی ہوں گی' جہاں کچھ دیر پہلے زندگی نے خیمے لگائے ہوئے تھے' اَب وہاں موت کا رقص ہے' کون جانے یہ رقصِ مرگ کب تھمے گا اور کب زندگی اپنے ہونے کا جشن منائے گی۔

لیلیٰ سے میری شناسائی اٹھارہ برس پہلے ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ اُس کی شخصیت میں ایک وقار اور کشش تھی' اُس کی دونوں بیٹیاں فاہم اور فرنام بالترتیب چھ اور آٹھ سال کی تھیں' بہت خوبصورت اور شرارتی! تقریب کے اختتام پر جب ہم ایک دوسرے سے رخصت لے رہے تھے تو یہ حیران کن انکشاف ہوا تھا کہ لیلیٰ ہمارے ہی ایریا میں اور ہمارے گھر سے نزدیک مقیم ہے۔ لیلیٰ کے شوہر عابد بھائی میرے میاں مسعود سے آشنا تھے کہ...... مسعود نیشنل بینک ڈیوٹی فری شاپس برانچ میں تھے اور عابد بھائی پی آئی اے میں جاب کررہے تھے۔

لیلیٰ کے گھر آنا جانا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ چار افراد پر مشتمل یہ فیملی ہر طرح آسودہ اور سیٹ ہے۔ ایک دو ملاقاتوں میں کھلا کہ یہ فیملی بھی ہماری فیملی کی طرح اپنے خونی رشتوں کی ڈسی ہوئی تھی' اس لیے اُن لوگوں کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا اور محلے میں بھی زیادہ علیک سلیک نہیں تھی۔ جب اُن سے ہماری فیملی کا تعارف ہوا تو لیلیٰ نے اپنی بچیوں سے مجھے چھوٹی خالہ کہلوایا تھا۔ فاہم اور فرنام کی ہی ہم عمر' میری دونوں بیٹیاں یسریٰ اور کسریٰ بھی تھیں جبکہ میرے دونوں بیٹے' بیٹیوں سے بڑے تھے۔

جب تک ہمارے بچے چھوٹے تھے' ہم مہینے' پندرہ دن میں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہے مگر بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے' اُن کے کام پھیلتے گئے اور ہم لوگوں کی مصروفیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیلیٰ اور میں دنیاداری سے زیادہ گھر داری کو ترجیح دیتے تھے' سو ہم اَب اکثر ٹیلی فون پر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرلیتے تھے' کبھی اس کی بیٹیاں میری بیٹیوں سے ملنے آجاتی تھیں تو کبھی میری بچیاں مسعود کے ساتھ لیلیٰ کے گھر چلی جاتیں' مسعود کی عابد بھائی سے خوب بنتی تھی اس لیے وہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی اچھی کمپنی دیتے تھے۔

ہم لوگ اُن دنوں اسکیم 33 میں رہائش پذیر تھے۔ بیس سال پہلے وہ جگہ شہر کے ہنگاموں سے دور اور بہت پرسکون تھی' آبادی بھی اتنی گنجان نہیں تھی' زیادہ تر بنگلے زیرِ تعمیر تھے...... دس سال بعد جب آبادی غیر معمولی ہوگئی اور ہر قسم کے ٹریفک کی وجہ سے وہاں شور شرابہ بھی رہنے لگا' تب ایک دن لیلیٰ نے بتایا کہ...... عابد بھائی اپنا یہ گھر سیل کرکے یہاں سے اور آگے جہاں چند ہی بنگلے آباد ہوئے ہیں' جانا چاہتے ہیں۔ اسی دوران میں لیلیٰ نے مجھے پہلی بار یہ بتایا تھا کہ عابد بھائی جو بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں' بچپن سے ہی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں اور کبھی کبھی اُن پر ڈپریشن کا دورہ سا پڑتا ہے' انہیں ہجوم' شور اور گنجان جگہوں سے وحشت ہوتی ہے اسی لیے جیسے جیسے یہاں آبادی بڑھتی جارہی ہے' ویسے ویسے عابد کا یہ علاقہ چھوڑ کر کسی نئی بستی میں چل کے رہنے کا اصرار زور پکڑتا جارہا ہے۔

میں نے مسعود سے کہا تھا کہ آپ عابد بھائی کو سمجھائیں' اس ایریا میں سب سے خوبصورت بنگلہ انہی لوگوں کا ہے۔ بچیوں کا اسکول اور کالج بھی زیادہ دور نہیں ہے' اتنے اچھے گھر کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہونا جبکہ شہر کے حالات بھی ٹھیک نہیں رہتے' مناسب نہیں ہے...... مسعود نے انہیں کافی کنوینس کیا مگر اُلجھے اُلجھے' کھوئے کھوئے سے عابد بھائی تو جانے کا پکا ارادہ کرچکے تھے۔

میں نے اور مسعود نے یہ بات محسوس کی تھی کہ اُن کے ذہن میں کوئی نفسیاتی گرہ ہے جو انہیں بیٹھے بیٹھے گرد و پیش سے بھی بےگانہ کردیتی ہے اور کبھی کبھی وہ غیر حاضر دماغ بھی ہوجاتے ہیں...... لیلیٰ نے اُن کی جو داستان سنائی' وہ کچھ یوں تھی۔

''عابد بھائی جب چار سال کے تھے' تب اُن کے والد روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کرگئے تھے۔ اُن کی والدہ اُس وقت بالکل نوجوان تھیں' یہی کوئی پچیس' چھبیس سال عمر تھی اُن کی' بیوہ ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی اُن کے سسرالی رشتے داروں نے انہیں منحوس اور جنم جلی جیسے خطابات سے نوازنا شروع کردیا تھا۔ عابد بھائی کی والدہ پڑھی لکھی تھیں' شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے بینک میں اپلائی کیا اور انہیں آسانی سے بینک میں جاب مل گئی۔ سسرال میں اُن کا گھر سے نکلنا یعنی جاب کرنا (جبکہ ایک چھوٹے سے بچے کی کفالت بھی انہی کی ذمے داری تھی۔) پسند نہیں کیا گیا اور انہیں تنگ کرنے کا ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جس سے گھبرا کر وہ سسرال سے چلی جائیں اور ایسا ہی ہوا' وہ اپنے میکے چلی آئیں۔ میکہ بھی کوئی اتنا پرسکون جائے امان ثابت نہیں ہوا۔ عابد بھائی کی نانی کا سلوک اپنے ہر بچے کے ساتھ معاندانہ اور طنز بھرا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے دس بچے ایک دوسرے سے بدظن تھے' طعنہ تشنہ' طنز' بدزبانی' یہ وہ رویے تھے جو ان کی نانی سے اُن کے تمام بیٹوں اور بیٹیوں میں منتقل ہوئے تھے' یہاں اُن کے بھائیوں' بھاوجوں کے طنز' بیوگی کے طعنے اور پھر نانی کی بدزبانی نے تین سال ان دونوں ماں بیٹوں کو عذاب میں مبتلا رکھا تھا' خصوصاً عابد بھائی کے ساتھ تمام گھر والوں نے اچھوتوں والا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ اُن سے کوئی کھانا کھانے تک کے لیے کہنے کا روادار نہ تھا۔ اُن کی والدہ بینک سے آکر انہیں کھانا کھلاتیں' اُن کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنا اُن کی ماں نے اپنا ایمان بنالیا تھا مگر برا ہو اس بےحس معاشرے اور اس میں بسنے والے لوگوں کا کہ ایک یتیم بچے کی دلجوئی کرنے کے بجائے اُسے ہجوم نے اتنا تنہا کردیا کہ وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا اور پھر اسی دوران میں عابد بھائی کی والدہ نے اپنے بینک ہی کے ایک کولیگ رضی احمد صاحب (جن کی بیوی تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر سفرِ آخرت پر جاچکی تھیں۔) کے پروپوزل کو اپنے بھائیوں کے سامنے رکھا تھا۔ بھائی بھاوج تو ویسے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اور ان کا بیٹا اپنا ٹھکانہ کہیں اور بنالیں' سو ایک دن وہ بہت سادگی کے ساتھ رضی صاحب سے نکاح کرکے اُن کے گوشۂ عافیت میں آگئی تھیں کہ یہ معاشرہ کسی جوان' مصیبت زدہ اور تنہا عورت کو آزادی سے جینے اور سکون سے مرنے کی اجازت کہاں دیتا ہے!!

رضی صاحب نے اُن دونوں کو اپنے تینوں بچوں سمیت ایک مضبوط سائبان بھی دیا اور بےپناہ محبت بھی مگر اس کے ساتھ ایک المیہ یہ بھی ہوا کہ اپنی ماں کی محبت اُن بچوں میں تقسیم ہوتے دیکھ کر عابد بھائی کچھ کچھ نفسیاتی ہوگئے۔ ماں کی اکائی کو ٹکڑوں میں بٹتے اور اس کی محبت کو تمام بچوں کے لیے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

انداز میں تقسیم ہوتے دیکھ کر انہیں پریشانی ہوتی تھی حالانکہ رضی صاحب اپنے بچوں سے زیادہ عابد بھائی پر توجہ دیتے تھے، وہ اپنی گاڑی میں آگے عابد بھائی کو بٹھاتے تھے کہ میرا بڑا بیٹا آگے بیٹھے گا اور اُن کے بچے ہمیشہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے تھے۔ خریداری کرتے وقت بھی عابد بھائی کی پسند و ناپسند کو فوقیت دی جاتی تھی مگر لگتا تھا، حالات کے جبر نے اُن کے اندر کی خوداعتمادی کو ختم کر دیا ہے اور انہیں اپنے اکیلے ہو جانے کا احساس ہر لمحہ خوف زدہ رکھتا ہے اور یوں بھی بچپن کا کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ کبھی کبھی سوہانِ روح بن جاتا ہے۔

عابد بھائی کو اپنے والد کی موت کا منظر یاد تھا جو وہ ساری زندگی بھلا نہ پائے پھر والد کے بعد عدم تحفظ کے خوف نے اُن کی زندگی کو اجیرن کیے رکھا۔ ماں نے ہر ہر لمحہ انہیں سمیٹنے کی کوشش تو کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں کہ اُن پر رضی صاحب کے تین بچوں کی بھی ذمے داری تھی۔ بینک کی جاب چھوڑ کر انہوں نے گھر اور بچوں کو سنبھال لیا تھا، دوسری طرف رضی صاحب نے ان تمام افراد کو بہت خوش دلی سے اپنا تو لیا تھا مگر وہ ذات کا خلفشار اور ذہنی اذیتیں جو اپنے والد کی وفات کے بعد اِن ماں بیٹے نے سہی تھیں، عابد بھائی کے ذہن پر ایسی نقش ہوئیں کہ پھر وہ کبھی کسی رشتے پر اعتبار نہ کر سکے اور سوتیلے بہن بھائیوں کے درمیان بھی وہ الگ تھلگ اور تنہا ہی رہے۔ اُس گھر میں اتنی آسودگی اور محبت ملنے کے باوجود انہیں ایک کمی کا احساس تھا۔ بہت بچپن میں اُن کے دل میں پنجے گاڑ کر بیٹھ جانے والا تنہائی اور عدم تحفظ کا خوف اُن کے دل سے کبھی نکل ہی نہیں سکا۔ انہیں زیادہ لوگوں اور شور شرابے سے الجھن ہوتی تھی۔

لیلیٰ، عابد بھائی کی یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھی، اُس سے شادی کر کے عابد بھائی نے اُسے ٹوٹ کر چاہا مگر اُسے لوگوں سے گھلنے ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، انتہا تو یہ تھی کہ دونوں بچیوں سے لیلیٰ کی بے پناہ محبت بھی انہیں خوف زدہ رکھتی تھی کہ اس طرح اُن کے حصے کی محبت میں لیلیٰ کمی نہ کر دے، ویسے بظاہر وہ بالکل ٹھیک تھے، بے پناہ احساسِ ذمے داری رکھنے والے، اپنی فیملی کو ٹوٹ کر چاہنے والے ایک اچھے انسان!!

............*......*

وقت کا پہیہ اتنی تیزی سے چکر کھاتا ہے کہ اُس کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو پاتا...... ہمارے بچے بڑے ہو کر کالج اور یونیورسٹیز میں پہنچ چکے تھے۔ میرے میاں مسعود آڈٹ میں آ گئے تھے اس لیے آڈٹ کرنے پاکستان بھر میں اُن کا آنا جانا لگا رہتا تھا، کبھی کبھی مہینوں کے لیے میں بھی اُن کے ساتھ جاتی تھی۔ میں لیلیٰ سے آخری بار جب ملی تھی، تب وہ لوگ اپنا گھر سیل کر کے شاز بنگلوز شفٹ ہو رہے تھے پھر اُس نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی میں مجھے بلایا تھا جو ایک ہی دن اور ایک ہی گھر میں رخصت ہو کر جا رہی تھیں مگر افسوس کہ انہی دنوں میری ساس کا انتقال ہو گیا تھا اور میں شادی میں شرکت نہ کر سکی تھی۔

بچے جب تک چھوٹے ہوتے ہیں، اتنا کام نہیں بڑھاتے، بڑے ہوتے جاتے ہیں تو اپنے کام کو پھیلاتے جاتے ہیں، میرے ساتھ بھی یہی صورت حال تھی، کسی سے فون پر بھی تفصیلی بات چیت کا ٹائم نہیں مل پاتا تھا۔ لیلیٰ اور عابد بھائی نے بھی ایک آدھ مرتبہ ہی رابطہ کیا تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں اور سمدھیانے میں مصروف تھی اس لیے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔

ایک طویل عرصے بعد میں اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھنے رابعہ فلاور گئی تو بالکل اتفاقاً مجھے لیلیٰ اور عابد بھائی، رابعہ فلاور کے گیٹ کے پاس ہی مل گئے تھے، چہرے سے بہت بہتر نظر آ رہے تھے، میری ملاقات برسوں بعد ہوئی تھی اس لیے اُن میں یہ تبدیلی مجھے اچھی لگی تھی۔

''تم یہاں کہاں لیلیٰ؟'' میں نے گلے ملتے ہوئے لیلیٰ سے دریافت کیا تھا۔

اُس نے بتایا تھا کہ ''بیٹیوں کی شادی کے بعد عابد کو سناٹے سے وحشت ہونے لگی تھی، ہر وقت چہچہانے والی چڑیوں کے اُڑ جانے کے بعد گھر کی خموشی عابد کو پریشان کرتی تھی۔ ہم دو افراد کے لیے شاز بنگلوز بہت بڑے تھے، سو اُس سناٹے کی جگہ کو چھوڑ کر ہم نے اقراء سٹی میں ایک چھوٹا فلیٹ اور ایک شاپ خرید لی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اَب شاپ پر عابد کا دل بھی لگتا ہے اور یہاں آ کے یہ خوش بھی ہیں۔''

عابد بھائی کا کہنا تھا کہ...... ''ساری عمر ہجوم میں رہ کر بھی میں تنہا رہا ہوں، یہاں چہل پہل اور رونق ہے، میرا دل یہاں لگ گیا ہے اور پھر اَب اِس عمر میں، میں چاہتا ہوں، مروں تو کم از کم میرا جنازہ تو پرہجوم ہو کہ پرہجوم جنازے نصیب والوں کے ہی ہوتے ہیں۔''

لیلیٰ نے اپنے فلیٹ چلنے کے لیے بہت اصرار کیا تھا مگر لڑکی والوں کو میں نے ٹائم دیا ہوا تھا اس لیے اُس دن معذرت کر کے میں نے بہت جلد آنے کا وعدہ کیا تھا۔

عابد بھائی نے وہیں کھڑے کھڑے بالکل مین روڈ پر بنے اپنے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''کھلا ہوادار اور صاف ستھرا فلیٹ جو دودھ کی دکان کے اوپر ہی ہے، آنا تو نشانی یاد رکھنا۔''

............*......*

میں کئی روز سے لیلیٰ کے گھر جانے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ...... وہ قیامت گزر گئی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی، دودھ کی دکان کے بالکل نزدیک ایک درندہ صفت کے رکھے ہوئے بم نے بلاسٹ ہو کر قیامتِ صغریٰ بپا کر دی تھی...... کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے جہاں زندگی رواں دواں تھی، وہ جگہ کچھ ہی لمحوں میں کھنڈر بن جائے گی اور پلک جھپکتے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

قیامت کا وہ منظر میں کبھی بھول نہیں پاؤں گی جب تمام شہداء کے ساتھ عابد بھائی کو بھی اُن کی آخری آرام گاہ لے جایا جا رہا تھا۔ اتنے پرہجوم جنازے میں نے بہت ہی کم دیکھے ہیں، لوگ ہی لوگ تھے جو بچھڑ جانے والوں کو احترام کے ساتھ سسکیوں کے شور میں اپنے کاندھوں پر اٹھائے اُن کی حتمی اور یقینی منزل کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہے تھے۔

لیلیٰ اس حادثے میں شدید زخمی ہوئی تھی مگر زندگی باقی تھی کہ وہ بچ گئی تھی...... اسپتال میں اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''ایک عابد کا دکھ ہو تو برداشت کر لوں، یہ تو اَن گنت تباہ ہونے والے گھرانوں کا مشترکہ دکھ ہے، ایک وحشی انسان کے مکروہ عمل کی وجہ سے انسانیت کے سینے میں ایک ایسا گھاؤ لگا ہے جسے بھرنے کے لیے صدیاں درکار ہیں، میرا زخم تو بہت معمولی ہے کہ یہاں تو ایک ایک گھر کے کئی کئی لوگ اس مرگِ ناگہانی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ والی و وارث اور گھر کے چراغ تو گئے ہی مگر اُن کے خواب، اُن کے گھر سب کے سب رزقِ آتش بن گئے......!''

......☆☆......

WWW.PAKSOCIETY.COM

احترام کریں۔ میں یہ بات جانتی ہوں کہ اگر ابو نے اجازت نہیں دی تو وہ شادی نہیں کرے گا۔ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں کہ وہ ساری زندگی اسی طرح گزار دے!''

میرے میاں کچھ دن تو اپنی بات پر جمے رہے تھے لیکن پھر میرے بیٹے کی ایک فون کال نے جس میں اُس نے کہا تھا۔ ''ابو......! میں آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتا اور نہ ہی آئندہ کبھی کروں گا۔'' اس بات نے ایک دم اچانک ہی انہیں وہ محبت کرنے والا باپ بنا دیا تھا جو اولاد کی خوشی کی خاطر سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے پھر یہ کہ شادی میرے بیٹے اور اُس جاپانی لڑکی نے پاکستان میں آ کر کی تھی۔ لڑکی کے والدین اور بہن بھائی بھی اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔ اگر چہ میری بہو ہماری زبان نہیں سمجھتی تھی پھر بھی وہ ہمارے درمیان بہت خوش تھی اور پھر شادی کے ایک ماہ بعد ان دونوں کی جاپان واپسی ہوگئی تھی۔ جانے کے بعد میرا اپنے بیٹے سے زیادہ' بہو سے نیٹ اور ٹیلی فون تک رابطہ رہنے لگا تھا۔ ایک سال بعد ہمارا بیٹا پڑھائی مکمل کر کے پاکستان واپس آ گیا۔

میرا پیارا بیٹا اپنی ہائر اسٹڈی مکمل ہونے کے بعد میری پیاری بہو کے ساتھ جاپان میں جاب کی بہت اچھی آفر کے باوجود ہماری اور اپنے وطن کی محبت میں پاکستان آ گیا تھا لیکن ابھی میرے بیٹے کو یہاں آئے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ کراچی کے حالات اور زیادہ خراب ہونے لگے تھے' خاص طور پر ڈاکٹروں کے لیے حالات بالکل سازگار نہ رہے تھے اور جب میرے بیٹے کے کئی ساتھی ڈاکٹرز بے گناہ قتل کر دیئے گئے تو ہم بھی بہت پریشان رہنے لگے۔ آغا خان ہسپتال جہاں میرا بیٹا ڈیوٹی دے رہا تھا' ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم کے ڈی اے میں رہتے تھے لیکن جب تک بیٹا گھر نہیں آ جاتا تھا' ہم گھر والے خصوصاً ہم ساس بہو گھر کے گیٹ کے پاس ٹہلتے اور اُس کی خیریت کے ساتھ آنے کی دُعائیں مانگتے رہتے تھے۔

میرا بیٹا اپنے پروفیشن میں بہت ماہر اور نامور تھا اور وہ یہی سوچ کر پاکستان آیا تھا کہ اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کروں گا مگر یہاں کراچی میں تو دہشت گردی کا نہ ختم ہونے والا ایک عذاب تھا' غریب پرور شہر کراچی جس نے ہمیشہ سب کو پناہ دی تھی' روزگار دیا تھا' جہاں ہر نسل اور ہر عقیدے کے لوگ مل جل کر رہتے تھے' یہاں نہ جانے کس نے آگ لگائی تھی کہ سب کچھ جل گیا۔ پہلے شیعہ ڈاکٹروں کا قتل شروع ہوا پھر ساتھ ہی ساتھ سنی ڈاکٹرز بھی مارے جانے لگے۔ ہم لوگ بہت زیادہ خوف زدہ رہنے لگے' ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی بری خبر نہ آ جائے' کہیں کوئی ظالم' بے رحم' میرے بیٹے کی جان نہ لے لے۔ حالات کسی صورت سدھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے تو ہم سب یہ سوچنے لگے کہ میرے بیٹے کو یہاں سے چلے جانا چاہیے' وہ جہاں بھی جائے مگر پاکستان سے چلا جائے' اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ اُسے اس ملک میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں' اُن لوگوں کا علاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جن کے ساتھ رہنے اور جینے والے بے گناہ انسانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ ویسے بھی اُس کی تعلیم صلاحیتوں اور پروفیشنل اپروچ کے لحاظ سے اُسے کچھ زیادہ نہیں مل رہا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ پرانا کراچی کہیں کھو گیا ہے۔ ہم پاکستان میں نہیں' کہیں اور آ گئے ہیں۔ کبھی ایسا لگتا اور ہم سوچتے کہ حالات درست ہو جائیں گے' کراچی ہمیشہ ایسا نہیں رہے گا' اس شہر میں بھی امن دامان ہو جائے گا۔ آخر کو یہ ہمارا ملک ہے جسے ہم نے قربانی دے کر بنایا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور پھر ہم سب نے متفقہ طور پر یہی فیصلہ کیا کہ میرے بیٹے کو پاکستان سے چلے جانا چاہیے اور پھر آخر کار وہ چلا ہی گیا تھا۔ ان دنوں اُس کا قیام آسٹریلیا میں ہے اور وہ وہاں بہت خوش باش زندگی گزار رہا ہے!!

میں آج اپنے بیٹے سے بہت دور ہوں لیکن اُس کی سلامتی میرے لیے باعثِ اطمینان اور خوشی ہے مگر وہ ماں کیا کرے' کہاں جائے اور کس سے فریاد کرے جس کا بیٹا صبح گھر سے زندہ جاتا ہے اور شام یا رات کو لاش آتی ہے؟ آج کراچی میں نہ جانے کتنی مائیں اور بہنیں ہیں جن کے بیٹوں اور بھائیوں کی نعشیں انہیں اپنے ہوش سے بے گانہ کر دیتی ہوں گی۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب یہ چیخیں' آہیں اور فریادیں آسمان کے پردوں کو چیرتے ہوئے آسمان اور زمین کے مالک تک پہنچیں گی تو پھر کیا ہوگا؟

.........•.........•.........

کچھ عرصہ پہلے میں اپنے بیٹے کے پاس آسٹریلیا گئی ہوئی تھی' ایک دن میری بہو مجھے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں زیادہ تر مقامی مرد اور عورتیں تھیں مگر وہاں ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' سری لنکا وغیرہ کے لوگ بھی تھے۔ سب بہت پیار و محبت سے مل رہے تھے' یہاں کسی بھی قسم کا کوئی لسانی یا مذہبی تعصب نہیں تھا' وہاں کسی مسلمان کو اسلام خطرے میں محسوس نہیں ہو رہا تھا جو ہمارے یہاں ہر دم محسوس ہوتا ہے بلکہ محسوس کرایا جاتا ہے۔ خیر' وہاں جب میری بہو نے میرا تعارف کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں پاکستان سے آئی ہوں تو وہاں کی ایک مقامی خاتون نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''وہ پاکستان جہاں دہشت گرد ہوتے ہیں؟ جہاں روز بم پھٹتے ہیں؟ جہاں عورتوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے؟ جہاں بچوں کو تاوان کے لیے اغوا کیا جاتا ہے اور روزانہ ٹارگٹ کلنگ میں لوگوں کو مارا جاتا ہے؟''

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ملک کے لوگ کس قدر افلاس' بے روزگاری اور بیماریوں میں جکڑے اور ناانصافیوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ جو ظالم ہیں' وہ دوسروں کے پورے پورے خاندان اپنی ذاتی جیلوں میں قید کر دیتے ہیں۔ زمین' جائیداد کو بچانے کے لیے اپنی بیٹیوں کی شادی قرآن سے کر دیتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو کاری قرار دے کر ہلاک کر دیتے ہیں' جو عورتوں کے تقدس کو پامال کر دیتے ہیں' چوری کرتے ہیں اور ڈاکہ ڈالتے ہیں اور تاوان کے لیے بچوں کو اور مردوں کو اغوا کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ ان ظالموں نے ہمارے ملک کو پوری دنیا میں کس طرح رسوا کیا ہے' انہی کی وجہ سے ہمارا ملک دہشت گردوں اور ڈاکوؤں کا ملک گردانا جاتا ہے حالانکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور نجانے کیوں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ...... انہیں ایک نہ ایک روز وہاں بھی جانا ہے جہاں زندگی کا حساب اور جہنم کا حساب ان کا منتظر ہے!!

......☆☆......

WWW.PAKSOCIETY.COM

صدف آصف

نورِ ہدایت

سید معین اختر نقوی کا خیال
مجھ سے جو کچھ بھی تو کرواتا ہے کردیتا ہوں
مرے اندر یہ کوئی اور نہیں ہے تو ہے

ایک نومسلم نوجوان کی محبت اور معرفت سے گندھا قصہ خاص



نور نے فجر کی ادائیگی کے بعد ابھی تلاوت شروع ہی کی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس نے قرآن شریف کو احترام کے ساتھ ریشمی غلاف میں لپیٹا اور کیبنٹ کے اوپری خانے میں رکھ دیا......اور جب دروازے پر جاکر دیکھا تو محمد احمد کو دیکھ کر حیران ہوگئی۔اس کا شوہر خلافِ معمول مسجد سے جلد لوٹ آیا تھا۔

''نور......! آج میرے ساتھ ناشتے پر جیکب آباد ایک مہمان بھی ہے، امید ہے کہ تمہیں برا محسوس نہیں ہوگا۔'' احمد نے اسی نرمی سے بیوی کو مخاطب کیا جو اس کے مزاج کا خاصہ تھی' تاہم اس نے نوراں کی آنکھوں سے جھلکنے والے سوال...... کون اور کیوں آیا ہے' سے نظریں چرالی تھیں۔وہ شوہر کی مزاج آشنا تھی اس لیے چاہتے ہوئے بھی سوال نہ کرسکی۔''جی'اچھا۔'' بول کر کچن کی طرف روانہ ہوگئی......دوسری طرف احمد نے بیوی کی سمجھداری کو دل میں سراہا کیونکہ وہ ابھی تفصیل بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

''موہن لال ،آؤ ہاتھ منہ دھولو۔'' نور نے ناشتہ بناتے ہوئے احمد کی آواز سنی۔ ناشتہ تقریباً تیار تھا۔اس نے خستہ بل والے پراٹھوں کے ساتھ باریک پیاز اور ہری مرچ کتر کے آملیٹ بنایا تھا۔ رات کی بجھیا اور میٹھا دہی بھی مہمان کی تواضع کے لیے رکھ دیا تھا......نور نے سارے پاکستانی کھانے پڑوس میں رہنے والی زبیدہ خالہ سے پکانے سیکھے تھے جنہوں نے احمد کو اپنا بیٹا بنایا تھا اور نور کو اسی رشتے کی نسبت بہو پکارتی تھیں مگر بیٹیوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔

موہن لال سے احمد کو اپنے باپ کے مرنے کی خبر ملی تھی اسی لیے وہ بہت افسردہ تھا مگر وہ اس کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوسکتا تھا اس لیے افسردہ بیٹھا دوست سے اپنے باپ کا ذکر کرتا رہا تھا۔

اُس روز بہت دنوں بعد اُن کے معمولات زندگی میں فرق آیا تھا ورنہ فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد احمد کافی دیر مسجد میں گزارتا تھا پھر گھر آکر نور کے ساتھ ناشتہ کرتا تھا۔اس کے بعد دفتر روانہ ہوتا تھا۔ نور ٹیبل پر ناشتہ لگا کر احمد کو مطلع کردیتی تھی ،اگر وہ کسی کام میں الجھ جاتی تو اس کا شوہر خاموشی سے بیٹھا اس کی راہ تکتا پھر بھلے سے اس کو آفس سے دیر ہوجاتی مگر وہ نور کے بغیر ناشتہ نہیں کرتا تھا۔نور کو اپنے شوہر کی اس ادا پر بہت پیار آتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر پہلے احمد کے ساتھ ناشتہ کرتی تھی پھر کوئی دوسرا کام تاکہ وہ وقت پر اپنے کام پر روانہ ہوسکے۔

☆......☆

احمد کے ساتھ نور کی شادی کو دو سال ہوگئے تھے مگر اسے کبھی بھی ایسا محسوس نہ ہوا تھا کہ وہ ایک ''نومسلم'' کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔احمد کی شخصیت میں ایک توازن تھا۔وہ ہر کام ترتیب اور نظم وضبط سے کرنے کا عادی تھا، چاہے وہ دنیاوی معاملات ہوں یا دینوی، یہ ہی وجہ تھی کہ اُن دونوں کی دو سالہ شادی شدہ زندگی میں کوئی بے سکونی نہیں تھی۔نور کو پاکستان بہت اچھا لگتا تھا۔اسے یہاں کے لوگوں سے ایک انسیت اور محبت ہوگئی تھی اور اب تو ویسے بھی یہ ملک ہی اس کا گھر تھا ورنہ اس کی پیدائش ''ملائیشیا'' کی تھی۔

اُس دوپہر نور ابھی صفائی وغیرہ کرکے فارغ ہی ہوئی تھی کہ زبیدہ خالہ پیالے میں کڑھی لیے چلی آئی تھیں۔

''جی خالہ......! کیا لائی ہیں؟'' نور نے اردو بولنا احمد سے ہی سیکھی تھی ورنہ اس سے قبل اسے ملائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھاشا اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ شروع میں وہ احمد سے بات چیت کرنے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا ہی لیتی تھی پھر اسے جلد ہی تھوڑی تھوڑی اردو بولنا آ گئی تھی۔

''ارے بیٹا......! آج صبح سے کڑھی پکا رہی تھی، اب جا کر پکی ہے تو میں نے سوچا کہ تمہیں دے آؤں۔'' انہوں نے محبت سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ نور اپنے وطن کی تہذیب کے مطابق اُن سے مصافحہ کرنے کے بعد اُن کے ہاتھ پر احتراماً بوسہ دے گی۔ ملائیشیا میں یہ رواج ہے کہ چھوٹے اپنی عمر سے بڑے افراد سے ہاتھ ملانے کے بعد ان کی ہاتھ کی پشت پر پیار کرتے ہیں۔

''بیٹھیے نا خالہ......! میں آپ کے لیے ٹھنڈا بناتی ہوں۔'' نور نے انہیں کرسی پیش کی۔

''ارے بیٹا......! کیوں تکلیف کرتی ہو؟ چھوڑو، آ کر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے تکلفاً منع کیا ورنہ اس شدید گرمی میں ان کا بھی حلق خشک ہو رہا تھا۔

''بس خالہ......! ابھی آئی۔'' نور مسکراتے ہوئے بولی اور کچن میں جا کے گلاس میں تیز تیز شربت گھولنے لگی۔

''میرا بچہ ابھی آفس سے نہیں آیا؟'' خالہ نے احمد کے بارے میں پوچھا۔

''جی......بس آتے ہی ہوں گے، ان کو آپ کے ہاتھ کی کڑھی بہت پسند ہے، بہت خوش ہو جائیں گے۔'' وہ ہنسی تو اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے......نور کا رنگ سانولا تھا، وہ دبلی پتلی تھی، اس کا ناک نقشہ بھی عام ملائی لڑکیوں کی طرح تھوڑا پھیلا پھیلا سا ہی تھا پھر بھی وہ دیکھنے والی آنکھ کو بھا جاتی تھی، شاید نور کے اندر کا اُجلا پن اس کی شخصیت کی روشنی کو اجاگر کرتا تھا۔

''آج تو بڑی گرمی ہے۔'' زبیدہ خالہ نے شربت کا گلاس غٹا غٹ پینے کے بعد کہا تھا۔

''جی، آپ نے صحیح کہا، یہاں گرمی بہت پڑتی ہے، ہمارے ملائیشیا میں زیادہ بارشیں ہونے کی وجہ سے موسم میں گرمی کی حدت کچھ کم ہو جاتی ہے۔'' نور نے اپنے وطن کے موسم کو بے اختیار یاد کیا۔ خالہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''یہ لیں خالہ......! سارہ کو میری طرف سے آم دے دیجیے گا۔'' نور نے خالی برتن میں دو بڑے بڑے آم رکھ کر خالہ کی پوتی کے لیے دیئے۔

''ارے بیٹا......! یہ کیا بات ہوئی، تم کبھی خالی برتن واپس نہیں کرتی ہو، ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا۔'' خالہ نے نور کو پیار سے دیکھا۔

''بس خالہ! یہ ہمارے ملک کی روایت ہے کہ پڑوسیوں کے برتن خالی واپس نہ بھیجو۔ میری نانی تو کہتی تھیں کہ اگر دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو چاول ہی ڈال دو، اس طرح محبتیں بڑھتی ہیں۔'' نور نے محبت سے ان کے ہاتھ چومے تو انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

احمد بہت ہی نفیس شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنا گھر صاف ستھرا دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ کوئی کام کرنے کے لیے نور پر زور نہیں ڈالتا تھا۔ آفس سے گھر آنے کے بعد اپنے چھوٹے موٹے کام خود ہی کر لیتا تھا بلکہ گھر کے کاموں میں بھی بیوی کی تھوڑی بہت مدد کر دیتا تھا اس لیے احمد کے آنے سے قبل نور اچھے خاصے کام نمٹا لیتی تھی۔ اُس وقت بھی وہ مسکراتی ہوئی ڈسٹنگ کر رہی تھی اور سامنے سائیڈ ٹیبل پر رکھی احمد کی تصویر تھی۔ اس نے بغور تصویر کا جائزہ لیا، احمد کا رنگ قدرے دبتا ہوا تھا مگر وہ پرکشش شخصیت کا مالک تھا، خصوصاً اس کی سحر انگیز آنکھیں جنہوں نے شادی کے پہلے دن سے نور پر جادو کر دیا تھا، اُسے کو پتا ہی نہیں

چلا کہ وہ کب اپنے کم گو، صابر اور محبت کرنے والے شوہر کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ نور اور احمد کی ملن کہانی کچھ انوکھی سی تھی۔

☆☆☆

نوراں کا خاندان ''جوہر بارو'' میں رہتا تھا۔ یہ ملائیشیا کا ایک سرحدی علاقہ تھا جو ایک طرف سے سنگا پور سے جا ملتا ہے۔ اس کا باپ علی عابدین سنگاپور میں نوکری کرتا تھا اس لیے ان سب کو یہاں رہنے میں آسانی تھی کیوں کہ یہاں سے چلنے والی بس آدھے گھنٹے میں علی عابدین کو سنگاپور پہنچا دیتی تھی۔ نور کو اپنا علاقہ بہت پسند تھا کیوں کہ اکثر سنگاپور گھومنے والے سیاح یا وہاں کے رہائشی اس کے علاقے میں آ جاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی یہاں چیزیں سنگاپور کے مقابلے میں بہت سستی تھیں، کھانے پینے کی چیزیں، پھل فروٹ، یہاں تک کہ سگریٹ بھی ان کو کم دام میں مل جاتی تھی۔ کچھ لوگ تو صرف بال کٹوانے کے لیے ہی ان کے علاقے میں آتے تھے کیوں کہ ملائی روپیہ ''رنگٹ'' سنگاپورین ڈالر کے مقابلے میں سستا تھا......نور اپنے گھر والوں کی مدد کرنے کے لیے اپنی کالج کی چھٹیوں میں یہاں پھلوں کا اسٹال لگاتی تھی۔ اس طرح اُس کا سیاحوں سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا جن سے بات چیت کے دوران اس کو اچھی انگلش بولنا آ گئی تھی۔ نور بھی اپنے کالج ''نان ینگ'' جانے کے لیے بس کے ذریعے سنگاپور کا سفر کرتی تھی جہاں سے وہ ''بیچلرز آف بزنس ایڈمنسٹریشن'' کر رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر کا بھی ایک سبجیکٹ پڑھ رہی تھی اس لیے اُس کے والد نے گھر میں بھی اسے ایک کمپیوٹر لا دیا تھا۔

نیٹ پر چیٹنگ کرنا نور کو زیادہ پسند نہ تھا مگر وہ کبھی کبھی آن لائن آ کر امریکا میں مقیم اپنی کزن سے بات چیت کر لیتی تھی۔ اسی طرح ایک دن ''اسلام'' کے ''نک'' سے چیٹ کرنے والے ایک لڑکے سے اس کی بات چیت شروع ہوئی۔ نوراں اُس کی مختلف مذاہب کے حوالے سے معلومات اور دینِ اسلام کے بارے میں کیے جانے والے بعض سوالات پر چونک جاتی تھی۔ اکثر ان سوالات کا جواب دینے کے لیے اسے اپنے نانا سے رجوع کرنا پڑتا تھا جو اسلامک سینٹر سے منسلک تھے۔ اس طرح ان کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی مگر اُن دونوں نے بھی اپنی ذاتی باتیں ایک دوسرے سے ڈسکس نہیں کی تھیں۔

''اسلام'' کی نہ صرف مذہب اسلام بلکہ دوسرے عقائد کے بارے میں بھی معلومات غضب کی تھیں، خصوصاً ''ہندوازم'' کے بارے میں اکثر وہ کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا تھا۔ ان لوگوں نے بعد میں وائس چیٹ کے ذریعے آپس میں انگلش میں گفتگو کا سلسلہ بڑھایا تھا۔

وہ بہت عمدہ گفتگو کرتا تھا۔ نور پہلی بار کسی مرد سے متاثر ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ چلا۔ آخر نور سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے اسلام کا اصل نام جاننے کی کوشش کی جسے بتانے سے وہ اکثر کترا جاتا تھا۔

''میرا نام سندر لال ہے۔'' اس جواب کے بعد تو نور سکتے میں آ گئی تھی۔ چار پانچ روز تک تو وہ کمپیوٹر کے آس پاس بھی نہ پھٹکی کیوں کہ وہ پیدائشی مسلمان تھی اور اپنے مذہب سے اسے بہت لگاؤ تھا، تاہم اصل حقائق جاننے کے لیے اسے دوبارہ آن لائن ہونا پڑا۔ دوسری طرف وہ خود بھی بہت بے چین تھا اس لیے اس نے نور سے درخواست کی، وہ پہلے پوری بات سن لے پھر چاہے تو اس سے قطع تعلق کر لے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم اسی لیے ناراض ہو نا کیوں کہ میرا نام "سندر لال" ہے؟" وہ افسردگی سے بول رہا تھا۔ وہ دونوں وائس چیٹ کے ذریعے بات کر رہے تھے۔

"نہیں، میں تمہاری منافقت پر ناراض ہوں، تم نے مجھے ایک عام سی لڑکی سمجھا جو مردوں سے دوستی کی شیدائی ہوتی ہیں، انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دوسری طرف کون ہے؟" نور نے غصے سے کہا۔

"نہیں نور! ایسی بات نہیں ہے۔ اگر میں تمہیں صرف ایک لڑکی سمجھتا تو تم سے "وڈیو چیٹ" کرنے پر اصرار کرتا۔ میں نے تو اب تک تم کو دیکھا بھی نہیں ہے۔" وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر دوبارہ بولا۔ "کیا میں نے کبھی کوئی ایسی بات کی جس سے تمہاری عزت اور احترام میں فرق اور حرف آیا ہو؟"

وہ پر جوش انداز میں بولتا چلا گیا۔ نور ادل ہی دل میں اس کی تمام باتوں کی تائید کرتی چلی گئی۔

"مجھے پھر بھی تم سے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ تم نے "اسلام" کا نقاب اوڑھ کر مجھ سے دوستی کیوں کی؟ میں بھی تمہاری باتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔" نور نے آنسو کو ہتھیلیوں سے صاف کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"دراصل میں آج کل جن حالات سے گزر رہا ہوں، میرے سارے اپنے مجھ سے جدا ہو گئے ہیں۔ میں سچ بول کر تم کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر تمہیں یہ پتا چلتا کہ میں مسلمان نہیں ہوں تو کیا ہماری بات چیت قائم رہتی؟" اس کا گمبھیر لہجہ اداسیوں کی لپیٹ میں تھا۔

"ہاں...... میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں ایک ہندو لڑکے سے محبت کر بیٹھی ہوں۔ تمہاری باتوں سے تو میرے دین کی خوشبو آتی تھی۔" نور نے جذبات میں آ کر وہ بات بھی بتا دی جسے وہ اپنے سے بھی چھپاتی تھی۔

"اگر میری پوری بات سنو گی تو شاید تمہاری ناراضگی خوشی میں بدل جائے۔"

"ٹھیک ہے، بولو اب تمہارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کیا ہے؟" نور نے اسے ایک موقع دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اپنی داستانِ حیات سنانے لگا۔ "میرا تعلق پاکستان کے شہر جیکب آباد سے ہے۔ ہمارے دادا، پردادا شروع سے اس علاقے میں آباد تھے۔ میرا تعلق ایک کٹر ہندو مذہبی گھرانے سے تھا۔ میرے باپ کی شہر میں اچھی خاصی جائیداد تھی جسے انہوں نے کرائے پر دیا ہوا تھا۔ وہ خود بھی کپڑے کے بڑے بیوپاری تھے۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ مجھے بچپن سے ہی مسلمانوں سے لگاؤ سا تھا اسی لیے اسکول میں آنے کے بعد میں نے زیادہ تر مسلمان لڑکوں سے دوستی کی۔ اسکول میں میری سب سے زیادہ ایک لڑکے مصطفیٰ سے بنتی تھی جس کے والد سید عالم صاحب مجھے ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ وہ ہمارے اسکول کے ہیڈ سر بھی تھے۔ ان کے گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا۔ میرا بچپن اس کے آنگن میں کھیلتے کودتے گزرا۔ مصطفیٰ کی والدہ جب بھی خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کرتیں، میں ان کی آواز کے سحر میں کھو سا جاتا اور پھر جب میں اکیس سال کا ہوا تو میرا دل اپنے مذہب سے پھر گیا۔ مجھے پوجا پاٹ کرنا بہت کٹھن لگنے لگا تھا۔ شاید میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہونے جا رہا تھا جسے اللہ نے ہدایت کے لیے چن لیا تھا۔"

نور خاموشی سے اُس کی داستان سن رہی تھی۔ لمحہ بھر رکنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "میں جب بھی اذان یا تلاوت سنتا، میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے میرا رواں رواں کپکپا جاتا اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں اپنے گھر والوں سے چھپ چھپ کر قرآن کا درس سننے لگا۔ جہاں بھی مصطفیٰ جاتا، میں اس کے ساتھ درس میں شریک ہو جاتا۔ ہمارے مذہب میں صبح سویرے پوجا پاٹ ہوتی تھی مگر میں اب اس سے کترانے لگا تھا۔ میرے گھر والے میری اس روش سے بہت پریشان تھے۔ بات ابھی ان کے سامنے کھل کر نہیں آئی تھی اسی لیے ابھی تک میرے پتا جی کو کوئی بات نہیں بتائی گئی تھی، ان کے غصے سے سب ڈرتے تھے۔ میں نے اس بابت سر عالم سے بھی بات کی مگر انہوں نے مجھے جلد بازی سے روکا اور اسلام کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا لٹریچر بھی پڑھنے کو دیا تاکہ میں پوری سچائی اور دل و دماغ کی آمادگی کے ساتھ کوئی فیصلہ کروں۔ بہر حال جو سچائی مجھے دینِ اسلام میں نظر آئی، وہ کسی دوسرے مذہب میں نہیں تھی۔ میں دل سے اسلام کو قبول کر لیا تھا مگر مجھے اپنے گھر والوں کی ناراضگی کا بہت خوف تھا اسی لیے میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ میری دو بہنوں کی سگائی ہماری برادری کے خوشحال گھرانوں میں ہو چکی تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے اسلام قبول کرنے سے ان کے رشتے ختم ہو جائیں اور میرا پریوار مسائل کا شکار ہو جائے میں رو رو کر اللہ سے دعا کرتا رہتا تھا کہ...... ہندوؤں کے لاتعداد دیوی دیوتا بھی مل کر وہ کام نہیں کر سکتے جو "تو" واحد ہو کر کر سکتا ہے...... پھر اللہ نے ہی میری راہیں آسان کر دیں میں گھومنے کا بہانہ بنا کر اسلام آباد چلا گیا زیادہ وقت اس سچے دین کی تعلیمات حاصل کرنے میں صرف کرنے لگا۔ یہ کوئی آسان راستہ نہ تھا مجھے بڑے تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ مخلص لوگ ملے جنہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا، کچھ نے میرے اندر وسوسے بیدار کیے۔ وہ نام کے تو

غزل

جب ضرورت پڑی نہیں مانگی
بھیک ہم نے کبھی نہیں مانگی

کر لیے سب قبول ہم نے غم
زندگی سے خوشی نہیں مانگی

پیار ہم نے کیا اندھیرے سے
چاند سے روشنی نہیں مانگی

اس لیے دربدر بھٹکتا ہوں
عشق مانگا، خودی نہیں مانگی

لطف آنے لگا جدائی میں
جب ملن کی گھڑی نہیں مانگی

کون آ کر بنا گیا شاعر
ہم نے تو شاعری نہیں مانگی

حکیم خان حکیم

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسلمان تھے مگر اسلام کی اصل روح ''انسانیت'' پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے مذہب میں ذات پات کا کوئی فرق نہیں اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے عربی عجمی کی ایک دوسرے پر فوقیت ختم کر کے پرہیزگاری کو ایک مسلمان کے سپریئر ہونے کی پہچان بتائی تھی مگر یہاں بھی کچھ ایسے ناعاقبت اندیش بھی ملے جو اسلام کے سچے پیروکار صرف انہیں ہی سمجھتے تھے جو پیدائشی مسلمان تھے۔ تم سن رہی ہو نا' میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' نور کی طرف سے خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا تو احمد نے اپنی کہانی کو بیچ میں چھوڑا اور اس سے پوچھا۔

''ہاں' میں سن رہی ہوں، تم بولتے رہو۔'' وہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''خیر' کچھ لوگوں نے مجھے ڈھونگی تک قرار دے دیا مگر میں ہر اُس در پر جاتا جہاں سے مجھے اس سچے دین کے بارے میں علم کا خزانہ ملتا پھر ایک بڑی دین دار اور متمول شخصیت پیر عادل راشدی نے میرا ہاتھ تھاما، انہوں نے میری بھرپور مدد کی، مجھے نوکری دلائی اور رہنے کے لیے اپنے گھر کا گیسٹ روم دیا' یوں میری زندگی کی گاڑی صحیح راہ پر چل پڑی۔ یہ تھی میری داستانِ حیات۔ اب تم سوچ لو کہ کیا میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے؟ میں اب تم سے کل بات کروں گا۔'' احمد یہ بات کر کے آف لائن ہو گیا۔ اس نے نور کو کچھ بولنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

نور پوری رات سوچتی رہی، اسے احمد کی سچائی کے لیے کی جانے والی جدوجہد نے بہت متاثر کیا تھا اور پھر فجر کی نماز کی ادائیگی کے ساتھ ہی اس نے ایک بڑا فیصلہ کیا۔ اب اُس کا دل مطمئن تھا۔ اسے دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار تھا۔

''مجھ سے نکاح کرو گے؟'' نور نے آن لائن آتے ہی اُس سے یہ سوال کیا۔ وہ ششدر رہ گیا۔

''تم نے تو...... مجھے ابھی دیکھا بھی نہیں ہے پھر اتنا بڑا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا؟''

''میں نے تمہاری پاک روح کو دیکھا، باطن کی خوبصورتی دیکھی ہے، مجھے ظاہری حسن سے کیا لینا دینا۔'' نور نرمی سے بولی۔

''میرا رنگ کالا ہے۔'' احمد نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں بھی کوئی پری نہیں۔'' نور ہنستے ہوئے بولی۔

نور نے گھر میں سب سے پہلے اپنے والد سے احمد کی بات کرائی۔ انہوں نے وڈیو کال کے ذریعے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا۔ علی عابدین' نور کی زبانی احمد کے حالات جان کر بہت متاثر ہوئے۔ اُس نے نور سے بات چیت کے بعد ہی باقاعدہ طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ یہ جان کر علی عابدین کو اور بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ احمد نے ملائیشیا جا کر اسلامک سینٹر میں نور سے نکاح پڑھوایا اور کاغذی کارروائی کے بعد کچھ ہی عرصے میں نور ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئی۔ اس سلسلے میں پیر عادل راشدی نے ان دونوں کی بہت مدد کی۔ نور رخصت ہو کر حقیقت میں ''پیا دیس سدھاری۔''

احمد کے گھر والوں نے اس کا کلی طور پر بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے اپنی جائیداد سے بھی عاق کرنے کا اعلان اخبارات میں چھپوا دیا تھا مگر ان دونوں کو کوئی غم نہیں ہے۔ وہ اپنی دنیا میں خوش ہیں۔ کبھی کبھی بھولے بھٹکے جب احمد کا کوئی پرانا دوست ملنے آتا ہے تو احمد کو یاد آتا ہے کہ اُس کا ماضی کیا تھا ورنہ تو اُس کا حال بس اللہ کے احکامات، نبی کریمؐ کے عشق اور نور کی محبت سے مشروط ہے!!

......☆☆......

کنول عمران خان

صبح کا بھولا

طلعت اخلاق احمد کا خیال

یہ میری زندگی کے پیچ و خم ہیں
کسی کی زلفِ خم کا خم نہیں ہے

اُس لڑکی کی کہانی جس کے شوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا



WWW.PAKSOCIETY.COM

"ناجیہ یار! کبھی ڈھنگ کا سوٹ پہن لیا کرو' ہر وقت ماسی بنی رہتی ہو۔ گھر میں کبھی کوئی آ جاتا ہے۔ حالت تو دیکھو اپنی۔" سارہ نے ناجیہ کے بکھرے بال اور دورنگی شلوار قمیص کی طرف دیکھ کر بے زاری سے کہا۔

"یار' میرے سے نہیں ہوتا بناؤ سنگھار' میں گھر کے کام کروں یا خود کو سنواروں؟" ناجیہ بے دلی سے بولی۔

"ناجیہ! کم سے کم کپڑے تو ٹھیک پہن لیا کرو اور بالوں کو کتنے دنوں سے کنگھی نہیں کی؟" سارہ نے اُس کے گھونسلہ بنے بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کل دھوئے تھے تو ایسے ہی کیچر لگا لیا تھا' چل چھوڑ نا مجھے' تو بتا' کیا کھائے گی؟" اُس نے ہمیشہ کی طرح بات ٹالی۔

"اپنا حلیہ تو دیکھ' تیرے ہاتھوں سے بنا ہوا تو کچھ نہیں کھاؤں گی۔" سارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چل کمینی......" اس نے کشن اٹھا کر میری طرف کھینچ کے مارا۔ "چل آ' کچھ بناتے ہیں۔"

"ایسے نہیں' پہلے تو جا' اپنا حلیہ ٹھیک کر پھر آنا کچن میں۔" سارہ نے اُسے اُس کے بیڈ روم میں دھکیلا اور خود کچن میں چلی گئی۔

ناجیہ اور سارہ کی دوستی صرف ایک سال پرانی تھی' دونوں کے گھر آمنے سامنے تھے۔ ناجیہ ایک سال پہلے ہی اس علاقے میں آئی تھی۔ یہ نئی ہاؤسنگ اسکیم تھی جہاں آبادی کم تھی۔ آس پڑوس میں بہت کم گھر تھے جو تھوڑے بہت پڑوسی تھے' وہ آنا جانا نہیں کرتے تھے۔ سارہ تمام دن بور ہو جاتی تھی مگر جب سامنے والے گھر میں ناجیہ آئی تو وہ دوسرے ہی دن اس کے گھر چلی گئی۔ ناجیہ کے دو بچے تھے' احمر اور مہک اور اس کا میاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا پھر جلد ہی اُن دونوں میں گاڑھی چھننے لگی' دونوں اکثر ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے' بالکل بے تکلفی والا ماحول تھا۔ سارہ کا ایک بیٹا تھا۔ اس کے شوہر بینک میں منیجر تھے' روپے پیسے کی دونوں گھروں میں کمی نہ تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔

سارہ نے اپنے گھر کو بہت اچھے طریقے سے سجایا ہوا تھا۔ جو بھی آتا' تعریف کیے بغیر نہ رہتا مگر ناجیہ اس معاملے میں ذرا لاپروا تھی' اس کے گھر میں ہر جگہ ابتری ہی پھیلی رہتی۔ بچے بھی بہت شرارتی تھے' ہر وقت اچھل کود اور اودھم مچائے رکھتے۔ وہ خود بھی بولائی بولائی پھرتی رہتی تھی۔ وہ سارہ کی طرف کم ہی آتی تھی جبکہ سارہ اکثر چلی جاتی تھی۔

سارہ کا بیٹا دو سال کا تھا اس لیے اسکول وغیرہ کا جھنجھٹ نہ تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھ جانے کی عادی تھی' سو اپنا کام صبح ہی صبح نمٹا لیتی تھی پھر میاں جی کو رخصت کرنے کے بعد کھانا تیار کرتی اور سب کام سے فارغ ہو کر ناجیہ کی طرف چلی جاتی تھی۔ وہاں وہ ایسے ہی بیٹھی ہوئی ملتی۔ ٹیبل پر ناشتے کے برتن پڑے ہوتے' صوفوں پر بچوں کے کپڑے بکھرے پڑے ہیں اور وہ خود سر جھاڑ منہ پھاڑ' کبھی ایک طرف جاتی' کبھی دوسری طرف۔ سارہ اکثر اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

"تو ماسی کیوں نہیں رکھ لیتی؟" سارہ نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔

"ماسی تو میں رکھ لوں مگر آج کل کسی پر اعتبار نہیں اور پھر یہاں اتنی دور ماسی کہاں سے آئے؟ یہاں تو کسی گھر میں ماسی آتے جاتے دیکھی ہی نہیں کہ بندہ اس سے بات کرے' بس یار' گزارا چل رہا ہے۔ اب سچ پوچھو تو میرا دل ہی نہیں کرتا کچھ کرنے کو......"

"کیوں جی' عشق ہو گیا ہے کیا؟" سارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں سارہ' ہم سے کون کرے گا عشق۔" اس کے لہجے سے اداسی صاف جھلک رہی تھی۔

"کیا بات ہے' بتاؤ مجھے؟" سارہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "تمہیں کتنا ٹائم ہو گیا ہے ایک ساتھ مگر تم مجھ سے اپنے دل کی باتیں شیئر نہیں کرتیں۔ تم نے آج تک مجھے غیر ہی سمجھا نا؟" سارہ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"میں جا رہی ہوں پھر کبھی نہیں آؤں گی۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں سارہ' پلیز' ایسا مت کہو' مت جاؤ۔" سارہ مجھے روکتے ہوئے بولی۔ "ایک تم ہی تو ہو جسے میں اپنا سمجھتی ہوں' تم بھی نہیں آؤ گی تو میں تو بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔" اس نے باقاعدہ روتے ہوئے کہا۔ اسے روتا دیکھ کر سارہ پریشان ہو گئی۔ اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا' وہ تو اسے ڈرا رہی تھی۔ اس کے رونے سے ظاہر تھا کہ کوئی تو بات ہے جو اسے اندر ہی اندر کھا رہی ہے۔

"او کے ڈیئر' نہیں جاتی میں' بس تم روؤ مت اور مجھے سب بتاؤ۔" سارہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"سارہ! کئی بار سوچا کہ تمہیں بتاؤں مگر پھر یہ سوچتی کہ اس میں اپنی ہی بدنامی ہو گی تو چپ ہو جاتی۔"

"دیکھو' اپنا دکھ بتانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"سارہ! دراصل سعد کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ ہیں اور یہ سب کافی ٹائم سے چل رہا ہے۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیا......!! کیا کہہ رہی ہو یار؟ سعد بھائی؟ نہیں' مجھے یقین نہیں آ رہا۔" سارہ نے حیرت سے کہا۔ ناجیہ کے شوہر سعد بہت ڈیسنٹ اور باوقار تھے' ان کی شخصیت واقعی ایسی تھی کہ صنفِ مخالف کو اپنی جانب متوجہ کر سکے۔ "مجھے ایسے لگتے تو نہیں۔" سارہ نے بے یقینی سے کہا۔

"وہ ایسے نہ تھے مگر اب ایسے ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں اُس نے کیا جادو کر دیا ہے' وہ ان کے آفس میں ہوتی ہے۔ پہلے تو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے' اب تو میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ شروع میں تو مجھے شک تھا پھر میں نے نوٹ کرنا شروع کیا' میرا شک' یقین میں بدل گیا' بس تب سے ہی میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا ہے' پہلے میں ایسی نہ تھی۔" وہ خیالوں میں گم ہو گئی

"ہم دونوں کی زندگی بہت پرسکون اور خوشگوار تھی۔ سعد بہت محبت کرتے تھے مجھ سے۔ میں بھی اُن پر جان چھڑکتی تھی اور اُن کی خواہش کے مطابق بنی سنوری رہتی تھی۔ ہم روز گھومنے جاتے اور باہر ڈنر کرتے تھے مگر پھر پتا نہیں' کب اور کیسے ندا اُن کی زندگی میں آئی اور آتی ہی چلی گئی۔ میرا پیار' میری چاہت' سب کچھ ان کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا' اُن میں واضح تبدیلی آ رہی تھی' وہ مجھ سے اور بچوں سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ گھر سے جانے میں بہت جلدی کرتے اور واپسی پر اکثر لیٹ ہو جاتے۔ پوچھنے پر کام کی زیادتی کا بہانہ بناتے۔ میں بھی کب تک چپ رہتی' آخر ایک دن بول پڑی۔

"سعد! آپ اتنا لیٹ کیوں آنے لگے ہیں؟"

"آفس کا کام ہوتا ہے۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

"کام کی زیادتی ہے یا پھر کوئی اور وجہ ہے؟" مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میری زبان سے نکل ہی گیا۔

"دیکھو ناجیہ' میں اس طرح کی باتوں کا عادی نہیں' سن لیا؟ اپنے کام سے کام رکھو تم۔" انہوں نے غصے سے کہا اور چلے گئے۔

"میں تو سعد کا یہ روپ دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی' ان کا ایسا روکھا اور سرد انداز تو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے رونا آ گیا۔ اُس وقت مجھے اپنی بے عزتی اور بے وقعتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بات کانٹے کی طرح میرے دل میں کھب کر رہ گئی اور پھر بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

سی تلخیاں ہمارے درمیان آتی گئیں پھر وہ دن بھی آ گیا جب میرے شک کے تابوت میں یقین کی آخری کیل بھی لگ گئی۔

اُس روز حالات بہت خراب تھے' شہر میں مار دھاڑ اور ہنگامے ہو رہے تھے۔ میں نے سعد کے آفس فون کر کے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آفس میں ہی بند ہوں' حالات ٹھیک ہوں گے تو آ جاؤں گا۔ اگر زیادہ حالات خراب ہوئے تو آفس میں سو جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔'' مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ بچوں کو سلا کر میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی پھر بار بار انہیں فون کرنے لگی تو وہ ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ مجھے لگا' آفس میں ہی سو گئے ہوں گے' سو میں نے دل میں اُن کی خیریت کی دُعائیں مانگیں اور پھر سو گئی۔ میرے دل میں اُس وقت شک کا کوئی شائبہ تک نہ تھا پھر صبح ہوتے ہی میں نے فون کیا تو کسی لڑکی نے فون اٹھایا۔

وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔ ''کون؟''

''سعد کہاں ہیں؟ اور آپ کون؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ندا ہوں' اُن کی آفس کولیگ اور سعد میرے گھر پہ سو رہے ہیں۔ آپ کون؟''

''کیا......!'' میں غصے سے کانپ رہی تھی۔

''میں وائف ہوں اس کی' سعد کو فون دو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا مگر اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ سعد سو رہے ہیں۔ میرا تو برا حال تھا' میں اس آدمی کے لیے تمام رات پریشان رہی اور وہ مجھ سے جھوٹ بول کر وہاں عیاشیاں کر رہا تھا۔ اب مجھے اس سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ سعد نے آج یہ کام بھی کر دکھایا؟ آخر مجھ میں کیا کمی تھی جو اسے باہر منہ مارنے کی ضرورت پڑی؟

دوپہر میں جب وہ آیا تو مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔ ظاہر ہے' اسے سب پتا چل گیا ہوگا۔ جب میں چپ رہی تو وہ خود ہی بولا۔ ''دیکھو ناجیہ......! میں گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں' ندا مجھے پسند ہے۔ میں تمہیں صاف صاف بتا رہا ہوں' میں نا اُسے چھوڑوں گا نہ تمہیں۔'' وہ بہت سکون سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ وہ کہتا گیا' میں سنتی گئی۔ جیسے جیسے وہ بولتا گیا' میرے اندر اس کے لیے موجود پیار' محبت' احساسات' جذبات سب ختم ہوتے چلے گئے۔ جب اُس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا تو میں کیا کہتی؟

''تم بھی اپنی مرضی کی مالک ہو' تم کو یہاں رہنا ہے تو رہو' جانا ہے تو جاؤ' میں تم کو نہیں روکوں گا۔'' اس نے یہ کہہ کر گویا مجھ پر احسان کیا تھا اور چلا گیا اور میں اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ کہاں جاتی میں؟ میری خاموشی سے سعد کو کھلی چھوٹ مل گئی' اب ہم ایک ہی چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں......''

''ہوں......تو یہ بات ہے۔ اچھا' اب تو دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔'' سارہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا کرو گی تم؟ چھوڑ دو اسے وہ نہیں سمجھے گا۔'' ناجیہ نے کہا۔ ''ندا اس کے سر پر سوار ہے۔''

''تم مجھے چھوڑ دو۔'' سارہ نے کہا۔ ''اگر عورت مرد کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے تو مرد سمجھتا ہے کہ وہ کوئی تمیں مار خان ہے اور اگر عورت اسے اگنور کرنا شروع کر دے تو وہ دُم ہلاتا اس کے پیچھے آتا ہے۔''

''کیا مطلب' میں سمجھی نہیں؟'' ناجیہ نے اسے اُلجھن آمیز نظروں سے دیکھا۔

''تم تو بدھو ہو اور ہمیشہ رہنا' میری بے وقوف دوست' اس نے اپنا ہرجائی پن دکھایا تو تم بھی چپ کر کے بیٹھ گئیں۔ تم ڈٹ جاتیں' مرتی یا مر جاتی' خیر چھوڑو اب ہم دوسری چال چلتے ہیں۔'' سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا کرو گی تم؟ کیسی چال؟'' ناجیہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا چکر چلاؤں گی' مطلب افیئر......''

''کیا......! پاگل تو نہیں ہو گئی تم؟'' ناجیہ نے چلاتے ہوئے کہا۔

''ارے گھونچو' سنو تو' تم سعد پر ایسا ظاہر کرنا کہ کوئی ہے جو تمہیں چاہتا ہے' تمہاری زندگی میں کوئی داخل ہو گیا ہے اور تم اس کے ساتھ بہت خوش ہو اور اسے ایسے اشارے دینا کہ وہ یہ سب سچ ماننے لگے۔ جب اسے یہ پتا چلے گا تو پھر تماشا دیکھنا کیونکہ وہ کچھ بھی کرے' تم کچھ نہیں کہتی تو وہ آزاد ہے' اس نے تمہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تمہاری باری ہے اگنور کرنے کی' تم اسے مکمل طور پر اگنور کرو پھر دیکھو۔''

''مگر میں کس سے افیئر چلاؤں؟'' ناجیہ نے بے چارگی سے پوچھا' تب سارہ نے اسے تمام منصوبہ سمجھایا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

اُس دن سعد گھر آیا تو گھر کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی' ہر چیز اپنی جگہ پر تھی' بچے بھی معمول سے ہٹ کر خاموش تھے اور سب سے زیادہ جھٹکا اسے ناجیہ کو دیکھ کر لگا' وہ بہت مختلف لگ رہی تھی۔ آج اس نے بہت پیارا سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں تو وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آج آپ جلدی آ گئے؟'' ناجیہ نے پوچھا تو وہ چونک پڑا۔

''ہاں......ہاں......وہ......آج کام اتنا نہ تھا۔'' وہ نظریں چراتا کمرے میں چلا گیا۔ ناجیہ نے اس کا چونکنا دیکھ لیا تھا اور وہ مسکرا کر رہ گئی۔

پھر ناجیہ نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سعد کے سامنے فون پر کسی سے بات کرنے کی ایکٹنگ کرتی' وہ اگر اس کی طرف دیکھتا تو چونک کر کہتی۔ ''میں پھر بعد میں بات کروں گی۔'' یہ کہہ کر فون بند کر دیتی۔

گھر کے کام کاج کے دوران مسکراتے رہنا' گنگنانا اور خود بھی ہر وقت بنی سنوری رہنا۔ سعد یہ سب دیکھ رہا تھا' اس کے دل میں شک پیدا ہونا فطری تھا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔

ایک روز سعد گھر آیا تو ناجیہ گھر پر موجود نہ تھی۔ وہ سخت تشویش میں تھا کہ وہ کہاں گئی ہوگی اور وہ بھی مجھے بتائے بغیر؟ لاکھ اختلاف سہی مگر وہ اسے ہر جگہ بتا کر جاتی تھی اور وہ منع بھی نہیں کرتا تھا مگر آج کیا ہو گیا؟ ایسی بھی کیا پریشانی ہے؟ وہ ان ہی سوچوں میں گم بچوں کے کمرے میں گیا۔

''بیٹا! ماما کچھ بتا کر گئی ہیں کہ کہاں جا رہی ہیں؟''

''نہیں پاپا......! بس کوئی فون آیا تھا تو ماما تیار ہو کر چلی گئیں۔ کہہ رہی تھیں' جلدی آ جاؤں گی۔'' حمزہ نے لاپروائی سے جواب دیا اور اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سعد کا دماغ پک رہا تھا' یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ یہ سوچتا ہوا نیچے کی طرف آ رہا تھا کہ ناجیہ گھر میں داخل ہوئی تھی' آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی اور کافی خوش نظر آ رہی تھی' سعد پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''کہاں گئی تھیں تم اتنا تیار ہو کر؟'' سعد نے غصے سے اس کے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی دوست سے ملنے گئی تھی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''یہ کون سی دوست ہے یا کون سا دوست ہے جس سے تم اتنی رات میں ملنے گئی تھیں؟'' سعد کے لہجے میں شک ہی شک تھا۔

'جو تم سمجھ لو اور پلیز سعد' میں بہت تھک گئی ہوں' مجھے سونے دو' نیند آ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور سعد پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔ ناجیہ سیدھی اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ گئی اور سوچنے لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

'سعد احمد' میں بھی اسی طرح پریشان ہوتی تھی مگر تمہیں کہاں پروا تھی کیونکہ تم مرد ہو' تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ آج تمہیں فکر ہو رہی ہے کہ میں کہاں جا رہی ہوں' کس سے مل رہی ہوں؟ کیوں؟ کیوں؟ جب میں تم سے سوال کرتی تھی' تب تو تم مجھے دیکھتے بھی نہیں تھے پھر آج کیوں مجھ سے سوال کیے؟ تمہاری پریشانی' تمہارا شک' یہ سب مجھے مضبوط بنا رہا ہے' میں اپنا آپ منوا کر رہوں گی سعد احمد' میں اپنا گھر برباد نہیں ہونے دوں گی...... کبھی نہیں۔'

دوسری طرف سعد بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ ناجیہ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کہاں سے بات شروع کرے کیونکہ چور اس کے دل میں بھی تھا۔ 'کہیں ناجیہ کسی اور میں تو...... نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔' وہ بے چینی سے اٹھ بیٹھا۔

اگلی صبح ناجیہ نے سارہ کو فون پر تمام حالات سے آگاہ کیا۔

''ہاہاہا...... دیکھا میری جان' میں نہ کہتی تھی' مرد خود جتنا بھی اِدھر اُدھر منہ مارے مگر یہ کبھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کا کسی سے افیئر ہو' بس تم دیکھو' اب آگے کیا ہوتا ہے؟'' سارہ نے کہا۔

اُدھر سعد کی بے چینی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا کام بھی متاثر ہو رہا تھا اور اس کی محبوبہ ندا بھی۔ وہ اس کی پریشانی نوٹ کر رہی تھی۔

''کیا بات ہے سعد' آج کل بہت پریشان پریشان سے لگ رہے ہو؟'' ایک دن ندا نے پوچھ ہی لیا۔

''کچھ نہیں' بس ذرا کام کی پریشانی ہے۔'' سعد نے ٹالنے والے انداز میں کہا کیونکہ سچ بتانے میں اپنی ہی بے عزتی تھی۔

''چلو' آج لنچ باہر کرتے ہیں۔ میرا ابھی دل نہیں ہے کام کرنے کو' تھکاوٹ ہو رہی ہے' وہاں سے گھر چلے جائیں گے۔'' ندا نے ایک ادا سے کہا۔

''نہیں' آج نہیں پھر کبھی۔'' وہ کہہ کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ندا اسے دیکھتی رہ گئی۔

'کچھ تو ہے ورنہ تم اس طرح مجھے کبھی انکار نہیں کرتے۔' ندا نے سوچتے ہوئے خود سے کہا۔

''پاپا......! ہمیں کہیں گھمانے لے جائیں' ہم کتنے دنوں سے باہر نہیں گئے۔'' دونوں بچے باہر جانے کی ضد کرنے لگے۔

''اوکے بیٹا' آپ تیار ہو جاؤ' ڈنر بھی باہر ہی کریں گے۔''

''ہرے......!'' دونوں بچوں نے خوشی سے نعرہ لگایا اور تیار ہونے چلے گئے۔ سعد کا موڈ نہیں تھا مگر وہ بچوں کی وجہ سے راضی ہو گیا۔ سی ویو پر بچوں نے خوب موج مستی کی' گھڑ سواری' اونٹ کی سواری اور پانی میں نہانا۔ بچے بہت خوش تھے' سعد بھی بچوں کو خوش دیکھ کر خوش تھا' ناجیہ بھی ساتھ تھی مگر اس کا دھیان میسجز پر زیادہ تھا۔ اس کی یہ حرکت سعد کی نظروں سے اوجھل نہ تھی۔ وہ جز بز ہو رہا تھا مگر پبلک پلیس پر تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ میسج پڑھتے ہوئے ناجیہ کے چہرے پر آنے والی رونق کو دیکھ کر اس کا شک' یقین میں بدل گیا کہ کوئی تو ہے۔ خیر' جیسے تیسے ڈنر کیا اور گھر واپس آئے۔ اس رات بھی طرح طرح کی سوچوں نے سعد کو سونے نہیں دیا' اُس نے ناجیہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے کا سکون اس کی نیند اڑا رہا تھا۔ وہ سوچتا گیا۔ اس لمحے اسے اپنے اندر سے آواز آنے لگی جو شاید اس کے ضمیر کی آواز تھی۔

''سعد احمد......! قدرت تمہیں آئینہ دکھا رہی ہے۔ تمہاری بیوی نے کب تم سے بے وفائی کی تھی' کب تمہاری کسی بات سے پیچھے ہٹی؟ مگر تم نے اس کی قدر نہ کی' اس کی چاہت' محبت کو ٹھکرا دیا یہاں تک کہ تم نے تو اس سے بات تک کرنا بھی چھوڑ دی اور اب اگر وہ کسی بھی وجہ سے خوش ہے تو تمہیں کیوں پریشانی ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ جان چھوٹی کیونکہ تم تو اب ندا سے شادی کرنے والے ہو نا۔'' ضمیر نے اسے جھنجھوڑا تو وہ مزید بے چین ہو گیا اور ان ہی سوچوں میں گم جانے کب سو گیا۔

''کیوں نہیں آؤں گی' تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔'' ناجیہ نے مسکراتے ہوئے فون پر کہا۔ یہ آواز سعد نے سن لی۔ وہ اس کے پاس ہی آ رہا تھا۔ وہ فوراً دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور ناجیہ کی باتیں سننے لگا۔

''یار' کیا کروں' میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی' نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے تم نے مجھ پر کہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔'' ناجیہ کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا پھر دوسری طرف سے ملنے کا وقت اور جگہ کا تعین کیا گیا۔

''اوکے' اُسی جگہ نا جہاں ہم پہلے ملے تھے؟'' ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں آ جاؤں گی۔ اچھا' خدا حافظ!'' ناجیہ نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

یہ سب سن کر سعد کا خون کھول رہا تھا' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ناجیہ کا گلہ دبا دے مگر ابھی وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا' وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا اس لیے وہ ضبط کرتا ہوا آفس کے لیے نکل پڑا۔

راستے بھر وہ سوچتا آیا کہ آج یہ قصہ ختم کر دوں گا۔ 'بس یار' ایک فیصلہ کرنا ہوگا ناجیہ کو' میں مزید اس آگ میں نہیں جل سکتا۔' وہ آفس میں بھی سارا وقت گھڑی دیکھتا رہا۔ اس کی بے چینی کو سب نوٹ کر رہے تھے۔

''کیا بات ہے ڈیئر! تم بتاتے کیوں نہیں' کیا ہوا ہے ناجیہ سے؟'' ندا نے پوچھا۔

''پلیز' مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ یہاں سے'' وہ یکدم غصے سے دھاڑا۔

''تم مجھ پر چلائے......؟'' ندا کو بھی غصہ آ گیا۔

''ہاں...... اور کان کھول کر سن لو کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے...... گیٹ آؤٹ......'' وہ غصے سے بولا۔

''وہاٹ......؟ تم نے مجھے گیٹ آؤٹ کہا؟'' ندا غصے سے کانپ رہی تھی۔

''ہاں' تمہیں ہی کہا ہے' اب شکل گم کرو......'' وہ دھڑام سے دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔

سعد کرسی پر گر سا گیا' اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا' اُس وقت تین بجے تھے۔ وہ فوراً آفس سے باہر آیا' گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کئی بار اس کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جہاں کسی کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ وہ ناجیہ کا پیچھا کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ جاتی کہاں ہے؟ اور کس سے ملتی ہے' آج وہ سب جاننا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اس کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا مگر ٹائم تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

خاصے انتظار کے بعد اسے ناجیہ کا چہرہ نظر آ گیا۔ وہ تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ ناجیہ آج بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی' لائٹ پنک ساڑی میں وہ بہت فریش لگ رہی تھی اور اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔ وہ سبک رفتاری سے چلتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو سعد نے بھی اگنیشن میں چابی گھمائی اور خاص فاصلے پر گاڑی رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ آخر پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی سی ویو کے قریب ایک ریسٹورنٹ کے باہر رک گئی۔ سعد نے بھی ایک طرف کر کے گاڑی پارک کی اور دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر اندر داخل ہو گئے۔ ناجیہ ایک ٹیبل کی طرف بڑھی۔ سعد بھی ایک ایسی ٹیبل پہ بیٹھ گیا جہاں سے وہ ناجیہ کی ٹیبل پر نظر رکھ سکے اور اُن کی گفتگو سن سکے۔ اُس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے لیے چائے کا آرڈر دیا' گو اس کا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ ایسے تو بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ ایک ایک پل اس پر بھاری گزر رہا تھا' اس کی نظریں جیسے ناجیہ پر چپک ہی گئی تھیں' وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

''اب آ بھی جاؤ' میں کب تک ویٹ کروں؟'' اس کے لہجے میں مصنوعی ناراضگی تھی۔ ''اوکے......'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ سعد کی نظریں بھی گیٹ پر جا رکیں' اس کا غصہ عروج پر تھا' وہ بہت ضبط کیے بیٹھا تھا کہ اچانک گیٹ پر سارہ نمودار ہوئی۔ وہ اندر آ کر پہلے اردگرد کا جائزہ لینے لگی اور پھر ناجیہ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ وہ دونوں بہت گرم جوشی سے ملے۔

''یار' تو بھی نا' اب بس کر۔'' ناجیہ نے سارہ سے کہا۔

''کیا بس کروں؟'' سارہ بولی۔

''یار' سعد بہت پریشان رہنے لگا ہے' کہیں کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے......''

''بس یہی خرابی ہے تیرے اندر دل بڑا نازک ہے تیرا۔'' سارہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''ہاں یار کیونکہ میں واقعی اس سے محبت کرتی ہوں' میں نے بھی دیکھا ہے کہ وہ میری وجہ سے میرے لیے بہت پریشان ہے' بس میں اسے مزید پریشان نہیں کر سکتی۔'' ناجیہ بولی۔

سعد' یہ سب سن رہا تھا اور اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور ان کی ٹیبل کی طرف بڑھا۔ سعد کو دیکھتے ہی دونوں کھڑی ہو گئیں۔

''آپ' یہاں؟'' ناجیہ کے منہ سے نکلا۔

''تو یہ ہے تمہارا نیا دوست؟'' سعد نے سارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سعد' میں نے یہ سب اپنا گھر بچانے کے لیے کیا؟'' ناجیہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''سعد بھائی......!'' سارہ نے ناجیہ کو اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ ''آپ کو ٹھیک راستے پر لانے کے لیے یہ میرا آئیڈیا تھا کیونکہ آپ کی بے وفائی کی وجہ سے ناجیہ نے خود کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اگر میں یہ سب نہ کرتی تو ایک دن آپ کا گھر تباہ ہو جاتا۔ سعد بھائی......! عورت اپنے گھر اور سہاگ کی سلامتی کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہے جیسا کہ ناجیہ نے کیا۔ اس نے اپنی نیچر سے ہٹ کر ایک ڈرامہ کیا صرف اور صرف آپ کے لیے' آپ کا پیار پانے کے لیے تو اس میں کیا غلط ہے؟ عورت سب برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے شوہر کے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی' بس سعد بھائی......! مجھے اور کچھ نہیں کہنا' میں جا رہی ہوں ناجیہ......! اللہ تمہارا سہاگ سلامت رکھے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

''رکو سارہ......!'' سعد نے اُسے آواز دی۔

سارہ رک گئی۔

''تھینک یو......! تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اپنی جنت کو باہر تلاش کرنے نکلا تھا مگر وہ تو میرے گھر میں ہی تھی۔ تھینک یو ویری مچ۔'' سعد نے تشکر بھری نظروں سے سارہ کو دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

''سوری ناجیہ' میں بھٹک گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔'' سعد نے ناجیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ناجیہ کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کے شوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سعد کا ہاتھ تھام کر مسکرانے لگی اور پھر دونوں ایک ساتھ باہر نکل پڑے ایک نئی زندگی کی شروعات کے لیے جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں اُن کی منتظر تھیں۔

......☆☆......

بابر نایاب

احساس نہیں مرتا

شفیق احمد ندیم کا خیال

علم کو تھام کے جو محوِ جستجو ہوگا
وہی تو ہوگا، جو ہر بار سُرخ رو ہوگا

دادا اور پوتے کی علم اور محبت سے مربوط ایک جیتی جاگتی کہانی



WWW.PAKSOCIETY.COM

''دادا ابو! آج میں بھی آپ کے ساتھ زمینوں پر جاؤں گا۔'' ننھے سلطان نے اپنے دادا نواز حسین سے ضد کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''پتر' تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور ہماری زمینیں بہت دور ہیں تو تھک جائے گا۔''

''نہیں' میں نہیں تھکوں گا، میں لازمی جاؤں گا۔ وہ شرفو روز اپنے ابا کے ساتھ زمینوں پر جاتا ہے اور میرے ابا ہوتے تو وہ بھی مجھے لے جاتے۔''

سلطان کی اس بات نے نواز حسین کے دل پر جیسے چھریاں چلا دی تھیں۔ ''نہ پتر' آیندہ کبھی ایسا مت کہنا' تیرا دادا تجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ شرفو تو (لٹ) آوارہ ہے' پر تو بڑا اچھا بچہ ہے نا! چل' آ جا تو بھی میرے ساتھ چل۔''

گاؤں کی کچی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے نواز حسین اپنے پوتے کے ساتھ اپنی آبائی زمینوں کی طرف جا رہا تھا۔ گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ سلطان کا بڑا دل چاہتا تھا' وہ بھی ان بچوں کے ساتھ کھیلے مگر اُس کا دادا اُسے کھیلنے نہیں دیتا تھا۔ اُس کے دادا نے اُسے کھیلنے کے لیے شہر سے بڑے اچھے اچھے کھلونے لا کر دیے تھے جو گاؤں کے کسی بچے کے پاس بھی نہیں تھے۔ اب گلیاں ختم ہو گئی تھیں اور کچی سڑک شروع ہو گئی تھی اور اس کچی سڑک کے آس پاس ہرے بھرے لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ سلطان بڑی محویت کے ساتھ ان کھیتوں اور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں کو دیکھ رہا تھا۔

کسان اس دھرتی کا سینہ چیر کر فصل اُگاتا ہے اور اس فصل کے لیے اُسے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ اناج کے ہر دانے میں کسان کا صرف پسینہ ہی شامل نہیں ہوتا بلکہ اُس کا خون شامل ہوتا ہے' یہ نوالہ کھانے والا نہیں جانتا۔

سلطان کے دادا کے ایک ہاتھ میں مکئی کی روٹی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اپنے پوتے کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ راستے میں چودھری فلک شیر کے کھیت تھے جہاں وہ اپنے منشی بشیر کے ساتھ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔

''سلام چودھری صاحب!'' نواز حسین نے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے ادب سے چودھری کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! ہاں بھئی نواز حسین' کیا حال ہے اور کیا سوچا ہے تو نے اپنی زمینوں کا؟'' چودھری نے نواز حسین سے پوچھا۔

''چودھری صاحب! یہ زمینیں ہماری زندگی کی کل جمع پونجی ہیں' ہم انھیں نہیں بیچ سکتے' بس اللہ خیر سکھ رکھے' یہ زمین ایسے ہی اچھی فصل دیتی رہے اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔'' نواز حسین نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جو تیری مرضی ورنہ جتنی قیمت میں نے تیری زمین کی لگائی ہے' اُتنی کوئی اور نہیں لگا سکتا۔''

نواز حسین سنی اَن سنی کر کے چپ چاپ اپنے پوتے کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ گیا تھا تو چودھری نے اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ''جب میرا داؤ لگ گیا نا تو تجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''دادا ابو! آپ نے یہ چودھری کو جھک کر سلام کیوں کیا؟'' سلطان نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے دادا سے پوچھا تو نواز حسین اپنے پوتے کے سوال کو سن کر دنگ رہ گیا۔

''پتر' اس لیے اُسے جھک کر سلام کیا'' گاؤں کا بڑا ہے۔'' نواز حسین نے جواب دیا۔

''پر دادا ابو! وہ تو آپ سے عمر میں بہت چھوٹا تھا' اُس کا تو کوئی بھی بال سفید نہیں اور آپ کے سارے بال سفید ہیں۔''

ننھے سلطان کا یہ سوال سن کر نواز حسین لاجواب ہو گیا' اس کا کوئی بھی جواب نواز حسین کے پاس نہیں تھا۔ ''بس' بس' زیادہ باتیں نہ کر' وہ دیکھ ہمارے کھیت آ گئے۔'' اُس نے اپنے پوتے کی توجہ کھیتوں کی طرف مبذول کروائی...... ابھی نواز حسین کی فصل پک رہی تھی۔ سلطان بھاگتا ہوا کھیتوں میں گھس گیا۔

نواز حسین کا یہ ایک ہی پوتا تھا اور اُس کی جان اپنے پوتے میں پوشیدہ تھی۔ نواز حسین کے دو بیٹے تھے' ایک بیٹا بہرام جو سلطان کا ابا تھا، وہ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا تھا اور دوسرا بیٹا اکرم جو شہر میں سرکاری ملازم تھا۔ جوان بیٹے کی موت نے نواز حسین کو بہت دلبرداشتہ کر دیا تھا اور اگر جینے کی اُمنگ پیدا ہوئی تھی تو اسی پوتے کی وجہ سے جبکہ سلطان کی ماں شمع کی تو زندگی ہی اُجڑ گئی تھی مگر وقت بہت بڑے بڑے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے' شمع کے بھی زخم مندمل ہو گئے تھے مگر سلطان کے ابا کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کو یاد کر کے وہ کبھی کبھی تنہائی میں روتی رہتی تھی۔

نواز حسین کی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری خواہش یہی تھی کہ سلطان پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے' اسی وجہ سے وہ اپنے پوتے کو اچھا ماحول دینا چاہتا تھا۔ سلطان ابھی چھوٹا تھا مگر نواز حسین اُسے ایسی باتیں سمجھایا کرتا تھا جو کہ پوتے کے ننھے دماغ میں نہیں سماتی تھیں مگر نواز حسین کو یقین تھا کہ ایک دن یہ سبھی باتیں سلطان اپنی زندگی میں عملی طور پر اپنائے گا۔

نواز حسین سلطان کو بتایا کرتا تھا کہ...... ''پتر' میں نے پاکستان بنتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تیرے جیسے کئی ماؤں کے لال میں نے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں کٹتے ہوئے دیکھے ہیں' یہ پاکستان ایسے نہیں بن گیا' اس کے لیے ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔''

نواز حسین جب قائداعظم کے بارے میں بات کرتا تو سلطان اپنے دادا کے لہجے میں ایک عجیب سی سرشاری محسوس کرتا' عقیدت اور فرطِ جذبات سے سلطان کے دادا کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور کہتا۔ ''پتر' وہ انسان نہیں' فرشتہ تھا۔ اُس کا لباس تو فرنگیوں جیسا تھا' پر اس کا دل ہم مسلمانوں کے لیے دھڑکتا تھا۔ میں پانچویں جماعت میں تھا جب میں نے قائداعظم کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اُس کے لہجے میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا' وہ بات کرتا تو لگتا جیسے اُس کا لفظ لفظ سچائی سے بھرپور ہو، اُس نے پاکستان لڑے جھگڑے بغیر اپنے علم اور قانون کے ذریعے حاصل کیا تھا۔''

سلطان جو اپنے دادا کی باتیں بہت غور سے سنتا رہتا تھا، وہ چھوٹی سی عمر میں اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنے لگا اور پھر ایک روز نواز حسین نے سلطان کو پڑھنے کے لیے اُس کے چاچا کے پاس شہر بھیج دیا اور جاتے ہوئے کہا...... ''پتر' جب واپس آنا تو کچھ بن کر آنا اور یاد رکھنا' منزل قریب ہو جائے تو میرے بلاوے پر بھی مت آنا' میں تجھے تیری منزل پر دیکھنا چاہتا ہوں اور یاد رکھنا' شہر کی رنگینیوں میں کھو مت جانا، وہاں زندگی دوڑ رہی ہے، ہر کوئی بھاگ رہا ہے' یہاں اپنے (پنڈ) گاؤں میں کوئی بیمار ہو جائے تو اُسے پورا گاؤں پوچھنے والا ہوتا ہے، وہاں کسی کو اپنے ہمسایوں کا بھی نہیں پتا ہوتا۔ پتر' میں اپنے سوہنے رَب سے تیری کامیابی کے لیے دُعا کرتا رہوں گا......'' سلطان اپنے دل میں سوچتا کہ...... کون کہتا ہے میرا دادا اپنے دور کی پانچ جماعتیں پاس ہے!

وقت کبھی ٹھہرتا نہیں ہے، سو اپنی رفتار سے تیز موجوں کی طرح بہتا گیا اور سلطان اپنی زندگی اور جوانی کی خواہشوں کو کتابوں میں گھول کر پڑھتا اور آگے بڑھتا گیا۔ نواز حسین اپنے پوتے کو خط لکھتا رہتا اور ہر خط میں اُسے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننے کی نصیحت کرتا رہتا...... اور پھر ایک دن ایسا آیا جب سلطان کو اُس کی منزل بالکل قریب نظر آ رہی تھی۔ اُس روز سلطان کا سی ایس ایس کا امتحان تھا اور وہ اس سلسلے میں گھر سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ...... اچانک اُس کا چاچا تیز بھاگتا ہوا آیا تھا' اُس کا سانس پھولا ہوا تھا اور بہت بدحواس نظر آ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"چاچا' کیا ہوا' خیریت تو ہے نا؟" سلطان نے اپنے چاچا سے پوچھا۔

"پتر! ابھی ابھی فون پر تیری ماں نے بتایا ہے کہ تیرا دادا اس دنیا میں نہیں رہا۔" یہ کہتے ہوئے سلطان کا چاچا سلطان کو گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ' سلطان کو لگا جیسے اُس کی جان نکل گئی ہو، وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اُس کی دنیا اندھیر ہوگئی تھی، جس کی اُنگلی پکڑ کر چلنا سیکھا، جس کی رہنمائی سلطان کو علم کی روشنی کی سمت لائی، اَب وہ ہستی دنیا سے چلی گئی تھی۔

جانا تو سبھی کو ہے مگر سلطان تو اپنے دادا کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا مگر وہ اتنا بھی انتظار نہ کر سکا' سلطان اپنے دادا کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا مگر اُس روز سلطان کا وہ امتحان بھی تھا جس کے لیے وہ شب و روز محنت کرتا رہا تھا۔

چاچا اپنے ساتھ سلطان کو گاؤں لے جانے لگا مگر سلطان نے اپنے چاچا کو کہا...... "چاچا' تجھے اکیلا ہی گاؤں جانا پڑے گا' مجھے دادا نے کہا تھا کہ جب منزل قریب ہو تو میرے بلاوے پر بھی مت آنا' بس تم میری طرف سے اُن کی پیشانی پر بوسہ دے دینا......" یہ کہہ کر وہ اپنے اندر جذبات کا سمندر چھپائے امتحان دینے چلا گیا تھا۔

☆......☆

سلطان نے مقابلے کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی اور پھر جلد ہی مختلف مراحل سے گزرتا وہ اعلیٰ پولیس آفیسر بھی بن گیا تھا...... اُسے اپنی منزل تو مل گئی تھی مگر منزل پر لے جانے والا اُسے راہ میں چھوڑ گیا تھا...... اور اب وہ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کے روپ میں اپنے گاؤں کو لوٹ رہا تھا۔ اُس کے دل و دماغ پر اپنے دادا کے ساتھ بتائے ہوئے لمحات کسی فلم کی صورت چل رہے تھے۔

جب سلطان کی جیپ گاؤں میں داخل ہوئی تو وہاں کھلبلی مچ گئی، ہر کوئی سلطان کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا...... "وہ دیکھو' نواز حسین کا پوتا جا رہا ہے۔" پورے گاؤں میں سلطان کی بلے بلے ہو گئی تھی، علاقے کا تھانیدار جسے گاؤں والے زمین کا خدا سمجھتے تھے' وہ سلطان کے پیچھے باڈی گارڈ کی طرح چل رہا تھا...... جب سلطان اپنے گھر میں داخل ہونے لگا تو اُسے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ کاش' آج اُس کا دادا استقبال کرتا تو کیا بات ہوتی! ...... ایک آہ سلطان کے سینے سے نکلی اور پھر جب گھر کے دروازے پر سلطان کی ماں نے اُسے اپنے سینے سے لگایا تو وہ اپنی ماں کا لمس محسوس کر کے دیوانہ وار روتے ہوئے بولا۔ "اماں......! دادا کو تو نے روکا کیوں نہیں، کچھ دن کے لیے تو روک لیتی کہ وہ میری کامیابی دیکھ لیتا۔"

"پتر......! صبر کر، تُو نے اپنے دادا کی لاج رکھی' آج تو اُن کے خوابوں کی تعبیر بن گیا ہے۔ اگر تُو روئے گا تو اُن کی رُوح کو دکھ ہوگا۔" سلطان نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا تھا۔

اُس روز دور دور سے رشتے دار اور برادری والے سلطان کے گھر آرہے تھے کہ سلطان کے اتنا بڑا افسر بن جانے کی خوشی جو تھی۔ علاقے کا ایم این اے اور چودھری فلک شیر بھی خود چل کر سلطان کے گھر مبارک باد دینے آئے تھے۔ ایم این اے نے جاتے ہوئے سلطان کو کہا تھا...... "مجھے خدمت کا موقع ضرور دیجیے گا۔"

"بس آپ مہربانی کر کے یہاں اسکول بنوا دیں، یہ میری خدمت سے بڑھ کر گاؤں والوں کی خدمت ہوگی۔" ایم این اے نے سلطان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور اسکول بنوائے گا۔

چودھری فلک شیر' سلطان کو جھک کر سلام کرتے ہوئے بولا تھا۔ "پتر' مبارک ہو' آج تیرا دادا ہوتا تو کتنا خوش ہوتا......" سلطان کے ذہن میں فوراً ماضی کی وہ فلم چلنے لگی تھی جب سلطان کا دادا اس چودھری کو جھک کر سلام کرتا تھا، آج وہی چودھری، نواز حسین کے پوتے کو جھک کر سلام کر رہا تھا۔ قدرت اپنے مکافاتِ عمل ضرور دکھاتی ہے مگر اُن کے لیے جو سمجھ رکھتے ہوں۔

سلطان نے چودھری کو کہا تھا۔ "چاچا' خدارا' مجھے جھک کر سلام مت کرو، میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں اور میری تعلیم و تربیت اور میرا مذہب مجھے یہ نہیں سکھاتا کہ میرے بڑے میرے آگے جھکیں۔" یہ باتیں سُن کر چودھری کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ واقعی تعلیم انسان کو نکھار دیتی ہے، سچ ہے، جو چیز علم سے جیتی جا سکتی ہے' وہ طاقت سے حاصل نہیں ہوتی۔

علم کتنا اُجالا پھیلا دیتا ہے، یہ اُس روز سب گاؤں والوں کو پتا چل گیا تھا۔ گاؤں کا ہر باسی ہر مکین سلطان کے دادا کی تعریف کے ساتھ یہ کہہ رہا تھا کہ...... نواز حسین، ہم سب پر بازی لے گیا۔ ہم نے اپنے وارثوں کو زمینوں کے لیے لڑنا جھگڑنا سکھایا ہے مگر اُس نے علم سکھایا۔

سلطان ان سب لوگوں سے فارغ ہو کر اپنے دادا کی قبر پر گیا تھا۔ دادا کی قبر سے اگربتیوں کی بھینی بھینی سی خوشبو اُٹھ رہی تھی...... سلطان نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تھے تو نا جانے کتنے آنسو اُس کی آنکھوں میں آگئے تھے اور شدتِ جذبات سے آواز بھرا گئی تھی...... سلطان کو اپنے دادا کی بوڑھی سانسیں اپنے بالکل قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔ اُسے ایسا لگا تھا کہ جیسے دادا ابو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ہو کہ...... "پتر......! جسم ضرور دفن ہو جاتا ہے مگر محبت کا خوبصورت احساس کبھی دفن نہیں ہوتا، احساس تو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔"

☆......☆

غزل

اگر کسی کو بشارتوں کی نہیں ضرورت
گناہ کر کے ندامتوں کی نہیں ضرورت
میرے حوالے سے جانتا ہے وہ سب حقائق
اسی لیے تو وضاحتوں کی نہیں ضرورت
جو سچ کے بدلے میں کھو چکا ہو تمام رشتے
اسے کسی کی حقارتوں کی نہیں ضرورت
ملی ہیں اپنوں سے نفرتیں بے شمار مجھ کو
کہ اَب تو غیروں سے نفرتوں کی نہیں ضرورت
میں دشمنی کا نہیں ہوں قائل' اسے پتا ہے
عدو کو مجھ سے عداوتوں کی نہیں ضرورت
احساں جتا کے جو کر دیا ہے نڈھال تم نے
مجھے تو ایسی محبتوں کی نہیں ضرورت
میری غریبی ہے میرا سب سے بڑا محافظ
تو راہزنوں سے مزاحمتوں کی نہیں ضرورت
لاتعلق سا ہو گیا ہے ندیم سب سے
کہ جیسے اس کو مسرتوں کی نہیں ضرورت

شفیق احمد ندیم

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

رانا محمد شاہد

گناہ کا بوجھ

حامد علی سید کا خیال

یہی سچائی ہے اب زندگی میں
تماشا ہی تماشا رہ گیا ہے

دیور اور بھابی کے رشتے کے درمیان سانس لیتی ایک عبرت انگیز کہانی



میں انہیں ہمیشہ بھابی کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں اور مجھے چھوٹا بھائی سمجھتی تھیں۔ میں اُن کی ہر مالی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات ہوں یا گھر کی ضرورت کی کوئی چیز' سب میری ذمہ داری تھی۔ بھابی کو بیوگی کی زندگی گزارتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اُن کے تین بچے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ بھابی اکثر اداس و غمگین رہتی ہیں۔ میں نے بارہا اُن سے اس اداسی کی وجہ دریافت کرنا چاہی لیکن انہوں نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا' تاہم مجھے اندازہ تھا کہ کوئی غم اندر ہی اندر انہیں کھائے جا رہا ہے اور پھر آخر ایک دن انہوں نے میرے بے حد اصرار پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جسے وہ ایک عرصے سے اپنے اندر چھپائے بیٹھی تھیں' شاید اس طرح انہوں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی کچھ اس طرح بیان کی تھی۔

''شہاب بہت اچھے شوہر تھے' بہت زیادہ محبت کرنے والے اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھنے والے۔ شمس میرا دیور تھا' بی اے کا طالب علم اور خوبرو نوجوان تھا۔ وہ مجھے بھابی سے زیادہ اپنی بڑی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا اور میں بھی اسے چھوٹے بھائی کا درجہ دیتی تھی چونکہ اُس کی کوئی بہن یعنی میری نند نہ تھی اس لیے وہ ہر بات مجھ ہی سے شیئر کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بے تحاشہ باتیں کرتا' یونیورسٹی کی باتیں سناتا اور اپنی اُس یونیورسٹی فیلو کے متعلق بتاتا جسے وہ بہت چاہتا تھا۔ وہ اکثر کہتا۔ ''بھابی......! ثمینہ کے والدین سے بات کرنے کے لیے آپ کو بھیجوں گا۔'' تو میں ڈھیرے سے مسکرا دیتی۔

میری اور شہاب کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ ہمارے دو بچے تھے' ایک بیٹا' ایک بیٹی۔ ہم اپنی زندگی میں بہت خوش تھے پھر وقت نے اپنا رنگ بدلا اور وہ کچھ ہو گیا جس کا کسی کو تصور بھی نہ تھا۔ میرے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ اپنی زندگی ہار گئے۔

ہمارے اور شہاب کے خاندان میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ جب کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے اور اُس کا کوئی دیور کنوارا ہو تو پھر اُسی سے اُس کا نکاح پڑھا دیا جاتا تھا۔ شمس مجھے اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھتا تھا پھر وہ یونیورسٹی کی ایک لڑکی سے محبت بھی کرتا تھا جس کا علم گھر میں صرف مجھے تھا کیونکہ وہ اپنی ہر بات مجھے ہی بتاتا تھا۔ میں جوان تھی اس لیے میرے ساس سسر نے شمس پہ زور ڈالا کہ بیٹا......! اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے کہ جمیلہ سے تمہاری شادی کر دی جائے اور پھر ہمارے خاندان کی روایت بھی یہی ہے۔

''ماں جی! میں کیسے جمیلہ بھابی سے شادی کر سکتا ہوں۔ وہ جسے میں ہمیشہ اپنی بڑی بہن سمجھتا رہا' اُسے کیسے بیوی کے روپ میں قبول کر سکتا ہوں؟'' اُس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

میری عدت کے دن پورے ہو چکے تھے اور اب میرے ساس سسر کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ شمس پر زور دے رہے تھے کہ بیٹا! جمیلہ سے شادی کر لو ورنہ ہمارے بیٹے کی عزت زمانے کی ٹھوکروں میں ہو گی۔ ایک دن اُس کے والد نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بیٹا! ہم بھی چاہتے تھے کہ تمہاری شادی تمہاری مرضی سے ہو' شہنائیاں بجیں' تمہارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماتھے پہ بھی سہرا سجے لیکن حالات اَب اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ جمیلہ سے تمہارا نکاح کر دیا جائے۔"

"خدارا......! مجھے اس امتحان میں مت ڈالیں۔" شمس نے تقریباً روہانسی آواز میں کہا پھر جب اُسے یقین ہوگیا کہ اُس کی جان چھوٹنے والی نہیں تو ایک دن اُس نے کہہ دیا۔

"میں جمیلہ بھابھی اور اُن کے بچوں کی خاطر شادی نہیں کروں گا اور تمام عمر اُن کی کفالت کی ذمہ داری اٹھاؤں گا لیکن خدا کے لیے' مجھے شادی کا مت کہیں۔" یہ کہتے ہوئے شدتِ جذبات سے شمس کا چہرہ سرخ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اُس کے جذبات واحساسات کی داد دی اور اُس کی اتنی بڑی قربانی پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرے ساس سسر یہی کہہ رہے تھے کہ بیٹا! تو جمیلہ سے شادی کرلے ورنہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ والدین کے علاوہ جب اُس کے رشتے داروں نے بھی زور دیا تو وہ مجبور ہوگیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ نکاح کیے بنا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ نکاح کے لیے مان گیا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُس نے کیا سوچ رکھا ہے پھر میرا' شمس کے ساتھ نکاح ہوگیا۔

پہلی رات کو شمس نے مجھ سے کہا۔ "گوکہ قانونی اور شرعی اعتبار سے آپ میری بیوی ہو لیکن آپ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنی بڑی بہن سمجھا ہے لہٰذا آپ کو بیوی کے روپ میں کیسے قبول کرسکتا ہوں؟ اس لیے آج سے ہم دنیا کے لیے تو میاں بیوی ہوں گے مگر خلوت میں ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا اور مجھے امید ہے' آپ میرا ساتھ دوگی۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں شمس' اس قربانی میں' میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گی۔" میں نے جواب دیا۔

اس طرح ہماری شادی شدہ زندگی کا آغاز ہوگیا۔ ہم دنیا کے لیے تو میاں بیوی تھے مگر حقیقتاً ہمارے درمیان ایسا رشتہ تھا جو بہن بھائی کے درمیان ہوتا ہے۔ شمس کو ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔ اب چونکہ وہ بظاہر میرا شوہر تھا اس لیے سب کے سامنے میں اس سے ادب واحترام سے بات کرتی۔ ہماری شادی کو ایک سال گزر گیا اور بچے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو ساس' سسر کو تشویش ہونے لگی۔ سسر نے ڈھکے چھپے الفاظ میں شمس کو اپنا چیک اپ کروانے کو کہا۔ اس معاملے میں مجھے تو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا کہ میں بانجھ نہیں تھی کیونکہ شہاب سے میرے دو بچے تھے لیکن کسی کو کوئی کیا بتاتا کہ شمس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ اپنی محبت کی قربانی' اپنے نفس کی قربانی' اپنی خواہشات کی قربانی اور اپنے جذبات واحساسات کی قربانی۔

وقت گزرتا رہا اور ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے جب فطری تقاضہ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ میری ساس روایتی طریقے اختیار کرتے ہوئے اولاد کی خاطر اپنے بیٹے کے لیے تعویذ وغیرہ لاتیں لیکن ہم دونوں جانتے تھے' یہ سب بے سود تھا۔

وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا جب میں اپنے والدین کے گھر دوسرے شہر آئی ہوئی تھی۔ میری ایک پڑوسن کا فون آیا کہ تمہارے شوہر شمس نے خودکشی کرلی ہے...... یہ خبر سن کر میں دم بخود تھی' مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا مضبوط شخص جس نے اپنے اندر کے نفس کو مار دیا' خودکشی بھی کرسکتا ہے؟ میں نے فوراً بچوں کو ساتھ لیا اور گھر آگئی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ میرے ساس' سسر جن کے ایک بیٹے کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا اور دوسرے نے خودکشی کرلی تھی' شدتِ غم سے نڈھال تھے۔ میری ساس بے ہوش ہوچکی تھی۔ سسر بھی جوان بیٹے کی موت پر نوحہ کناں تھے۔

شمس کی تدفین کے چند روز بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ شمس کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اپنی بیٹی کے ہاتھ میں اپنی ڈائری دیکھی تو فوراً لے لی۔ اُس ڈائری میں میرے شب وروز دفن تھے۔ میں نے ڈائری کھولی اور اپنا ماضی پڑھنے لگی۔ اچانک میں ٹھٹھک کر رہ گئی' اوراق کے درمیان شمس کا لکھا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ رائٹنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے جلدی میں کچھ لکھا ہے۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

"جمیلہ! انسان خواہ کتنا ہی اپنے جذبات و احساسات اور خواہشات کا گلا گھونٹ دے مگر کہیں نہ کہیں وہ ہار جاتا ہے۔ میں نے اپنے جذبات کی قربانی دے ڈالی لیکن دکھ کی بات ہے کہ تم نے ہمارے رشتے کو پامال کردیا۔ تم اپنے جذبات کی قربانی نہ دے سکیں۔ گندگی کو جتنا مرضی چھپاؤ مگر اس کی بدبو اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی ہے۔ گناہ کی دلدل میں دھنسنے سے پہلے میرا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی خیال کیا ہوتا۔ میں نے اپنی خواہشات کی قربانی اس لیے نہیں دی تھی کہ تم مجھے زمانے کی نظروں میں رسوا کر ڈالو۔ تم نے تو مجھ سے عہد کیا تھا کہ تم میرا ساتھ دوگی۔ آج اگر میں زندہ ہوتا تو مجھے دو قتل کرنا پڑتے' ایک تمہارا اور دوسرا اس آشنا کا اور اس طرح میں تو جیل جاتا ہی' میرے خاندان کی عزت بھی خاک میں مل جاتی اسی لیے میں خودکشی کر رہا ہوں۔ افسوس! تم میری محبت کی قدر نہیں کرسکیں۔" خط پڑھتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی۔ میری بچی مجھ سے لپٹ گئی۔

"مما......! آپ کیوں رو رہی ہیں؟" میں اسے کیا بتاتی کہ میں ہی شمس کی قاتل تھی۔ پتا نہیں' شمس کو میرے گناہ کا علم کیسے ہوگیا؟ کاش! میں بھی شمس کی طرح قربانی دے سکتی' کاش! میں جذبات کے بہاؤ میں نہ بہتی اور اپنے کزن کی طرف نہ بڑھتی۔ میں شمس کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی کہ ایک خیال نے میرا دماغ مفلوج کرکے رکھ دیا۔ میرے اندر پرورش پانے والا گناہ کا بیج جب اس دنیا میں آئے گا تو اس کا باپ شمس کہلائے گا۔ کیا شمس کی روح یہ برداشت کرسکے گی؟ میں نے اس گناہ کی نشانی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرڈالا۔ آج سوچتی ہوں' میں نے اُس کی قربانی کا کیا صلہ دیا؟" یہ کہتے کہتے جمیلہ بھابھی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ "گوکہ میرے اس گناہ کا آج تک کسی کو پتا نہ چلا مگر میرا ضمیر ہر لمحے مجھے کچوکے لگاتا ہے۔ اپنے اس گناہ کا اعتراف آج نہ کرتی تو شاید میرا دماغ پھٹ جاتا۔ میری یہی التجا ہے کہ خدارا' نفس کے بہاؤ میں آکر اپنے خوبصورت رشتوں کو پامال مت کریں ورنہ ساری زندگی میری طرح اذیت میں گزرے گی۔ میں نے بھی کب کی خودکشی کرلی ہوتی' اگر میرے بچے نہ ہوتے۔ اب تو صرف اپنے بچوں کی خاطر' اب مجھے گناہ کے اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے اپنی زیست کا سفر تمام کرنا ہے۔"

......☆☆......

WWW.PAKSOCIETY.COM

خلیل جبار

ماضی بنا حال

ارتضاء وارثی کا خیال

ہائے یا دل وہ عہد ماضی کے
پھر تصور میں چھائے جاتے ہیں

عیش پرستی میں ڈوبے ایک شخص کا احوال، اس نے جو بویا وہی کاٹا



میں موٹر سائیکل ٹھیک کرنے میں مصروف سوچ رہا تھا کہ استاد طفیل ابھی تک نہیں آیا۔ مجھے استاد طفیل کی بیٹی مہوش کو کالج سے لانے کی فکر تھی، وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر پڑتے ہی میری بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔ اس وقت میرے پاس کوئی دوست وغیرہ بھی نہیں تھا جسے دکان پر بٹھا کر کالج جاتا۔ استاد طفیل کے ستارے اُن دنوں گردش میں تھے۔ کبھی اس کی دکان خوب چلتی تھی، موٹر سائیکل مرمت کے ساتھ ساتھ پارٹس کا سامان، آئل وغیرہ بھی دکان پر بکتا تھا۔ کئی رکشے بھی اس نے کرائے پر دیئے ہوئے تھے، ضرورت سے زیادہ آمدنی انسان کو عیش پرستی کی طرف لے جاتی ہے، استاد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، کبھی دن میں اور کبھی رات میں گھر اور دکان سے غائب ہوجاتا، دکان کو شاگرد سنبھال لیتے تھے لیکن رات میں گھر سے غائب رہنا اور دن نکلے گھر پہنچنا بیگم کو ناگوار گزرتا تھا اسی لیے آئے دن استاد کے بیوی سے جھگڑے ہونے لگے تھے۔ استاد کو جب غصہ آتا، وہ بیوی کو روئی کی طرح دھنک دیتا، جو چیز ہاتھ آتی، اس کے دے مارتا۔ دکان میں میرے ساتھ اجو بھی کام سیکھنے آتا تھا۔ وہ مجھ سے پرانا تھا اور جبکہ اس وقت مجھے دکان میں آئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ میں اسکول سے پڑھ کر دکان پر کام سیکھنے آتا تھا۔ اجو صبح سویرے آکر دکان کھولتا تھا۔

ایک دن اجو گھر پر دکان کی چابی لینے گیا۔ استاد غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ استاد کو زور کی بھوک لگ رہی تھی، گیس کا پریشر کم آنے سے ناشتہ بننے میں دیر ہوگئی تھی۔ اجو جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، استاد نے ٹی وی ریموٹ بیگم کے سر پر دے مارا۔ اجو کو یہ برداشت نہ ہوا اور اس نے بھی پاس پڑا لکڑی کا ڈنڈا استاد کی جانب کھینچ مارا۔ ڈنڈا استاد کے سر پر زور سے لگا اور وہ کافی دیر تک اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا، حواس درست ہوئے تو اجو غائب ہوچکا تھا۔ میں جب دکان پر پہنچا، استاد بہت غصے میں تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”استاد کیا ہوا؟“

”آنے دو اجو کو، اسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

”استاد خیر تو ہے نا؟ آخر اس نے ایسا کیا کردیا؟“

”تو اس کی بالکل حمایت مت لینا ورنہ میں تیری بھی کھال اتار دوں گا۔“ استاد غصے سے چیخا۔ استاد کو شدید غصے میں دیکھ کر میں خاموش ہوگیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر خود ہی بولا۔

”ہم آج تک استاد کے سامنے نہیں بولے۔ استاد نے ہمیں بچپن میں بہت پیٹا ہے، ہم اف تک نہیں کرتے تھے۔ یہ کل کا بچہ مجھے ڈنڈا مار کر بھاگا ہے۔“

”اجو نے آپ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں کیا فارسی میں بول رہا ہوں؟“ استاد غصے سے بولا۔

”استاد مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے کہا۔

”آنے دو اس خبیث کو، دیکھنا، میں اس کا کیا حال کرتا ہوں۔“ استاد طفیل کو شدید غصے میں دیکھ کر میں نے اپنی خیریت اسی میں جانی کہ خاموشی اختیار کرلوں ورنہ وہ سارا غصہ مجھ پر اتار دیتا۔ اجو بھی استاد کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے دوبارہ پلٹ کر دکان پر نہیں آیا۔

ایک دن وہ سرِ راہ مجھے مل گیا۔ میں نے جب اس سے استاد پر ہاتھ اٹھانے کے بارے میں پوچھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو وہ غصے میں آ گیا۔

"تم جانتے ہی ہو کہ ہماری استانی کتنی اچھی عورت ہے۔ بڑے پیار و محبت سے بات کرتی ہے۔ جب بھی گھر میں اچھا کھانا پکاتی ہے' ہمارے لیے دکان پر ضرور بھیجتی ہے۔ شکل و صورت بھی اچھی' سیرت بھی اچھی! پھر بھی استاد پرائی عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ جب بھابھی غصہ کرتی ہے' استاد اس کی پٹائی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کتنا ظالم ہے ہمارا استاد' بس اس دن جب استاد نے ٹی وی ریموٹ کھینچ کر استانی کو مارا تو مجھے شدید غصہ آ گیا اور میرے ہاتھ جو لگا' وہ استاد کے دے مارا۔"

"وہ ہمارا استاد ہے' تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔"

"ہوں...... استاد! ایسے شخص کو استاد بنانے سے بے استاد اچھا۔ کئی بار استاد کی بے ایمانی کی عادت کے سبب میں پھنستے پھنستے بچا ہوں۔" اجو نے انکشاف کیا۔

"کیسی بے ایمانی جو تم پھنستے پھنستے بچے؟" مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ اجو استاد کے پاس کئی سال سے کام کر رہا تھا اور مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے استاد طفیل کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھیں۔

"استاد آئل کے ڈبوں کی سیل اس طرح کھولتا ہے کہ پھر دوبارہ دو نمبر آئل ڈال سکے اور سیل بھی ڈبے سے اس طرح دوبارہ لگ جائے جیسے ڈبہ کھلا ہی نہیں ہے۔ اکثر وہمی قسم کے لوگ مجھے ڈبے سے سیل کو ہٹاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں' کبھی بے دھیانی میں طاقت کا مظاہرہ کرنے سے پہلے ہی سیل ہاتھ میں آ جائے تو ایسے گاہک مجھ سے بحث شروع کر دیتے ہیں کہ تم بے ایمان ہو' بڑی مشکل سے انہیں سمجھانا پڑتا ہے کہ میں نے طاقت لگائی تھی' سیل بغیر طاقت لگائے نہیں کھلتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب استاد کو اللہ اتنا دے رہا ہے پھر اسے بے ایمانی کرنے کی کیا ضرورت ہے اور ہاں' تمہیں پتا ہی ہے' استاد کمیٹی ڈالتا ہے' وہ خود کو اور اپنے قریبی دوستوں کو فائدہ پہنچانے کو ہر ماہ پرچیوں میں ایک پرچی پر مخصوص نشان ڈال دیتا ہے اور مجھے پرچی اٹھانے کو کہتا ہے' وہ نشان والی پرچی اکثر پرچیوں میں دب جانے سے فوراً نظر نہیں آتی اور مجھے اس وقت بڑی الجھن ہوتی تھی اور میں پریشانی کے عالم میں پرچیوں کو غور سے دیکھتا کہ کس پرچی کو اٹھاؤں؟ کمیٹی ممبران کو شک ہونے پر وہ میری پٹائی کر دیں گے اور استاد والی پرچی ہاتھ میں نہ آنے پر ان کمیٹی کے ممبران کے جانے پر استاد میری پٹائی کرے گا۔ شکر ہے' استاد طفیل کی دکان سے میری جان چھوٹ گئی۔ اب کبھی بھول کر بھی میں اس کی دکان پر نہیں جاؤں گا۔ مجھے اچھا اور ایمان دار استاد مل گیا ہے۔ وہ استاد طفیل کی طرح یہ نہیں کرتا کہ پارٹس کا سامان منگوا کر کچھ سامان گاڑی میں لگایا اور بچ جانے والا سامان پارٹس والے کو واپس دے کر رقم اپنی جیب میں رکھ لی۔"

"اس کا مطلب ہے' اب تم استاد کے پاس کام کرنے نہیں آؤ گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں' میں اب کبھی بھول کر بھی اس کی دکان پر نہیں آؤں گا۔" اجو نے کہا۔ "لڑکے' تم ابھی تک نہیں گئے؟" استاد کی آواز پر میں چونکا۔

"استاد' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"نذیر کا دماغ درست کرنے گیا تھا اسی لیے دیر ہو گئی۔ آئے دن اس کی نئی کہانی ہوتی ہے کہ دھندا نہیں ہوا' کبھی کہتا ہے کہ رکشہ ہی نہیں نکالا۔ میں بھی اس کو کہہ کر آ گیا ہوں' مجھے روزانہ رکشہ کا کرایہ چاہیے' جس دن تم رکشہ کی چھٹی کرو' رکشہ میری دکان

پر کھڑا کر دیا کرو۔ اگر جس دن رکشہ میری دکان پر نہ ہوگا' اس دن کا میں کرایہ لوں گا۔"

"ہاں استاد' ایسے بے ایمان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔" میں نے استاد کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اچھا' مہوش بیٹی انتظار کر رہی ہوگی۔ جلدی جاؤ اسے لینے۔" استاد نے موٹر سائیکل کی چابی مجھے دی۔

مہوش کا کالج زیادہ دور نہیں تھا' مشکل سے دس منٹ کا راستہ ہوگا۔ مہوش اپنی سہیلیوں کے ساتھ بھی کالج سے گھر پہنچ سکتی تھی لیکن استاد طفیل کے دل میں جانے کیوں خوف تھا اس لیے اس نے مہوش کو کالج چھوڑنے اور لانے کی ڈیوٹی میرے ذمے لگائی تھی۔ جس دن میں چھٹی کرتا' استاد خود اسے چھوڑنے جاتا تھا۔ جب سے استاد کی بیوی نائلہ کا انتقال ہوا تھا' استاد بہانے بہانے سے گھر کے کئی چکر لگانے لگا تھا حالانکہ گھر میں استاد کے بھائی کی فیملی اور بوڑھی ماں رہتی تھی پھر بھی اسے کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ استاد اتنا شکی اور وہمی ہو گیا ہے مگر مجھ پر کیوں بھروسہ کرتا ہے؟ استاد بڑی شاہانہ زندگی گزار سکتا تھا' اس کی دکان بہت اچھی چلتی تھی' آئل اور پارٹس کا بھی سامان خوب بکتا تھا' موٹر سائیکل کی مرمت کے لیے لوگ استاد کے پاس ہی آتے تھے۔ انہیں استاد پر پورا بھروسہ تھا اور استاد اس بھروسے کا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ کسٹمرز سے ایک نمبر پارٹس منگواتا تھا اور موٹر سائیکل مالک کے جانے پر پارٹس واپس کرا دیتا اور اس کی جگہ اپنے پاس سے دو نمبر پارٹس لگا دیتا۔ استاد کی اصل "پیدا" موٹر سائیکل کے انجن کھولنے پر ہوتی تھی۔ وہ موٹر سائیکل کے مالک سے ڈھیر سارے پارٹس منگواتا جس میں سے آدھا سامان انجن بنانے میں کام آتا تھا' باقی وہ پارٹس والے کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتا تھا۔ پارٹس کی دکان والا استاد کے اس کام سے خوش نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا' اگر وہ استاد سے سامان واپس کرنے پر حجت کرتا تو اسے آئندہ دوسرے پارٹس والے سے سامان لینے کی استاد کی دھمکی کام کر جاتی اور پارٹس والا خاموشی سے سامان واپس کر لیتا۔

پارٹس کا کاروبار کرنے والے ان استاد قسم کے لوگوں سے بہت خار کھاتے ہیں' پیچھے سے خوب کھری کھری سناتے اور گندی گندی گالیاں دیتے ہیں لیکن استادوں کے سامنے ان کی خوشامد اور تعریفیں اس طرح کرتے ہیں جیسے دنیا میں ان سے اچھا یا فرشتہ صفت انسان کوئی نہیں ہے۔

استاد اصل مزدوری کے علاوہ ہونے والی آمدنی کو 'بونس' کہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ حرام کی کمائی اپنے ساتھ اصل رقم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے۔ استاد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

استاد کو جوئے کی لت بھی تھی' وہ پہلے کم پیسوں سے جوا کھیلتا تھا پھر جوئے میں زیادہ رقم لگانے لگا۔ وہ جتنی زیادہ رقم جوئے میں لگاتا' ہارتا اتنا ہی اس کا مقدر بنتی جا رہی تھی۔ استاد اس امید پر کہ آج ہار ہو گئی لیکن کل ضرور جیت ہوگی' پچھلی ساری کسر پوری ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہر روز جیت کی امید پر رقم ہارتا رہا' نوبت یہاں تک پہنچی کہ پہلے آئل والے نے پھر رکشہ کے پارٹس والے نے مال ادھار دینے سے انکار کر دیا۔ موٹر سائیکل کے پارٹس والے نے بھی اصل رقم کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ استاد کے رکشے جو کرائے پر چل رہے تھے' ایک ایک کر کے سب بک گئے۔ استاد کو پھر بھی نصیحت نہیں ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح ہر روز جیت کی آس پر جوا کھیلتا رہا اور قلاش ہوتا رہا۔ پرچون والے سمیت

WWW.PAKSOCIETY.COM

غرض جس سے بھی ادھار سامان لیتا تھا' انہوں نے ادھار دینا بند کردیا تھا۔ دکان مالک بھی سال بھر کا کرایہ چڑھ جانے پر دکان خالی کرانے کی دھمکی دینے لگا تھا۔ ایسے میں استاد کی بیوی نائلہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اب اس کی کل کائنات مہوش ہی رہ گئی تھی جو کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔

مجھے استاد طفیل کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ استاد کی بربادی میں کسی دوسرے کا نہیں' خود اس کا اپنا ہاتھ تھا۔ مجھے استاد کے وہ دن یاد آتے تھے جب اس کی بھری ہوئی دکان تھی۔ رات جب وہ گھر جاتا تھا' اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوتی تھیں اور آج یہ عالم تھا کہ قرض میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ جوا کھیلنا تقریباً بھول چکا تھا۔ کوئی پرانی آشنا عورت اس کے پاس آجائے تو وہ بڑی حسرت سے کبھی اپنی خالی جیبوں اور کبھی اس عورت کو دیکھنے لگتا۔ آنے والی عورت شرمندہ سی ہوکر آگے بڑھ جاتی۔

میں جب کالج پہنچا' مہوش کالج کے گیٹ پر کھڑی کسی لڑکے سے باتیں کررہی تھی۔ دور سے اس نے مجھے آتا دیکھ لیا تھا اس لیے محتاط ہوکر لڑکے سے دور کھڑی ہوگئی۔ میں چند دن سے محسوس کررہا تھا کہ مہوش کسی لڑکے سے باتیں کررہی ہوتی تھی اور مجھے دیکھ کر ایسی بن جاتی تھی جیسے وہ اس لڑکے کو جانتی تک نہیں ہے۔ میں نے کئی بار مہوش سے لڑکے کے بارے میں پوچھا لیکن وہ ہر بار ٹال جاتی تھی اور مجھے کہتی۔

''تمہیں وہم ہوگیا ہے' میرا اس لڑکے سے کیا تعلق؟ وہ اپنی بہن کو کالج سے لینے آتا ہے' کبھی جب اس کی بہن پریکٹیکل کے سلسلے میں لیٹ ہوجاتی ہے' وہ مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ لیتا ہے۔''

مجھے مہوش کی اس بات سے تسلی نہیں ہوتی تھی اور میرے دل میں ایک شک جنم پانے لگا تھا مگر بغیر ثبوت کے' میں استاد کو بھی اس حوالے سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

ایک دن میں محلے کی پرچون کی دکان پر سودا سلف لینے گیا۔ پرچون والے کے پاس وہی لڑکا بیٹھا ہوا نظر آیا' وہ مجھے دیکھ کر ایسا بن گیا جیسے پہلی بار دیکھا ہو پھر زیادہ دیر رکا نہیں اور وہاں سے چل دیا۔ سامان خریدتے ہوئے میں نے دکان دار سے پوچھ ہی لیا۔

''کاشف' یہ لڑکا کون تھا؟'' میرے پوچھنے پر اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار سی چمک آگئی۔ کاشف مجھ سے چند سال ہی بڑا تھا' اپنے والد کی غیر موجودگی میں دکان وہی سنبھالتا تھا۔

''کیوں خیر ہے نا' میرے دوست کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟''

''بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا' یہ لڑکا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بشیر' تجھے کیا معلوم' یہ سلمان بہت ہی پیارا لڑکا ہے۔ سمجھ لے یاروں کا یار ہے۔'' کاشف نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یاروں کا یار ہے' میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''کسی کو یہ بات نا بتانے کا وعدہ کرو تو میں اس کے متعلق کچھ بتا سکتا ہوں۔'' کاشف نے رازدارانہ انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے دوست کو جانتا ہی نہیں پھر میں سلمان کے بارے میں اس کے جاننے والوں کو کیا بتاؤں گا؟ میں صرف اپنی تسلی کے لیے معلومات کررہا ہوں۔''

''میرے والد کو بھی کچھ نہیں بتانا۔''

''یہ میرا تم سے وعدہ ہے' اگر کوئی چھپانے کی بات ہوئی تو میں انہیں نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''سلمان بہت ہی پیارا لڑکا ہے' اسے باتیں کرنے کا فن خوب آتا ہے' موبائل پر مختلف لڑکیوں سے دوستیاں کرکے انہیں پھانس لیتا ہے' لڑکیاں بھی اس کی باتوں میں کھو جاتی ہیں اور اسے اپنا آئیڈیل سمجھنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں سے زیادہ سلمان پر اعتبار کرنے لگتی ہیں۔ سلمان بھی موبائل پر اپنی لچھے دار باتوں کے فن کا بھرپور فائدہ اٹھا کر انہیں پہلے مختلف تفریحی مقامات کی سیر کراتا ہے جب لڑکیوں کو اس پر اعتبار ہوجاتا ہے تو وہ لڑکی کو اپنے کرائے کے فلیٹ پر لے جا کر اپنی ہوس مٹاتا ہے اور ان کی شرم ناک مووی بنا کر محفوظ کرلیتا ہے' جب لڑکی اس گندے عمل سے انکار کرتی ہے اور شادی کرنے کو کہتی ہے تو مووی گھر بھیجنے کی دھمکی دے کر بلیک میل کرتا ہے اور لڑکی بھی فلم دیکھ کر اس کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہوتی ہے۔ وہ اس عیاشی میں اپنے دوستوں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ لڑکی مجبور ہوکر سلمان کی ہر بات ماننے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ ان دنوں اس کے پاس ایک بڑی ہی اچھی کم عمر لڑکی صبح کے وقت آتی ہے۔ وہ اور اس کے دوست خوب عیش کررہے ہیں' کبھی تمہارا بھی عیش کرنے کا ارادہ ہو مجھے بتا دینا۔'' کاشف نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

اس کی باتیں سن کر میں سناٹے میں آگیا تھا کہ کہیں وہ لڑکی مہوش نہ ہو مگر میرا دل نہیں مانا کہ مہوش ایسی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کو صبح کے وقت مہوش کو کالج کے گیٹ پر چھوڑا اور وہاں سے کچھ دور جا کر گاڑی ایک گلی میں کھڑی کی اور چھپ کر کالج سے دور کھڑا ہوگیا۔ میری نظریں گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ مہوش گیٹ سے باہر آئی۔ سلمان موٹر سائیکل لیے آگیا اور مہوش کے اس پر بیٹھتے ہی اس نے موٹر سائیکل تیزی سے آگے بڑھا دی۔ یہ منظر دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ کاشف ٹھیک کہہ رہا تھا' وہ لڑکی استاد طفیل کی بیٹی مہوش ہی تھی۔ مجھے کاشف نے سلمان کے فلیٹ کا نمبر اور پلازہ کا نام بتایا ضرور تھا لیکن میں کم عمر لڑکا تھا' فلیٹ پر سلمان کے دوستوں کے ہونے کی صورت میں تنہا ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا کر کسی بھی معاملے میں پھنسا بھی سکتے تھے جو لڑکیوں کو پھانس کر بلیک میل کرسکتے ہیں' ایسے لوگوں کا میں بھلا کیا مقابلہ کرتا۔ مہوش بھی سلمان کے کہنے میں آکر میرے خلاف گواہی دیتی' یہی سوچ کر میں پریشان سا چہرہ لیے چلا آیا۔ میرے ذہن میں کشمکش چل رہی تھی کہ میں استاد کو یہ بات بتاؤں یا نہیں؟ اگر بتاؤں تو کس طرح؟ استاد طفیل کے غصے سے مجھے ویسے ہی خوف آتا تھا۔ میں جب دکان پر پہنچا' میرا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ کم عمر ہونے کے سبب میں چہرے سے ٹپکتی خوف کی کیفیت کو چھپانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ استاد جہاں دیدہ شخص تھا' وہ میری صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا' ضرور کوئی بات ہے۔

''کیا بات ہے شبیر' خیریت ہے نا؟'' استاد نے پوچھا۔

''ہاں' خیریت ہے۔'' میں نے استاد سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے تجھے' بتاتا کیوں نہیں؟'' اس نے میرے شانوں کو پکڑ کر میرا رخ اپنی طرف کیا۔ ''بول' کیا بات ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بڑے خوش گوار موڈ میں گیا تھا اور اب آیا ہے تو تیرہ چہرہ اترا ہوا ہے؟ اتنا خوف زدہ ہے کہ جیسے تو کوئی چوری کرکے آیا ہے اور اپنے پکڑے جانے کے خوف سے پریشان ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''استاد......!استاد......!ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں استاد طفیل کے غصے سے ہوتے سرخ چہرے سے نروس ہوتا جا رہا تھا اور مسلسل نظریں نیچی کیے ہوئے تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ استاد سے نظریں ملا کر بات کرسکوں۔ استاد کو میری اس کیفیت پر غصہ آگیا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سب کچھ بتا دوں۔ میری خاموشی استاد کو بے چین کیے دے رہی تھی' وہ غصے میں بھر چکا تھا۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو اس نے بجلی کی وائر اٹھا کر میری پیٹھ پر مارنا شروع کردی۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہ ہوسکی اور میں سسک پڑا جو بات بتانے کے لیے میں منصوبہ بندی کررہا تھا کہ کس طرح استاد کو بتائی جائے' وہ فرفر بولنے لگا۔ استاد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی اور گاڑی کو تیزی سے دوڑاتا ہوا چلا گیا۔

رات گئے تک استاد طفیل کی واپسی نہیں ہوئی تو مجھے بڑی فکر ہوئی' میں ڈرتے ڈرتے استاد کے گھر گیا۔ گھر کے باہر ہجوم جمع تھا' وہیں مجھ پر محلے والوں کی زبانی علم ہوا کہ استاد نے مہوش کو چند اوباش لڑکوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ لیا تھا' اس سے یہ منظر برداشت نہ ہوسکا اور موقع پر ہی اس نے مہوش اور ان عیاش لڑکوں کو گولی مار کر ہلاک کر کے خود کو پولیس کے حوالے کردیا۔ مجھے یہ سن کر شدید جھٹکا لگا' خاصی دیر تک میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا تھا کہ یہ سب کیا ہوگیا؟

مہوش کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آچکی تھی۔ اسے غسل دے کر رات میں ہی تدفین کردی گئی۔ صبح میں پولیس نے استاد طفیل کو عدالت میں ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے پیش کردیا تھا۔ میں بھی استاد طفیل سے ملاقات کرنے عدالت پہنچ گیا۔ استاد کا چہرہ اترا ہوا تھا' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔

''استاد......! یہ سب......''

''شبیر بیٹے' میں نے جب تمہارے منہ سے مہوش کے حوالے سے بات سنی' میرے ہوش اڑ گئے تھے پھر میں نے مہوش کو ان اوباش لڑکوں کے ساتھ شرمناک حالت میں دیکھا تو میں ہوش کھو بیٹھا' مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا' غصے میں ریوالور نکال کر میں نے سب کو قتل کردیا۔ مہوش کے قتل کے بعد میری زندگی کا مقصد بھی ختم ہوگیا تھا' اس لیے میں نے خود کو پولیس کے حوالے کردیا۔ زندگی کی جو تھوڑی بہت سانسیں ہیں' وہ اب جیل کی کال کوٹھری میں پوری ہوں گی۔''

''سمجھ میں نہیں آرہا استاد' آپ کے ساتھ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟''

''شبیر' اپنا کیا ہی سامنے آتا ہے' میں جوانی کے جوش میں وہ کچھ کرگیا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ آج میں کسی کی عزت سے کھیل رہا ہوں تو کل کوئی دوسرا بھی میری عزت سے کھیل سکتا ہے۔ میرا ماضی' حال بن کر میرے سامنے آگیا۔ میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں' شبیر بیٹے' تم کبھی بھی وہ نہیں کرنا جس کا اس عمر میں آکر تمہیں پچھتاوا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے استاد طفیل کی آواز بھرا گئی' آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

میں وہاں کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ ہر انسان مکافاتِ عمل سے ضرور گزرتا ہے' اس کا اپنا کیا زندگی میں کسی بھی موڑ پر آ کر ہی رہتا ہے۔ جوانی جوش میں ہوش کھونے کا نام نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا کام ہے۔

......☆☆......

انور فرہاد

آخری آرام گاہ

سلمیٰ بچّوں کو لے کر گھر میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہوگئی کہ منّی جیسے ہوا میں تیر رہی ہو، لگتا تھا جیسے کہ کوئی اُسے فضاء میں، گود میں لیے چپ کرانے کی نیت سے ادھر ادھر گھوم رہا ہو مگر......

پراسرار کہانیوں کے شوقین قارئین کے لیے سینئر مصنف کا تحفہ خاص



WWW.PAKSOCIETY.COM

مسٹر اینڈ مسز عبداللہ کو ہم نے اپنے گھر میں رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ تقریب کچھ بھی نہیں تھی، بس یونہی کھانے پر بلالیا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ عبداللہ جو میرے بچپن کا دوست ہے ایک طویل عرصے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی اور جب اس نے بتایا کہ وہ بھی اسی شہر میں سکونت پذیر ہے تو بڑی خوشی ہوئی اور تعجب بھی ہوا کہ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کہاں ہو، کیا کر رہے ہو؟ شادی کی یا ابھی تک اکیلے ہو؟"

اس نے سارے سوالات کا جواب مختصر انداز میں دیا تو میں نے اس سے کہا۔ "باقی ساری باتیں تفصیل سے ہوں گی۔ تم ایسا کرو کہ ہفتے کی رات کو بیگم کو ساتھ لے کر میرے گھر آجاؤ۔ میرے بیوی بچوں سے بھی مل لینا اور ہمارے ساتھ کھانا بھی کھالینا۔"

اور اس نے اپنی پرانی عادت کے مطابق بڑی شرافت سے میری دعوت قبول کرلی اور ہفتے کی شام کو اپنی بیگم کے ساتھ ہمارے گھر پہنچ گیا۔

"یہاں تک آنے میں دشواری تو نہیں ہوئی؟" میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

"ہاں...... تھوڑی سی دشواری ہوئی۔" اس نے میرے گھر کو تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مکان تو بہت اچھا ہے مگر بڑے کونے کھدرے میں واقع ہے۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکے نے ہم سے پوچھا۔ "انکل...... ! کسی کو تلاش کر رہے ہیں کیا؟"

"ہاں بھئی مگر ان کا مکان نہیں مل رہا ہے۔"

"کون ہے وہ؟ کیا پتا ہے ان کا؟"

"میں نے جیب سے تمہارا دیا ہوا پتا تھما دیا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ "آیئے میں آپ کو پہنچا دوں۔" اور پھر اس نے ایک دو گلیوں سے گزار کر تمہارے مکان کے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ "یہ ہے وہ مکان۔" ہم نے دروازے پر لکھا تمہارا نام اور پتا پڑھ کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جو اس کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھا۔

"ارے...... وہ لڑکا کہاں چلا گیا؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

مجھ سے ذرا فاصلے پر ناہید سلطانہ کھڑی تھیں، انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ یہیں تو کھڑا تھا میرے اور آپ کے درمیان مگر وہ کب گیا، کہاں گیا، کیسے گیا؟"

میں نے اور میری بیگم نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرادیئے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس نے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری حیرانی اور پریشانی پر آپ مسکرا رہے ہیں؟"

"اوہو یار، اس بات پر حیرانی اور پریشانی کیسی، کوئی بھوت پریت ہوگا...... تمہیں راستہ بتا کر غائب ہوگیا......"

"تیری عادتیں اب تک نہیں بدلی ہیں، اب بھی تو لوگوں کو پریشان کرکے لطف لیتا ہے؟"

"وہ...... وہ ملا بھی تو اسی طرح اچانک تھا، اچانک نظر آتے ہیں، اچانک غائب بھی ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی نظر نہیں بھی آتے ہیں مگر اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو......" عبداللہ نے ڈانٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا۔ "یہ بھوت پریت کی کہانیاں صرف کہانیوں میں ہوتی ہیں، حقیقتاً ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔" پھر اپنی بیوی کو مخاطب کرکے بولا۔ "یہ شروع ہی سے ایسا ہی ہے، لوگوں کو ڈرا کر پریشان کرتا ہے اور دوسروں کی پریشانی سے محظوظ ہوتا ہے، اس کی باتوں پر توجہ نہ دو ورنہ تمہیں ڈرا کر، خوف زدہ کرکے خوش ہوگا۔"

میری بیوی نے مسکراتے ہوئے ناہید کا بازو پکڑ کر اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا اور پھر دونوں باتوں میں مگن ہوگئیں۔ میں دوسرے صوفے پر عبداللہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور موجودہ حال کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ارے بھئی سلمیٰ، اب بھوک لگنے لگی ہے، کھانا کب کھلاؤ گی؟"

"جب ان لوگوں کو بھوک لگے گی۔"

"کیوں بھئی، تم لوگ کب کھانا کھاتے ہو؟"

عبداللہ نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب ہمارے کھانے کا وقت بھی ہونے والا ہے۔"

سلمیٰ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "تو پھر میں کھانا لگانے کی تیاری کرتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف جانے لگی پھر دو قدم جا کر پلٹی اور مجھ سے بولی۔ "جب تک میں کھانا لگاتی ہوں، آپ ذرا بھاگ کر کولڈ ڈرنک کی دو بڑی بوتلیں تو لے کر آجائیں۔"

مجھے جانے اور واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی مگر واپس آیا تو یہاں کا منظر بڑا گمبھیر تھا، عبداللہ کی سیدھی کلائی پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کی بیوی سراسیمہ حالت میں اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"ایں...... یہ کیا ہوگیا تم کو؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

عبداللہ نے پہلے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ "تم ٹھنڈی بوتلیں لینے باہر گئے اور بھابی سلمیٰ کچن میں چلی گئیں تو میں نے سوچا، اس دوران ذرا مطالعہ ہی کرلوں، یہ سوچ کر میں نے میز کے نیچے رکھے ہوئے رسالے کو اٹھا کر ابھی کھولا بھی نہیں تھا کہ کسی نے رسالہ میرے ہاتھ سے چھین کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے غصے سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ناہید مجھ سے خاصے فاصلے پر بیٹھی تھی اور اس کی نگاہیں گھڑی کے پنڈولم پر مرکوز تھیں۔ میں نے دوبارہ پرچا اٹھالیا۔ اس بار بھی کسی نے اسے چھین کر میز پر رکھ دیا۔ میری حیرانگی میں اضافہ فطری امر تھا مگر مجھے اس کے ساتھ غصہ بھی آرہا تھا کہ یہ بدتمیزی کون کر رہا ہے؟ اب کی بار جو میں نے رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی نے میری کلائی پکڑ لی۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ لگتا تھا، کلائی کی ہڈی ٹوٹ جائے گی مگر حیران کن بات یہ تھی کہ کلائی پکڑنے والا ہاتھ نظر آرہا تھا نہ ہاتھ والا۔ میں تکلیف سے چیخ پڑا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ......"

بجائے کلائی چھوڑنے کے، نظر نہ آنے والی گرفت اور تنگ ہوگئی۔ میں پھر ایک بار بلبلا اٹھا۔ "میری ہڈی چیخ رہی ہے، میرا ہاتھ چھوڑو......"

ناہید نے میری پہلی آواز پر میری طرف حیرت سے دیکھا تھا مگر شاید اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔ دوسری بار میری آواز پر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی اور بولی۔ "یہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟"

"دیکھو تو...... کسی نے میری کلائی پکڑ رکھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے......" میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔ میرے چہرے سے تکلیف کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ "گرفت اتنی سخت ہے کہ میری ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔"

ناہید نے ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھا' شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ مگر......" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے' آپ کی کلائی پر تو کوئی گرفت دکھائی نہیں دے رہی ہے؟"

ٹھیک اسی وقت وہ اَن دیکھا ہاتھ میری کلائی سے ہٹ گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی کلائی سے خون کے قطرے بہنے لگے تھے جسے دیکھ کر ناہید کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہائے اللہ! یہ خون کیوں بہہ رہا ہے؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور وہیں سے بھائی' بھابی' کہہ کر تمہاری بیگم کو آوازیں دینے لگی۔ وہ آئیں تو انہیں بھی مجھے اس حال میں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔ "یہ آپ کے ہاتھ میں چوٹ کیسے لگی عبداللہ بھائی؟ خون کیوں نکل رہا ہے آپ کی کلائی سے؟" اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کی ڈریسنگ کے لیے متعلقہ سامان لانے اندرونی کمرے کی طرف بھاگی تھیں پھر جب وہ ناہید کے ساتھ اس کی ڈریسنگ کر رہی تھیں تو کلائی کے زخم کو دیکھ کر اپنا سوال دہراتے ہوئے بولیں۔ "کس طرح یہ زخم لگا؟" اب میں نے ساری روداد سنائی اور کہا۔ "دیکھیے' کیسا فولادی شکنجہ تھا کہ کلائی لہولہان ہو گئی۔"

میں نے عبداللہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "یار' اس گھر میں ایسے ہی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ واقعات ہمارے ساتھ بھی ہوتے رہتے ہیں۔"

"تو کیا......" بیگم عبداللہ جھٹ بول پڑیں۔ "یہ گھر آسیب زدہ ہے؟"

"ہاں......" میرے بجائے میری بیگم نے انہیں جواب دیا۔ "کبھی کبھی ایسی قیمتی چیزیں برباد ہو جاتی ہیں کہ......"

"جس وقت ان کے ساتھ......" ناہید عبداللہ بولیں۔ "کلائی مروڑنے کا کھیل ہو رہا تھا' میں گھڑی کے پنڈولم کو دیکھ رہی تھی' مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ یہ پنڈولم اس تیزی سے کیوں حرکت کر رہا ہے؟ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جلدی جلدی انہیں حرکت دے رہا ہو۔"

"یار' اگر اس گھر میں بھوتوں کا بسیرا ہے تو یہ گھر تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" عبداللہ پوچھ رہا تھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "مجبوری میرے یار' مجبوری...... بڑی مشکلوں سے ایک ایک پیسا جوڑ جوڑ کر بڑے دنوں کے بعد یہ گھر بنایا ہے' اسے چھوڑنا اب ہمارے لیے ممکن نہیں۔ اگر اس کی تعمیر سے پہلے ہمیں معلوم ہو جاتا کہ یہاں کچھ نظر نہ آنے والی ہستیاں بھی بستی ہیں تو ہم ہرگز اس پر اپنا پیسا اور وقت صرف نہ کرتے' ہمیں تو مکان کی مکمل تعمیر اور یہاں رہائش کے بعد آہستہ آہستہ پتا چلا۔ ابتدا میں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا مگر پھر ہمیں ذہنی تکالیف کے ساتھ ساتھ جسمانی اور مالی اذیت بھی پہنچائی جانے لگیں۔ "مگر تم نے جو بھوت پریت کے بارے میں ابھی ذرا دیر پہلے یہ کہا تھا کہ میں ان پر یقین نہیں رکھتا' یہ سب فضول باتیں ہیں' شاید اسی لیے انہوں نے تمہیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ فضول باتیں فضول نہیں ہیں۔ بھوتوں یعنی روحوں کے وجود سے منکر نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہاں......" یہ کہہ کر عبداللہ ذرا دیر تک خاموش رہا اور اپنی کلائی پر بندھی پٹی کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "اب یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ زندگی بھر کے لیے مجھے یہ سبق مل گیا ہے کہ......"

"ہاہاہا......" ٹھیک اسی وقت زبردست قہقہوں کی گونج سنائی دی تھی' یوں لگا تھا جیسے ڈرائنگ روم کے دروازوں سے' کھڑکیوں سے' دیواروں سے اور چھت سے قہقہوں کی بازگشت آ رہی ہو۔ ہم سب گھبرا گھبرا کر در و دیوار کو دیکھنے لگے اور شاید قہقہے لگانے والوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے مگر وہاں تھا کون کہ نظر آتا؟ ذرا دیر بعد میں نے محض اس جانب سے توجہ ہٹانے کی نیت سے عبداللہ سے پوچھا۔

"اب تمہاری کلائی کی تکلیف کا کیا حال ہے؟"

وہ یوں اپنے خیالات سے چونکا جیسے خواب سے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔ اب وہ اپنی کلائی پر بندھی بینڈیج کو دیکھ رہا تھا پھر چند لمحوں کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔

"اب...... اس وقت تو...... یہاں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں یار' بالکل کوئی تکلیف نہیں۔"

"ذرا پٹی تو کھولو' میں بھی دیکھوں' کس نوعیت کا زخم ہے؟"

پہلے تو وہ ذرا ہچکچایا پھر جانے کیا سوچ کر اپنی کلائی میری طرف بڑھا دی اور میں نے بسم اللہ کہہ کر پٹی کھولنا شروع کر دی پھر جب پوری پٹی کھل گئی تو بے ساختہ عبداللہ کے منہ سے نکلا۔

"ارے...... یہ کیا؟"

اس کی کلائی بالکل بے داغ تھی' نہ کوئی زخم تھا نہ کوئی داغ دھبہ' حد تو یہ ہے کہ دوائیاں جو لگا کر پٹی باندھی گئی تھی' ان کا بھی دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میری بیگم سلمٰی اور اس کی بیوی ناہید قریب آ کر اس کی صاف ستھری کلائی دیکھنے لگیں۔

"یہ تو...... یہ تو......" مارے حیرت کے ناہید کے منہ سے جملہ مکمل نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاں...... ایسا ہی کمال ہمارے گھر میں ہوتا رہتا ہے۔" سلمٰی نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل......" میں نے اپنی بیوی کی بات آگے بڑھائی۔ "ہمارے گھر کے بھوت ایسے ہی باکمال ہیں جو ہم سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں مگر ہمارے دوست اور بھائی بھی ہیں اس لیے تو ہم ان کے ساتھ اور وہ ہمارے ساتھ نباہ کر رہے ہیں۔"

عبداللہ میری باتوں سے زیادہ اپنی کلائی کی طرف متوجہ تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اسے ہر طرح سے چھو کر دیکھ رہا تھا' دبا رہا تھا' ہلا رہا تھا۔

"کیوں؟" میں نے اسے ٹوکا۔ "اندرونی طور پر بھی کسی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ ہو رہا ہے یا نہیں؟"

"نہیں یار......" وہ بے حد بشاش لہجے میں بولا۔ "بالکل ٹھیک ہے' ایک دم پہلے کی طرح۔"

ذرا دیر بعد ہم لوگ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے خوش گوار موڈ میں کھانا تناول کر رہے تھے۔ کھانا کھاتے وقت ناہید بیگم نے میری بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھابی......! اگلے ہفتے کی رات کا کھانا آپ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں گی۔" سلمٰی نے میری طرف دیکھا۔

"اوہو' ان سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟" عبداللہ بول پڑا۔ "اس کی کیا مجال کہ انکار کرے۔"

"ارے بھئی' کیا یہ ضروری ہے کہ اگلے ہفتے ہی حساب چکتا کر دیا جائے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’ابے یار! اتنے دنوں کے بعد تو ہماری ملاقات ہوئی ہے‘ اب کسی نہ کسی بہانے اس کی تجدید تو ہوتی رہنی چاہیے۔‘‘

اور ہم لوگ اگلے ہفتے عبداللہ اور ناہید کے گھر پر موجود تھے۔ کچھ دیر تک تو ہم دونوں پرانی یادوں کی راکھ کریدتے رہے‘ اس دور کے دوستوں کو یاد کرتے رہے پھر عبداللہ بولا۔

’’تمہارے گھر سے واپس آنے کے بعد ہم دونوں میاں بیوی اس فکر میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ تم لوگ ایسے آسیب زدہ گھر میں کیوں رہتے ہو؟ میری بیوی کو تمہاری بیوی سے ایک ہی ملاقات میں بڑی محبت ہوگئی ہے‘ وہ کہتی ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہیے‘ وہ لوگ بال بچے دار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا‘ میں تمہارے لیے کیا کروں؟ تمہیں اس بھوت گھر سے کیسے نجات دلاؤں؟‘‘

’’شاید......‘‘ میں نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا۔ ’’ہم کبھی بھی اس گھر کے بھوتوں سے نجات حاصل نہ کرسکیں......‘‘

’’کیوں‘ تم اس قدر مایوس کیوں ہو؟‘‘

’’جب اس گھر میں ہم شروع شروع میں نئے نئے واقعات سے دوچار ہوئے مثلاً ایک دن یوں ہوا کہ رات کے وقت ہماری مسہری کے نیچے سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں تو میں نے سلمیٰ بیگم سے کہا۔ ’’کیا مسہری کے نیچے کوئی چوہا یا بلی تو نہیں گھس گئی ہے؟‘‘

’’مجھے کیا پتا‘ اٹھ کر دیکھ لو۔‘‘

میں ابھی بستر سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ مسہری کے نیچے سے ایک چھوٹا سا بچہ نکلا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے پلٹ کر جو ہماری طرف دیکھا تو ہم ششدر رہ گئے‘ وہ ہماری چھوٹی بیٹی کے ہو بہو شکل و صورت کا بچہ تھا جبکہ ہماری بیٹی ہمارے پہلو میں سو رہی تھی جو ابھی سال بھر کی بھی نہیں تھی اور اس کا پاؤں پاؤں چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ ایک دم غائب ہوگیا۔

اس طرح ایک بار میرے بیٹے نے ہم سے شکایت کی کہ کل رات میری آنکھ کھلی تو ایک بونا میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ میں نے خوف زدہ ہوکر چیخنے کی کوشش کی تو اس نے اپنا گندہ اور بدبودار ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ وہ قد میں مجھ سے بھی چھوٹا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی پوری طاقت سے اسے دھکا دینے کی کوشش کی تو وہ ایک دم غائب ہوگیا۔‘‘ میں نے اسے یہ کہہ کر اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔

’’ارے بھئی‘ تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا‘ یہاں کوئی گندہ اور غلیظ بونا کیسے آسکتا ہے؟‘‘ مگر مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے بیٹے نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔

ایک دن میری بڑی بیٹی ضد کرنے لگی۔ ’’میں بھائی کے ساتھ کمرے میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے بھی منی کی طرح اپنے پلنگ پر سلایئے۔‘‘

’’مگر کیوں؟ کیا بھائی تمہیں تنگ کرتا ہے‘ سونے نہیں دیتا؟‘‘

’’نہیں پاپا‘ یہ بات نہیں‘ بھائی تو بستر پر جاتے ہی سو جاتے ہیں۔‘‘

’’پھر کیا بات ہے؟‘‘

ذرا دیر تک وہ ہچکچاتی رہی پھر بولی۔ ’’رات جب بھی میری آنکھ کھلتی ہے‘ کمرے میں کچھ عجیب و غریب قسم کے بچے میرے کھلونوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔‘‘

اسے بھی میں نے جھوٹ بول کر بہلایا پھسلایا کہ یہ کوئی حقیقت نہیں‘ محض تمہارا خواب ہے۔ تم ایسے خوابوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ کلمہ پڑھ کر سویا کرو۔ ڈراؤنے خواب نظر نہیں آئیں گے مگر اس بات سے ہم دونوں میاں بیوی واقف تھے کہ اس گھر میں بھوت پریت موجود ہیں۔ ایک دن سلمیٰ نے مجھ سے کہا۔

’’کسی مولانا یا مولوی سے مل کر جھاڑ پھونک کا کوئی بندوبست کیجیے۔‘‘

اور اگلے دن ہی میں ایک مولوی سے کچھ اگربتیاں اور پڑھوایا ہوا پانی لے آیا اور اُن کی ہدایت کے مطابق گھر کے مختلف حصوں میں ایک ایک اگربتی جلا دی اور پانی کے چھینٹے مارے جس کا ری ایکشن یہ ہوا کہ ذرا دیر بعد کھانسنے اور کھنکھارنے کی آوازیں آنے لگیں پھر کراہنے اور سسکیاں لینے جیسی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ آوازیں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ ہم چھوٹے بڑے تمام لوگ گھبرا کر ایک دوسرے کے قریب آگئے اور سوچنے لگے‘ یہ نئی مصیبت آن پڑی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر طرف کچھ اَن دیکھے لوگ کھانس رہے ہیں‘ کراہ رہے ہیں‘ سسکیاں لے رہے ہیں‘ کوئی نظر نہیں آرہا تھا مگر ان کی آوازیں ہماری سماعت پر گویا ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ جتنی دیر تک اگربتیاں جلتی رہیں‘ نظر نہ آنے والے لوگوں کی آوازیں آتی رہیں پھر آہستہ آہستہ اس وقت بالکل معدوم ہوگئیں جب اگربتیوں کا دھواں ختم ہوگیا۔

اگلے روز میں نے مولوی صاحب کو ساری باتیں بتائیں تو وہ بولے۔

’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اگربتیوں اور پڑھے ہوئے پانی کے چھڑکاؤ نے اپنا اثر دکھایا ہے۔‘‘

’’مگر مولوی صاحب! اس اثر کا ہمارے اوپر بہت برا اثر ہوا ہے۔‘‘

’’وہ تو ہوگا بھائی......! جس طرح تم ان کے خلاف کارروائی کررہے ہو‘ اسی طرح وہ بھی تم لوگوں کو تنگ کریں گے۔ اگربتیاں اور پانی اسی لیے دیا ہے کہ وہ پریشان ہوں‘ یوں سمجھو‘ بھوتوں سے اب تمہارا مقابلہ ہے۔ تم جیت گئے تو وہ بھاگ جائیں گے۔ تم ہمت ہار گئے تو تمہیں اس گھر سے بے دخل کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔‘‘

’’پھر میں کیا کروں؟‘‘

’’اگر ان سے مقابلہ کرسکتے ہو تو اگربتیاں جلاتے رہو‘ پانی چھڑکتے رہو۔ بے شک وہ اپنے دفاع کے لیے تم لوگوں کو تنگ کریں گے ورنہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دو۔‘‘

میں نے گھر آکر مولوی صاحب کی باتیں دہرا دیں۔ سلمیٰ بیگم اس بات پر رضامند نہیں تھیں کہ ہم بھوتوں سے مقابلہ کریں مگر میں نے انہیں سمجھایا۔ ’’اگر ہم سرینڈر کر جائیں گے‘ تب بھی ان کے ہاتھوں ستائے ہی جائیں گے اس لیے ایک دو دنوں تک مقابلہ کرکے دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔‘‘

بادلِ ناخواستہ سلمیٰ بیگم مان گئیں اور ہم نے اگربتیاں جلا دیں اور پانی کا چھڑکاؤ کردیا۔ ذرا دیر بعد پھر کھانسیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا پھر کراہنے اور سسکیاں لے لے کر رونے کی آوازیں بھی آنے لگیں پھر گھر کی چیزیں اِدھر اُدھر پھینکی اور توڑی جانے لگیں پھر اچانک منی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ماں پنگھوڑے کی طرف لپکی مگر وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ سلمیٰ نے گھبرا کر کہا۔

’’منی تو یہاں موجود نہیں ہے‘ آخر وہ گئی کہاں؟‘‘

’’مگر اس کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

نیچے اوپر دیکھا تو یہ دیکھ کر لرز کر رہ گیا کہ وہ کمرے کے سیلنگ فین پر بیٹھی رو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی گود میں لیے بیٹھا ہے۔"

"ہائے میری بچی......!" کہہ کر سلمیٰ رو پڑی۔ "اسے وہاں کون لے گیا؟" اگرچہ یہ سوال بالکل مہمل تھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "منی کو وہاں سے لائیے نا۔"

میں نے سلمیٰ کو تو کوئی جواب نہیں دیا، پنکھے کی طرف منہ کر کے بولا۔ "میں اگربتیاں بجھا رہا ہوں، تم میری بچی کو ہمیں واپس کر دو۔" اور کسی جواب کا انتظار کیے بغیر اگربتیاں بجھانے لگا پھر سلمیٰ بھی اس کام میں میرا ساتھ دینے لگیں۔ جلد ہی ساری اگربتیاں بجھ گئی تھیں۔ ان کا دھواں بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ابھی ہم اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ میری بیٹی چیخی۔ "پاپا......! ممی......! منی نیچے آ گئی ہے۔"

ہم دونوں پنگھوڑے کی طرف بھاگے تو وہ وہاں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا منا سا خوب صورت جھنجھنا بھی موجود تھا جو ہرگز ہمارے لائے ہوئے کھلونوں میں سے نہیں تھا۔

"یعنی......تم دونوں بھوتوں سے ہار مان گئے؟" عبداللہ نے کہا۔

"ہاں یار، ہار ماننی ہی پڑی۔ بچی کا معاملہ تھا، ہم ان سے مقابلہ نہ کر سکے اور اس کے بعد سے ہم نے توبہ کر لی کہ اب انہیں ہرگز نہیں چھیڑیں گے۔"

"تو اس کے بعد سے آپ لوگوں نے بھوتوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا فیصلہ کر لیا؟" اس بار عبداللہ کی بیگم بولی تھیں۔

"اس کے علاوہ اور ہم کیا کرتے؟" ہماری بیگم نے جواب دیا۔

"یار، اس مکان پر لعنت بھیجو، اسے بیچ کر کوئی دوسرا گھر خرید لو۔ گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتا ہے مگر تم لوگوں کو وہاں کوئی سکون نصیب نہیں، ہر وقت خطرے کا دھڑکا، ایسے مکان کے ہونے سے نہ ہونا بہتر۔"

"تمہاری بات بالکل درست ہے مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ نہ ہم اس مکان کو فروخت کر سکتے ہیں نہ کرائے پر دے سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہم اسے بھوتوں کے حوالے بھی تو نہیں کر سکتے۔ تم کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ ہم نے کتنی محنت اور جدوجہد کے بعد یہ مکان بنایا ہے۔"

"اس بات کا تو اندازہ ہے کہ آج کے دور میں معمولی آمدنی والے آدمی کے لیے گھر بنانا آسان کام نہیں لیکن تمہاری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اب اس مکان کو فروخت کر سکتے ہو نہ کرائے پر دے سکتے ہو؟"

"بات دراصل یہ ہے پیارے، کہ جب میں نے یہ جگہ خریدی تھی تو یہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا اور جہاں اب یہ مکان ہے، وہاں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب اس کے اطراف بسنے والے لوگوں کو پتا چلا کہ ہم نے یہ قطعہ اراضی خریدا ہے تو کچھ لوگ بولے۔ "یہ آپ نے کیا غلطی کی، کم از کم اسے خریدنے سے پہلے ہم لوگوں سے مشورہ تو کر لیا ہوتا۔"

"کیوں؟ اس میں غلطی کی کیا بات ہے؟" میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "اس کی قیمت بہ نسبت دوسری زمینوں کے بہت کم تھی اس لیے خرید لی۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کوڑیوں کے مول خریدی ہے کیونکہ اس زمین کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یہ حصہ ایک عرصے سے بھوتوں کا مسکن سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کے قریب کوئی جانا بھی نہیں چاہتا۔"

ہم نے اس وقت ان باتوں پر توجہ نہیں دی کہ ہم دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے ہیں اور ایسی توہم پرستانہ باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔"

"اور جب......" میں ذرا رکا تو سلمیٰ بیگم نے میری بات آگے بڑھائی۔

"ہم نے بھوتوں سے تنگ آ کر اسے فروخت کرنا یا کرائے پر اٹھانا چاہا تو اس علاقے کے سارے اسٹیٹ ایجنٹوں نے صاف کہہ دیا۔

"نہ یہ مکان بک سکتا ہے نہ کرائے پر اٹھ سکتا ہے کیونکہ اس علاقے کے تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ جگہ اور یہ گھر بھوتوں کا مسکن ہے جبکہ ہم اس علاقے کے باہر کے لوگوں کو دھوکہ دے کر بھی اس کا سودا نہیں کرا سکتے کیونکہ ہمیں اسی علاقے میں رہنا ہے، کاروبار کرنا ہے اس لیے ہم کوئی دھوکہ دہی کا کام نہیں کر سکتے۔"

"اوہ پھر تو واقعی تم لوگ بھوتوں کے ہاتھوں بالکل یرغمال بن کر رہ گئے ہو۔"

عبداللہ کے گھر پر خاصا وقت گزار کر جب ہم میاں بیوی لوٹنے لگے تو سلمیٰ بیگم نے عبداللہ بیگم کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ "دیکھیے، اب آپ لوگوں کی باری ہے، کسی دن وقت نکال کر آئیے۔ اگر آنے جانے ہی سے تو محبت بڑھتی ہے۔"

ناہید جھٹ بول پڑی۔ "بھائی، برا مت مانیے گا، جہاں تک آپ کے گھر دوبارہ آنے کی بات ہے تو ہمیں اس کا بالکل حوصلہ نہیں کہ آپ کے بھوت بھائیوں اور بھوت بہنوں سے رشتے داری قائم کریں۔ ہمارا پہلا ہی تجربہ خاصا تلخ ہوا ہے۔ بہتر اب آپ لوگ یہیں آ جایا کریں۔"

یہاں آتے وقت ہم بچوں کو ان کی نانی کے گھر چھوڑ آئے تھے۔ میرے بیٹے جواد نے اپنی نانی کے گھر پر ہی ایک تصویر دکھائی۔ "ارے، یہ تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

"میں نے کھینچی تھی جس وقت آپ لوگ منی کے لیے حواس باختہ تھے، میں بھاگ کر کیمرہ لے آیا تھا کہ ایسا منظر بار بار نظر نہیں آئے گا اور میں نے جلدی سے تصویر کھینچ لی تھی۔"

یہ تصویر منی کی تھی، سیلنگ فین پر بیٹھی ہوئی منی کی۔ واقعی یہ ایک نایاب تصویر تھی۔ ایک ننھی منی بچی جو اپنے بل بوتے پر ابھی بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی، پنکھے کے اوپر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس تصویر کو ذرا روشنی میں لے جا کر غور سے دیکھا تو اس بات کا پتا چل رہا تھا کہ کوئی اسے گود میں لیے بیٹھا ہے مگر اس کا عکس واضح نہیں تھا، دھندلا دھندلا سا کوئی پیکر تھا۔ وہاں تو یہ بات میں نے کسی اور کو نہیں بتائی مگر گھر آ کر سلمیٰ سے کہا۔

"اس تصویر کو غور سے تو دیکھو۔"

اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے پہلے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر تصویر دیکھنے لگی۔ اس کے بعد اچانک بول پڑی۔ "ارے......!"

"کیوں، کیا ہوا؟"

"منی کو تو کوئی گود میں لیے بیٹھا ہے۔"

"ہاں، یہی دکھانے کے لیے تو میں نے تمہیں اسے غور سے دیکھنے کو کہا تھا۔ کیمرے کی آنکھ چونکہ بہت حساس ہوتی ہے اس لیے جو چیزیں ہماری آنکھیں بھی نہیں دیکھ سکتیں، اسے نظر آ جاتی ہیں۔"

"مگر یہ ہے کون؟ اس کی شبیہہ تو واضح نہیں؟"

"منی کا کوئی ماموں یا خالہ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟"

"اچھا۔" سلمیٰ مسکرائی۔ "آپ بھی ناہید سلطانہ کی طرح بھوتوں کو میرا بھائی بہن سمجھنے لگے ہیں؟"

ایک دن سلمیٰ نے مجھ سے ایک عجیب بات کہی۔ "اس گھر کے بھوت میرے بھائی بہن ہوں یا نہ ہوں مگر منی کے دوست ضرور بن گئے ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’وہ کیسے؟‘‘

’’یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں اسے پنگھوڑے میں ڈال کر اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاتی ہوں۔‘‘

’’ہاں، مجھے معلوم ہے۔‘‘

’’ادھر جب سے وہ بڑی ہو رہی ہے، مجھے ہر وقت خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں پنگھوڑے سے گر نہ جائے، اس کے لیے ذرا ذرا دیر کے بعد میں آ کر اسے دیکھتی ہوں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے اس کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔‘‘

’’ہاں، اسے گدگدی بہت ہوتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں جب اسے گدگداتا ہوں تو وہ خوب ہنستی ہے۔‘‘

’’میں یہی محسوس کرتی ہوں کہ منی کے پاس کوئی ہے جو اسے گدگداتا ہے، اس کے ساتھ کھیلتا ہے اور پھر......‘‘ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔ جب وہ ذرا دیر کے بعد بھی کچھ نہیں بولی تو میں نے اسے ٹوکا۔

’’تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں؟‘‘

’’میں یوں رک گئی کہ کہیں وہ میرا واہمہ تو نہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ کبھی کبھی میں اچانک منی کے پاس چلی جاتی ہوں تو اس کے پاس ایک دو نئے کھلونے موجود ہوتے ہیں مگر اگلی بار وہ کھلونے غائب ہوتے ہیں۔‘‘

’’نہیں، تمہارا وہم نہیں ہے، منی کے بھوت ماموں یا بھتنی خالہ جب اس کے پاس ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ کوئی نیا کھلونا ہوتا ہے۔‘‘

اور ایک دن اس بات کا ثبوت بھی مل گیا، ہوا یوں کہ محلے میں کچھ دور ایک دھماکہ سا ہوا اور پھر آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ لوگ اس طرف بھاگے تو میرے دونوں بچے جواد اور عذرا بھی یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہو گیا ہے، اس طرف بھاگے۔ کچی عمر کے لڑکیوں اور لڑکوں میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، اپنے بچوں کو اس طرف بھاگتے ہوئے سلمٰی نے دیکھا تو انہیں آواز دے کر روکنے کی کوشش کی مگر جب انہوں نے پلٹ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو وہ بھی دیوانوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگی اور پھر انہیں بھیڑ بھاڑ سے ڈھونڈ کر گھر لائی۔ گھر پہنچی تو منی کے بے تحاشہ رونے کی آواز سنائی دی۔ دھماکے کی آواز سے پہلے منی پنگھوڑے میں بے خبر سو رہی تھی، شاید دھماکے کی آواز یا کسی اور وجہ سے وہ پنگھوڑے سے گر گئی تھی جس کے بعد غالباً خوف زدہ ہو کر وہ رونے لگی تھی۔ سلمٰی بچوں کو لے کر گھر میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران پریشان ہو گئی کہ منی جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ لگتا تو ایسا ہی تھا کہ اسے گود میں لیے کوئی چپ کرانے کی نیت سے اِدھر اُدھر گھوم رہا ہو مگر اسے گود میں لینے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سلمٰی کے واپس آنے کے بعد منی کو کسی نے پنگھوڑے پر لٹا دیا تھا۔

............*

آج ہم لوگ عبداللہ کے گھر میں پھر مدعو تھے۔ آج ہمارے ساتھ ہمارے بچے بھی تھے۔ ذرا دیر بعد عبداللہ نے کہا۔ ’’جب تک دونوں بیگمات غٹرغوں غٹرغوں کرتی ہیں، ہم دونوں ذرا باہر کا چکر کیوں نہ لگا لیں؟ دراصل مجھے ایک ضروری کام ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آپ لوگ جائیے۔‘‘ بیگم عبداللہ نے خوش دلی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد عبداللہ ایک گھر میں موجود تھا۔ ایک صاحب جب اس کے پاس آئے تو عبداللہ نے ان سے گویا میرا تعارف کرایا۔ ’’حضرت، یہ میرے وہی دوست ہیں جن کے بارے میں، میں نے آپ کو تفصیل بتائی تھی۔‘‘

میں چونکا۔ ’’تو یہ عبداللہ کا بچہ، مجھے بھوتوں سے نجات دلانے کے لیے چپکے چپکے خود ہی کارروائیاں کرتا پھر رہا ہے۔‘‘ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

’’مخلص دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔‘‘ صاحب خانہ کے منہ سے یہ جملہ سن کر میں ایک بار پھر چونکا تھا۔ گویا انہوں نے میرے دل کی آواز سن لی تھی۔ اب وہ کہہ رہے تھے۔ ’’ان کا فکرمند ہونا فطری بات ہے۔ ٹھیک ہے، آپ ان بھوتوں کو اب چھیڑنا نہیں چاہتے مگر ان کے ساتھ مستقل رہائش بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔ آپ کے ساتھ بچے بھی ہیں جبکہ بدروحوں کے موڈ مزاج کا کچھ پتا نہیں ہوتا، کسی وقت بھی وہ شیطان بن سکتے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے آپ کے گھر کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ آپ کے گھر میں ایک دو نہیں، سات آٹھ بھوت موجود ہیں جن میں ایک بوڑھی عورت، ایک جوان عورت، مرد کا جوڑا اور چند بچوں کی روحیں یا بھوت موجود ہیں۔‘‘

یہاں تک کہہ کر موصوف ذرا رکے پھر گویا ہوئے۔ ’’جہاں اس وقت آپ کا یہ گھر موجود ہے، ایک طویل عرصے تک یہاں ایک جنگل سا تھا۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جب یہ حصہ جنگل نہیں تھا، یہاں ایک بوڑھی خاتون رہتی تھی جسے آخری عمر میں جادوئی علم سیکھنے کا خبط سوار ہوا اور اس چکر میں اس نے اپنے کوئی پانچ نواسے نواسیوں کو ایک ایک کرکے مار ڈالا، یوں سمجھیے، اپنے شیطانی دیوتا کو خوش کرنے کے لیے اس نے ان بچوں کو قربان کر دیا۔ جب اس کی بیٹی اور اس کے داماد کو معلوم ہوا کہ اس کے جو بچے غائب ہو گئے ہیں، ان کا اغوا کنندہ کوئی اور نہیں، اس کی ماں ہے، جس نے اپنے شیطانی ارادے کے تحت انہیں مار دیا ہے تو دونوں میاں بیوی نے اس خبیث بڑھیا کو قتل کر دیا مگر اس جادوگرنی نے مرنے کے بعد بھی بیٹی داماد کو معاف نہیں کیا اور بدروح کی صورت میں دونوں کی موت کا سبب بنی۔

پورے خاندان کی تباہی اور خاتمے کے بعد ان کا گھر بہت دنوں تک بدروحوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ کچھ لوگوں نے اس میں داخل ہونے اور رہنے کی کوشش کی تو انہیں نقصان پہنچا پھر یہ گھر ویران پڑے پڑے ہی کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا پھر یہاں جنگل جھاڑ اگ آئے۔ وہاں سے بھی اکثر راتوں کو رونے اور سسکیاں لینے کی آوازیں آتی تھیں۔ وقت گزرتا رہا، اس جھاڑی کے اردگرد تو آبادی ہو گئی مگر اس مخصوص جگہ کے قریب بھی کوئی جانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ جس اسٹیٹ ایجنٹ نے آپ کے ہاتھوں وہ زمین بیچی تھی، آپ کو شاید علم نہیں کہ وہ آپ کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے کے بعد وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے بڑی ہمت کی کہ اس جگہ کو صاف کرایا اور مکان تعمیر کیا۔‘‘ ذرا دیر تک رک کر موصوف نے دم لیا پھر بولے۔ ’’آپ لوگ اس مکان میں محض اس وجہ سے رہائش پذیر ہو گئے کہ آپ کے ساتھ بچے تھے جس میاں بیوی کے بچوں کو خبیث بڑھیا نے قتل کر دیا تھا، وہ آپ کے بچوں کو دیکھ کر اپنی ممتا کو تسکین دیتے ہیں۔ وہ تو ایک طرح سے آپ لوگوں کے دوست بن گئے ہیں مگر خطرہ اس جادوگرنی بڑھیا کی بدروح سے ہے، وہ کسی وقت بھی آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہے۔‘‘

وہ اب کی بار رکے تو عبداللہ بول پڑا۔ ’’اب بتاؤ، تمہارا کیا ارادہ ہے؟‘‘

کوئی جواب دینے کی بجائے میں سوچنے لگا کہ یہ بزرگوار اس مولوی کی طرح اناڑی نہیں معلوم ہوتے جنہوں نے اگربتیاں اور پڑھا ہوا پانی دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''ہاں بھائی.....! تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے پھر بھی اگر آپ کا دل نہ مانے تو نہ میں زبردستی کروں گا نہ ہی برخوردار عبداللہ آپ کو مجبور کریں گے۔''

مجھے ان حضرات کے علم اور دانش کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ یہ عام جھاڑ پھونک کرنے والے بندے نہیں ہیں' کوئی پہنچی ہوئی شخصیت ہیں لہٰذا میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے ان بھوتوں کے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں' بس اس بات سے ڈرتا ہوں کہ ان کے خلاف کوئی تدبیر کرنے سے وہ پھر مشتعل نہ ہو جائیں۔''

''نہیں بھائی' ایسی کوئی بات نہیں ہوگی' بس آپ لوگوں کو چند دنوں کے لیے کہیں اور قیام کرنا پڑے گا۔ اس دوران جو کارروائی کی جائے گی' اول تو اس کا ان کی طرف سے کوئی ری ایکشن نہیں ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو اس کا نشانہ نہیں بنو گے۔''

عبداللہ کے گھر واپس آ کر میں نے ساری باتیں بتائیں تو سلمٰی نے کہا۔ ''دیکھیے' اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیے پھر کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''ارے نہیں بھائی! یہ کوئی اناڑی مولانا مولوی نہیں' آپ کے میاں کو کچھ کچھ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔''

''مگر یہ جو انہوں نے چند روز کہیں اور رہنے کو کہا ہے تو ہم جائیں گے کہاں؟''

''ارے بھائی! یہ بھی کوئی پرابلم ہے' یہیں رہیں گے آپ لوگ۔''

''یا پھر.....'' میں نے کہا۔ ''تمہاری والدہ کے گھر۔''

''نہیں۔'' سلمٰی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اماں کے گھر نہیں' ہم یہیں رہیں گے۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا' اگلے بدھ کو پروگرام کے مطابق ہم میاں بیوی اپنے بچوں سمیت عبداللہ کے گھر آ گئے اور جمعرات کے دن سے بزرگوار نے ہمارے گھر پر اپنا عمل شروع کر دیا اور پھر پیر کے دن انہوں نے ہم سے کہا۔ ''لو بھئی' تمہارا گھر اب ہر طرح کے بھوت پریت سے پاک ہو گیا ہے۔ جاؤ' اب بال بچوں کے ساتھ بے کھٹکے وہاں رہو۔''

میں نے پہلے تو بزرگوار کا شکریہ ادا کیا پھر کہا۔ ''اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کیا یہ بتانا پسند کریں گے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''نہیں۔'' وہ مسکرائے۔ ''اس میں ناگواری کی کیا بات ہے مگر آپ لوگوں کو صرف اتنا ہی بتایا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے اس جادوگرنی بڑھیا کی بدروح کو قابو کرنا پڑا اور اس کے جادو کو بے اثر کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان بدروحوں یا بھوتوں کو کوئی تکلیف دیئے یا گزند پہنچائے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلام کی مدد سے ان بے قرار اور بھٹکتی ہوئی روحوں کو قرار پہنچانے کی دعائیں اور تدبیر کی گئیں اور پھر اس رحیم و کریم ذات نے ان کی بے قراری کو قرار بخشا اور وہاں سے' آپ کے گھر سے' انہیں بلا کر ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔''

یہاں تک کہہ کر وہ رکے پھر بولے۔ ''اب آپ لوگوں کو یہ کرنا ہے کہ چالیس روز تک آپ دونوں میاں بیوی جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھ کر ان روحوں کی بخشش کی دعا کر سکتے ہیں' کریں تاکہ اب وہ جہاں بھی ہیں' زیادہ سے زیادہ سکون اور اطمینان کے ساتھ رہیں۔''

......☆☆......

پراسرار کہانیاں

عقل کو گنگ کر دینے والی ایسی کہانیاں جن پر دل اور ذہن یقین نہیں کرتا

نوشاد علی

بنڈل شاہ

سائیں بنڈل شاہ بابا سے اگر کوئی مالی پریشانی کا تذکرہ کرتا تو وہ ایک سادہ کاغذ پر چیک کی طرح رقم لکھ کر دیتے تھے' اور خدا کی قدرت دیکھیے' اُس شخص کو اتنی ہی رقم کہیں نہ کہیں سے ضرور مل جاتی تھی ایک روز......

موسیقارِ اعظم نوشاد کے قلم سے نکلا ماضی کا ایک کرارا سچ



WWW.PAKSOCIETY.COM

میری ایک بزرگ سے ملاقات تھی۔ فقیری لینے سے قبل یہ بزرگ مدراس سیشن عدالت کے جج تھے۔ بمبئی کے لوگ انہیں سائیں بنڈل شاہ بابا کہتے تھے۔ انگریزی زبان کے ماہر تھے۔ یہاں تک کہ عربی کی کوئی آیت بھی لکھتے تو رومن حروف میں۔ زبردست روشن ضمیر تھے۔ مجذوبی کیفیت میں رہتے تھے۔ بابا کے پاس کوئی مریض آتا تو وہ ہمیشہ اُسے سنگترا کھانے کی تلقین کرتے۔ ایک دن اُن کے ایک مرید سے میں نے اِس کی وجہ پوچھی۔ جواب ملا۔ ''بابا کا اشارہ ہوتا ہے کہ ناگپور میں بابا تاج الدین کے دربار میں حاضری دو۔'' وہ بابا تاج الدین ناگپوری کے مرید تھے۔

سائیں بنڈل شاہ بابا سے اگر کوئی شخص مالی پریشانی کا تذکرہ کرتا تو وہ ایک سادہ کاغذ پر چیک کی طرح رقم لکھ کر دیتے تھے اور خدا کی قدرت دیکھیے، اُس شخص کو اتنی ہی رقم کہیں نہ کہیں سے ضرور مل جاتی۔ ایک روز میں بابا کو میاں کاردار سے ملانے کے لیے لے گیا۔ کاردار اُن دنوں فلم دل لگی کی ایڈیٹنگ میں مصروف تھے۔ بابا کو میں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میں انہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔ جب وہ کاردار اسٹوڈیو کے ایڈیٹنگ روم میں داخل ہوئے تو مجھ سے پوچھا۔ ''یہاں کیا کام ہوتا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''بابا! یہاں تو فوٹو کھینچے جاتے ہیں۔'' بابا بضد ہو گئے کہ میرا فوٹو بھی کھینچو۔ کمپنی کے فوٹو گرافر کو بلوا کر اُن کی تصویر بنوائی گئی۔ اب بابا کی یہ ضد کہ میرا فوٹو ابھی دکھاؤ۔ بابا کو بہت سمجھایا کہ تصویر بننے میں وقت لگے گا مگر اُن کی ضد یا حکم دیکھتے ہوئے فوراً تصویر بنوا کر انہیں پیش کی گئی۔ بابا نے اپنا فوٹو دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔ ''اِن کو کچھ دینا چاہیے۔''

اُن کے مرید نے کہا۔ ''بابا! ان کو چیک دے دیجیے۔'' میں نے کاردار کی طرف اشارہ کر کے اُن سے کہا۔ ''بابا! فوٹو کی یہ دکان اِن کی ہے۔''

کاردار ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا۔ ''بابا! آپ کو جو کچھ بھی دیں، اُسے احترام کے ساتھ قبول کر لیجیے گا۔'' بابا نے کاغذ منگوایا اور لکھا۔ PAY HIM RUPEES 25 LAKHS (انہیں 25 لاکھ روپے دے دیے جائیں)

اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیے۔ میاں کاردار نے یہ چیک قبول کر لیا۔ میں نے اُن سے کہا۔ ''اِسے احتیاط سے رکھیے گا۔ آج تک بابا نے جسے بھی ایسا چیک دیا وہ کیش ضرور ہوا۔'' کاردار نے میرے اصرار پر وہ چیک اپنے پاس رکھ تو لیا مگر یہ بھی کہا۔ ''نوشاد صاحب! اِس بوڑھے نے ایک کاغذ کا ٹکڑا تھما دیا ہے، آپ بھی کیا مذاق کرتے ہیں۔''

فلم دل لگی، بہت ہی کم لاگت میں بنی تھی۔ ریلیز ہوئی تو سپرہٹ ثابت ہوئی اور کاردار میاں پر دولت کی بارش ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے 'دلاری' بنائی۔ یہ بھی چھوٹے بجٹ سے بنائی گئی تھی مگر سپرہٹ ہوئی۔ دلاری کے بعد کاردار نے 'درد' بنائی۔ تینوں فلمیں سلور جوبلی ثابت ہوئیں۔ میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں کاردار کے آفس میں ایک تجوری تھی اور میاں کاردار اُس تجوری میں پیروں سے روپے ٹھونستے تھے۔ کیوں کہ ہاتھوں کی طاقت سے یہ کام نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن میاں کاردار نے مجھ سے کہا۔ ''واقعی نوشاد صاحب بابا نے مجھے جو چیک دیا تھا۔ وہ کیش ہو گیا۔'' پھر انہوں نے مجھے اپنا ایک خواب سنایا کہ ''بابا اسٹوڈیو میں شوٹنگ دیکھنے آئے ہیں اور کرسی پر بیٹھے شوٹنگ دیکھ رہے ہیں۔ اتنی دیر میں یونٹ کے لوگوں نے شور مچایا کہ بابا مر گئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بابا کرسی پر لڑھک گئے تھے۔'' یہ خواب بیان کرنے کے بعد کاردار میاں نے مجھ سے کہا۔ ''بابا کی خیر خبر معلوم کیجیے کہ کہاں ہیں۔ مجھے تو اُن کو نذر پیش کرنا ہے۔'' بابا ناگپاڑے میں رہتے تھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بابا کا اُسی رات انتقال ہوا جس رات میاں کاردار نے انہیں خواب میں دیکھا تھا۔ بابا کا مزار چھوٹا سونا پور قبرستان بمبئی میں ہے۔

اِس واقعے سے بہت پہلے ایک ایسا ہی چیک بابا نے ایس یو سنی کو بھی دیا تھا اور انہیں ایک سائن بورڈ بھی بنا کر دیا تھا جس پر نیوی، آرمی اور کمانڈر جیسے الفاظ بابا نے لکھے تھے۔ سنی صاحب اور میں سمجھ نہیں پائے کہ سائن بورڈ پر جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ بابا کے ایک مرید نے اس کی تشریح کی کہ آپ آزادانہ طور پر کوئی کام کریں گے اور اس کام میں آپ کی پوزیشن ایک کمانڈر کی ہوگی۔ اس کے بعد ایس یو سنی نے اپنا ادارہ قائم کیا۔ پروڈیوسر بنے اور اُن کی بنائی ہوئی پہلی فلم ''بابل'' نے کامیابی کے ریکارڈ قائم کیے۔ جس وقت بابا نے ایس یو سنی کو چیک لکھ کر دیا تھا تو سنی صاحب نے پوچھا تھا کہ چیک میں لکھی ہوئی اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ خدا کی قدرت کہ کچھ دن بعد ایک گجراتی فنانسر خود سنی صاحب کے پاس آیا اور اتنی ہی رقم لے کر آیا جتنی رقم کا چیک بابا نے ایس یو سنی کو دیا تھا۔

ایک دن میں بابا کی ہدایت اور حکم کے مطابق اُن کے ساتھ ٹیکسی میں چوپاٹی جا رہا تھا۔ چوپاٹی پہنچے تو بابا نے ٹیکسی ڈرائیور سے کسی اور جگہ چلنے کے لیے کہا۔ وہاں پہنچے تو دوسری جگہ جانے کو کہا۔ اس طرح صبح سے شام ہو گئی۔ آخر میں ناگپاڑے آئے۔ ٹیکسی میں پیٹرول بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بابا سے کہا گیا۔ ''حضرت! گھر آ گیا۔ اتریے۔'' بابا نے کہا۔ ''میں نہیں اُترتا، ابھی تو مجھے اندھیری جانا ہے۔''

اندھیری میں ایک ضعیف خاتون رہتی تھیں۔ بابا اکثر اُن سے ملنے جاتے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور صبح سے شام تک بابا کو اور ہمیں گھماتا رہا تھا۔ اب وہ بھی جھنجھلا چکا تھا۔ ٹنکی بالکل خالی تھی۔ ''آپ ٹنکی میں خود دیکھ لیجیے۔ نہیں معلوم اب میں واپس بھی کس طرح جاؤں گا۔ پیٹرول پمپ بھی یہاں سے دور ہے۔ ٹیکسی روک کے پہلے مجھے ڈبے میں پیٹرول لانا ہو گا یا کسی ٹیکسی ڈرائیور کی منت کرنی ہو گی۔'' ڈرائیور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ میٹر میں سوئی اب زیرو سے بھی نیچے آ چکی تھی۔ آخر کبھی تو پیٹرول ختم ہو جانا تھا۔ ٹیکسی کا پیٹرول پمپ تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ میں نے بھی بابا سے کہا کہ ٹیکسی سے اُتر آئیں۔ دوسری ٹیکسی سے اندھیری جائیں گے۔ کہنے لگے۔ ''پیٹرول بن جائے گا۔ گاڑی چلے گی۔ گاڑی چلے گی۔'' اس تکرار کے بعد بابا نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ''لو پیٹرول بن گیا۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی چلائے۔'' میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔ ''بھائی! تم گاڑی اسٹارٹ کرو۔ اگر نہیں چلے گی تو بابا کو اتار لیں گے اور قریب میں کوئی پمپ نظر آیا تو پیٹرول بھروا لیں گے۔''

ڈرائیور نے میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا کہ یہ کیا بے وقوفی کی بات کر رہا ہے۔ پھر غصے میں آ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی فوراً چل دی۔ اُس نے کہا۔ ''پیٹرول کے دو چار قطرے ہوں گے،

WWW.PAKSOCIETY.COM

اِس سے اسٹارٹ ہوئی ہے۔ اندھیری یہاں سے بیس میل دور ہے۔ پٹرول کے بغیر کہاں جائے گی؟" میں نے اُس سے کہا۔ "تم چلائے جاؤ۔ گاڑی جہاں رکے گی ہم وہیں اُتر جائیں گے۔"

ٹیکسی چلی' اندھیری پہنچی۔ بابا جن بی سے ملنے گئے۔ واپس ناگپاڑے آئے۔ ٹیکسی باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ ٹیکسی والا جب ناگپاڑے واپس آیا تو بابا کے قدموں میں گر گیا اور معافی مانگنے لگا۔ بار بار یہی کہتا۔ "بابا! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ مجھے معاف کردو۔" بعد میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "بابا میں سیٹھ کا دس ہزار کا مقروض ہوں۔" بابا نے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے؟" ہم نے بتایا کہ اپنی پریشانی بیان کررہا ہے۔ دس ہزار کا مقروض ہے۔" بابا نے یہ بات سُنی تو اُس سے کہا۔ "کاغذ لا' کاغذ لا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے سڑک پر پڑا ہوا کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر بابا کو دیا۔ بابا نے اُس پر انگریزی میں لکھا۔ "دس ہزار روپے حاملِ رقعہ کو ادا کردیے جائیں۔" ٹیکسی ڈرائیور غیر مسلم تھا۔ اُس نے عقیدت کے ساتھ چیک لیا اور چلا گیا۔

دوسرے دن وہ مٹھائی' پھول اور ناریل وغیرہ لے کر بابا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے بتایا کہ اُسے دس ہزار روپے مل گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ "اُسے دس ہزار کہاں سے ملے؟" اُس نے جواب دیا۔ "سٹہ لگا تھا۔ پورے دس ہزار روپے ملے۔ زندگی میں کبھی اتنا پیسہ نہیں ملا تھا۔ حالانکہ میں ہمیشہ سے سٹہ کھیلتا ہوں۔"

بابا سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بھی بیان کرتا چلوں۔

ایک صاحب دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہ بابا کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک روز میرے پاس وہ دادر کے مکان میں آئے۔ اُن کا بیوی کے ساتھ معمولی سا جھگڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بتائیے کیا کروں۔ میں نے کہا۔ "تمہیں اپنے بابا کے پاس جانا چاہیے۔ وہ بتائیں گے کہ تم کیا کرو۔" وہ صاحب بابا کے پاس پہنچے۔ مریدوں نے اُن سے کہا کہ یہ بابا کی عبادت کا وقت ہے۔ اِس وقت وہ آپ سے نہیں ملیں گے۔ یہ بضد ہوئے اور رونے پیٹنے لگے تو مریدوں نے انہیں بابا کی پشت کی طرف بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ وہ خاموشی سے بابا کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ بابا کی عبادت کا طریقہ بھی بڑا نرالا تھا۔ وہ رسی کا بہت بڑا بنڈل بناتے تھے' اُسے کھولتے تھے اور لپیٹتے تھے۔ اسی لیے لوگ انہیں بنڈل شاہ بابا کہنے لگے تھے۔ ایک طرح یہ بابا کی تسبیح تھی۔

کچھ دیر بعد اپنے پیچھے دیکھے بغیر بابا نے بولنا شروع کیا۔ "اُس کی ماں طوائف' اُس کی نانی طوائف' وہ تیری کب رہ سکتی ہے۔ طلاق دے دے۔ طلاق دے دے۔" وہ صاحب اپنی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ بابا کی زبان سے طلاق کا لفظ سنا تھا بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے۔ "غضب ہوگیا۔ میرے سوا یہ راز کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میری بیوی طوائف خاندان سے ہے مگر بابا نے تو اُس کا پورا شجرہ بتا دیا۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے مگر بابا اُسے طلاق دینے کی بات کرتے ہیں اور میں طلاق نہیں دینا چاہتا۔"

دوسرے روز وہ عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اُن صاحب کا یہ واقعہ سنا تو سوچتا رہا کہ میں بابا سے آج تک کیوں نہیں ملا۔ مجھے بزرگوں سے ملنے کا بچپن سے شوق تھا۔ رات کو نو بجے میں نے طے کیا کہ صبح بابا سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ صبح میں کاردار اسٹوڈیو گیا تاکہ اپنے اسسٹنٹ

غلام محمد کو بتادوں کہ تم گلوکاروں کو ریہرسل کراتے رہنا' میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ پھر میں جیسے ہی میوزک روم میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ میری کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ اُن کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ اُن صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کا نام نوشاد ہے؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں" وہ صاحب کہنے لگے۔ "رات نو بجے مجھ سے بابا نے کہا کہ پریل میں ایک میوزک والا رہتا ہے۔ صبح اُس سے ملنا ہے۔ رات سے یہی ضد تھی۔ لہٰذا بابا آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔" میں نے بابا کو سلام کیا۔ میرے سلام کے جواب میں بابا نے ہنسنا شروع کردیا۔ جو صاحب بابا کے ساتھ آئے تھے وہ اُن کے خاص مرید تھے۔ انہوں نے بابا سے کہا۔ "بابا آپ جن نوشاد سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ یہ ہیں۔" بابا نے کہا۔ "گُنی ہے' گُنی ہے۔" بابا نے گُنی ہے' گُنی ہے کی اتنی تکرار کی کہ اُن کے مرید نے کہا۔ "اگر اچھا لڑکا ہے تو کچھ دیجیے۔" بابا نے کاغذ منگوایا اور اُس پر لکھا۔

PAY HIM RUPEES 25 LAKHS (اُسے 25 لاکھ روپے ادا کردیے جائیں) اُس وقت تک میں بابا کے کشف و کرامات سے واقف نہیں تھا۔ اُن کے مرید نے کہا۔ "آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ بابا نے آپ کو اتنی بڑی رقم کا چیک دیا ہے۔" میں نے بابا کا دیا ہوا چیک لیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ بابا مجھے بغور دیکھتے رہے۔ میں نے چیک بابا کو واپس کردیا اور کہا۔ "بابا! یہ مجھے نہیں چاہیے۔ آپ سے کچھ لوں گا تو اس سے بڑی چیز لوں گا۔ مجھے یہاں سے 500 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اُس سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ آپ مجھے اتنی بڑی رقم دے کر دنیا کی زنجیروں میں اور الجھانا چاہتے ہیں۔" بابا نے اپنے مرید سے کہا۔ "اِس سے پوچھو' کیا چاہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے دعا دیجیے کہ میں نیک رہوں' نیک بنوں۔" بابا نے میری بات غور سے سنی میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا اور پھر مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ "تُو پہلا آدمی ہے جو پیسہ نہیں مانگتا۔ یہاں تو جو ملتا ہے پیسہ مانگتا ہے۔ تُو صرف دعا چاہتا ہے۔" بابا نے بعد میں اُس چیک کی پشت پر ایک دعا لکھ کردی اور کہا کہ "اِسے بعد نماز عشا پڑھا کرو۔"

بابا نے آج سے 42,43 سال پہلے جو دعا لکھ کردی تھی۔ وہ میں آج تک باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ دعائیہ چیک ملنے کے دوسرے تیسرے دن سے لوگ گھر آنے لگے۔ نئی نئی آفرز آنے لگیں۔ اس دوران مجھے جن لوگوں کی فلموں کی پیش کش ہوئی۔ اُن میں وی شانتا رام' من موہن ڈیسائی کے والد نانو بھائی ڈیسائی' جے بی ایچ واڈیا' وی ایم ویاس اور موہن اسٹوڈیوز کے مالک کی فلمیں تھیں مگر میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک وقت میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فلموں کی موسیقی ترتیب دیتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے وقت کے اتنے بڑے بڑے اداروں اور فلم میکرز کی فلمیں سائن نہیں کیں۔ انہی دنوں فلمستان کے مالک جالان صاحب رات کے وقت میرے گھر تشریف لائے اور انہوں نے مجھے بیس پچیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر فلمستان میں کام کرنے کی آفر دی۔ بابا کے چیک دینے کے سال ڈیڑھ سال بعد جب میں نے حساب لگایا تو آپ کو حیرت ہوگی۔ اگر میں یہ تمام فلمیں سائن کرلیتا تو مجھے وہی معاوضہ ملتا جو بابا نے چیک میں لکھا تھا۔

☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

محمد اقبال زمان

موت کا کھیل

سعدیہ حریم کا خیال

یوں تو ''دکھ'' لفظ ہے چھوٹا سا مگر پھر بھی حریم
جب اٹھا نا ہو تو ایک بار گراں ہو تا ہے

زندگی کی بازی ہارتے شہر لہورنگ کراچی کی ایک اور کہانی



ایسا لگتا ہے جیسے میرے اس کراچی عروس البلاد (کبھی ہوا کرتا تھا)' سے زندگی روٹھ گئی ہے۔ ہر طرف موت کا شور اور زور ہے۔ پہلے ٹی وی نیوز چینلو پر بریکنگ نیوز کی صورت اور پھر اخبارات میں سرخیوں کی صورت مرنے مارنے اور مارے جانے کی خبریں ہیں کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

کراچی کا المیہ

پھول کھل رہے ہوں یا زرد زرد موسم ہو
دھوپ ہو کہ چھاؤں ہو
خواہ کوئی موسم ہو'
ان کے شہر میں لیکن ایک سا ہی منظر ہے
بارشیں عدوات کی' آندھیاں عقائد کی
مختلف زبانوں کی دھوپ سی چمکتی ہے
گولیوں کا موسم ہے
ایمبولینس چیختی ہے
گھر سے جب نکلتے ہیں
سوچتے ہی رہتے ہیں
زندگی کی مٹھی سے آج جانے کیا نکلے!
وصل کی بشارت یا ہجر کا ہے پروانہ!
گھر کو لوٹ پائیں گے؟
شام اپنے آنچل میں کیا چھپا کے لائے گی
قربتوں کا موسم یا فاصلوں کی آہٹ کو
سوچتے ہی رہتے ہیں
'بات چیت' ڈرامے کا ڈراپ سین کیا ہوگا
ٹریجڈی یا کامیڈی
وقت اپنے دامن میں کیا چھپا کے لائے گا
بے گناہ لوگوں کا خون بول اٹھے گا
یا کہ رائیگاں ہوگا؟

(طلعت اخلاق احمد)

یہ خبر بھی میں نے پہلے ٹی وی پر بریکنگ نیوز کی صورت اور پھر اخبارات میں دیکھی ہے کہ...... ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک ہی خاندان کے 5 افراد سروں پر گولیاں لگنے سے جاں بحق ہو گئے۔ ان میں خاتون اور ایک شیر خوار بچے سمیت 3 بچے شامل ہیں جبکہ پولیس خیال ظاہر کر رہی ہے کہ گھر کے سربراہ نے باری باری سب کو قتل کرنے کے بعد خود کو بھی گولی مار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا ہے۔ بنگلے میں موجود خانساماں کو پولیس نے حراست میں لے کر تفتیش شروع کردی ہے۔ تفصیلات کے مطابق گذری تھانے کی حدود ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی فیز فور اسٹریٹ کمرشل نمبر 3 بنگلہ نمبر 83C/2 میں رہائش پذیر سانگھڑ شوگر مل کے فنانس آفیسر سمیت ان کی فیملی کے 5 افراد پراسرار طور پر سروں میں گولیاں لگنے سے ہلاک ہوگئے۔ پولیس کے مطابق ہلاک ہونے والوں میں مذکورہ گھر کا سربراہ 45 سالہ عبدالجواد درانی ولد عبدالفصیح درانی' ان کی اہلیہ 40 سالہ وجیہہ درانی' ان کا شیر خوار ایک سالہ بچہ عارض' 10 سالہ بیٹی رمیمن اور 13 سالہ بیٹا ریان شامل ہیں۔ پولیس کے مطابق واقعے کی اطلاع انہیں ساڑھے 10 بجے کے قریب متوفی عبدالجواد کے سالے وقار نے دی اور بتایا کہ عبدالجواد کے دوست جو متوفی عبدالجواد سے بار بار فون پر رابطہ کر رہے تھے مگر گھر والوں نے فون اٹینڈ نہیں کیا جس پر انہوں نے گھر کے باورچی کو موبائل پر فون کیا کہ گھر والے کہاں ہیں' کوئی فون نہیں اٹھا رہا جس پر باورچی اوپر گیا اور کمروں کے دروازے بند دیکھ کر اس نے دوست کو بتایا کہ سب سو رہے ہیں۔ پولیس کے مطابق متوفی عبدالجواد کے دوست نے دو بار رابطہ کیا تو عبدالجواد سے رابطہ نہیں ہو سکا اور اس بار انہوں نے متوفی عبدالجواد کے والد کو فون کیا اور ساری صورت حال

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے آگاہ کیا جس کے بعد ان کے والد نے مجھے فون کیا اور جب میں گھر آیا اور ان کے کمروں میں گیا تو سب کی خون آلود لاشیں پڑی تھیں۔ پولیس کے مطابق خاتون اور شیر خوار بچے کی لاشیں ایک کمرے میں بیڈ پر پڑی تھیں جبکہ گھر کے سربراہ ان کے بیٹے اور بیٹی کی لاشیں ایک کمرے میں پڑی تھیں۔ پولیس کے مطابق گھر کے معائنے کے دوران ایسی صورت حال نظر نہیں آئی کہ گھر میں کوئی لوٹ مار کی واردات ہوئی ہو۔ پولیس ذرائع کے مطابق متوفی عبدالجواد کی اہلیہ اور تینوں بچے دبئی میں مقیم تھے اور تین روز قبل ہی وہ کراچی آئے تھے تاہم پولیس نے گھر کے اندر موجود کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ساتھ چند مشکوک چیزیں اپنی تحویل میں لی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ گھر کے چند حصوں کے فنگر پرنٹ بھی لیے گئے ہیں جبکہ پولیس مذکورہ 5 افراد کے قتل کے حوالے سے کسی ٹھوس ثبوت تک تو نہیں پہنچ سکی البتہ پولیس اپنا خیال ظاہر کر رہی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ گھر کے سربراہ عبدالجواد نے باری باری سب کو قتل کرنے کے بعد آخر میں خود کو گولی مار کر ہلاک کرلیا ہے جبکہ 5 افراد کے قتل کے بعد علاقے میں بھی سخت خوف کی لہر پائی جاتی ہے، تاہم پولیس نے گھر کے باورچی کو حراست میں لے کر مزید تفتیش شروع کردی ہے اور پولیس ذرائع کا کہنا ہے کہ مذکورہ گھر میں ملازم کے طور پر صرف باورچی ہی کام کرتا ہے۔

میں اس خبر کے پیچھے چھپی کہانی جاننے کی خواہش میں جب مرنے والوں کے ورثا سے رابطہ کرتا ہوں تو میرے ہر سوال کا جواب بس ایک خاموشی ہی ہوتا ہے......!

کچھ سمجھ نہیں آتا کہ...... زندگی کے ساتھ موت آخر یہ کیسا کھیل، کھیل رہی ہے کہ...... انسان ہی انسان کا دشمن بن گیا ہے، انسانیت دوستی، رشتے سب کچھ بھول کر......! آخر وہ کون سا آسیب ہے جو انسان کو اپنے پیاروں کے لہو سے ہاتھ رنگنے پر مجبور کر دیتا ہے؟...... میں نے تو اس سوال کا جواب بہت تلاش کیا ہے لیکن اس تلاش میں ناکام رہا ہوں...... کیا آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے کہ وہ کون سا آسیب ہے؟ کون ہے یہ......؟؟

کون ہے یہ؟

یہ کون ہے کہ جو ہم تک آتی ہوا کو
گرہیں لگا رہا ہے؟
ہماری مٹھی سے زندگی کے
حسین جگنو چرا رہا ہے
کون ہے جو
ہماری شاموں میں دھیرے دھیرے
اترنے والے جمیل رنگوں کو
سیاہیوں میں بدل رہا ہے
یہ کون ہے جو
ہماری صبحوں کو
ڈھلتی شامیں بنا رہا ہے
ہمارے دل اب ہوا کی دستک پہ کانپتے ہیں
کون ہے جو ہوا کو
خوشبو کو زہر آلود کر رہا ہے
موسموں کو چرا رہا ہے
دلوں میں گرہیں لگا رہا ہے
کون ہے یہ!
پتا لگاؤ
تم اپنے گھر کی خبر نہ لو گے!!

(ط۔ا۔ا)

......☆☆......



قمر علی عباسی

ذکرِ جل پری کا

آتش کا خیال
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

...لی عباسی کے قلم سے ڈنمارک کے سفر کا آنکھوں دیکھا حال

زندگی بھر کسی شاعر سے سوال نہیں کیا کہ حضور، آپ اَن دیکھے محبوب کو ہمارے اعصاب پر کیوں طاری کرتے ہیں اس لیے کوئی ہم سے کیوں پوچھے۔

ملکہ مارگریٹ کی تصویریں ہم نے سفر سے پہلے دیکھی تھیں۔ صورت اور سیرت کی اچھی لگتی ہیں۔ جب اُن کے ذوقِ جمال اور حسنِ کلام، قابلیت اور صلاحیت کے بارے میں پڑھا تو محسوس ہوا، یہ قابلِ قدر، باعثِ احترام اور چاہے جانے کے قابل ہیں۔

ملکہ سے ملاقات ہوگی تو ممکن ہے وہ لقب باندھی لونڈی عطا فرمادیں۔ ڈنمارک کا کوئی غیر آباد جزیرہ عنایت کردیں۔ ہم بھی چھوٹے موٹے بادشاہ بن جائیں۔

ایک بجا۔ کوئی نہیں آیا۔

ترغیب کی اطلاع غلط تھی۔ ملکہ اگست کے مہینے میں چھٹیوں پر ہوتی ہیں اور اتوار کو دیدار کے لیے نہیں آتیں بلکہ صرف اپنی سالگرہ کے دن جھروکے میں آتی ہیں اور وہ 16 اپریل ہے جسے گزرے چار ماہ ہوچکے تھے۔ یورپ کے سیاح بھی اسی غلط فہمی میں تھے۔ بہرحال وہ نہ سہی، ان کے گارڈ، دروازے کی تصویر اتار لی۔ محل کو اچھی طرح دیکھا۔ اس فضا میں سانس لی جس میں وہ رہتی ہیں اور واپس چلے آئے۔

ملکہ ڈنمارک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ پیرس، لندن، کیمبرج میں طالب علم رہیں۔ یہ خوش نصیب خاتون ہیں۔ ان سے پہلے صرف مرد حضرات ہی بادشاہ بن سکتے تھے۔ 1953ء میں ایک ریفرنڈم کے ذریعے خواتین کو بھی ملکہ بننے کا حق ملا۔ 1972ء میں یہ 31 سال کی ہوئیں تو ان کے والد فیڈرک نہم کا انتقال ہوگیا۔ یہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اس لیے ملکہ بن گئیں اور یوں اس ملک کی پہلی ملکہ کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اعزاز حاصل کرلیا۔ ملکہ ڈنمارک تاریخ، معیشت دان اور علوم آثارِ قدیمہ کی ماہر ہیں۔ کئی جگہ تاریخی مقامات کی کھدائی کی نگرانی کی ہے۔ انہیں مصوری سے گہرا لگاؤ ہے۔ ڈنمارک کے مشہور مصنف اینڈرسن کی کہانیوں کو ٹیلی ویژن پر پیش کرنے میں پیش پیش رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پروڈکشن بھی کی ہے۔ انہیں ٹکٹ جمع کرنے، زردوزی اور پرانی پوشاکوں کا شوق ہے۔ اس کی کئی بار نمائش بھی ہوچکی ہے۔ خوش ذوق، خوش لباس اور ذہین ہیں جو اکثر بادشاہ اپنے دورِ حکومت میں ہوتے ہیں۔ شاپنگ خود کرتی ہیں، دنیا میں خواتین کا یہ پسندیدہ مشغلہ ہے۔ لفظ ”شاپنگ“ کو خواتین کے لیے ٹانک سمجھتے ہیں۔ کسی ملک، قوم اور علاقے سے تعلق رکھتی ہوں، شاپنگ کا لفظ سن کر یوں خوش ہوتی ہیں جیسے کسی حکومت کا تاج ملنے کی خبر ہو۔ ملکہ کیونکہ خاتون ہیں اس لیے یہ اطلاع ملتی کہ وہ شاپنگ نہیں کرتیں تو حیرت ہوتی۔ قانون ساز اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرتی ہیں۔ ملک میں قانون اُس وقت تک لاگو نہیں ہوسکتا جب تک یہ دستخط نہ کردیں اور انہیں کرنا پڑتے ہیں۔

1967ء میں جب یہ ملکہ نہیں بنی تھیں، لندن گئیں۔ ایک تقریب میں فرانسیسی سفارت کار ہنری آندرے سے ملاقات ہوئی اور پہلی نظر کا عشق ہوگیا۔ ہنری نے ملازمت چھوڑ کر شہزادہ بننا قبول کیا۔ شادی ہوگئی۔ انہوں نے اپنا عقیدہ، زبان، مقام، کام سب بدل لیا۔ ملکہ کے پیار کی اجرک ایسی پہنی کہ ان ہی کے ہو رہے۔ ہنری اب شہزادہ ہیں۔ ہوا بازی، کشتی رانی، شاعری، مصوری میں ماہر، پیانو بجانے میں جواب نہیں رکھتے۔ ملکہ کی طرح ذہین ہیں۔ ان کے دو شہزادے ہیں پرنس فیڈرک اور یوئم۔ قانون کے حساب سے فیڈرک ولی عہد ہیں اور بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ایک بار ہمیں بادشاہ بنا دیا جائے تو یقین کیجیے، ان سے زیادہ صلاحیتوں کے مالک بن جائیں گے۔ اینڈرسن کی جگہ اپنا مجسمہ تک لگوا لیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ہمارے بعد ہمارا ہی خاندان برسرِ اقتدار رہے ورنہ وہی حال ہوگا جو پاکستان میں سابق صدر اور سابق وزیراعظم کا ہوتا ہے۔

وہ بھی خوش، ہم بھی......

ڈنمارک یورپ کا سب سے پرانا ملک ہے۔ برس ہا برس پہلے وائی کنگ بحری قزاقوں نے دریافت کیا۔ یہ لوگ سمندر میں سفر کرتے اور ملکوں کو لوٹتے، کبھی ان پر حکومت کرتے۔ پہلی بار ڈنمارک وہی لوگ آئے۔ ویسے اس کی تاریخ کے آثار 240 ہزار قبل مسیح سے ملتے ہیں۔ اُس دور میں بھی انسانی وجود کا احساس ہوتا ہے۔ پتھر کے اوزار اور ہتھیار برآمد ہوئے جن سے خیال کیا جاتا ہے، لوگ شکار کرتے یا مچھلیاں پکڑتے تھے۔ زمین بھی کاشت کرتے ہوں گے۔

8ویں صدی شروع ہوئی تو ڈنمارک کے ایک علاقے جٹ سے تاریخ شروع ہوئی۔ ہمارے پنجاب میں ایک خاندان جٹ کہلاتا ہے، نہ جانے ان لوگوں کا ڈنمارک کے علاقے جٹ سے کیا تعلق ہے؟ ضرور ہوگا۔ 8ویں صدی میں یہ لوگ اس طرف آ نکلے ہوں گے۔ جٹ کا علاقہ ابھی تک ہے اور پنجاب میں پنجاب قوم بھی اگر کہیں پوچھ گچھ ہو تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا علاقہ ڈنمارک میں ہے۔ تھانے کچہری کی ضرورت ہو تو ہم اُن کے خرچ پر گواہی دینے جہاں چاہیں، سفر کرلیں گے۔

ڈنمارک میں جو قبیلہ مضبوط تھا جس کے پاس ہتھیار اور عقل تھی، وہ بادشاہ بن گئے۔ باقی رعایا۔ بادشاہ اور جنگ لازمی جزو ہیں بلکہ جنگ نہ ہو تو

بادشاہ کی دھاک نہیں بیٹھتی۔ پچھلے زمانے میں بادشاہوں کو جنگوں کا شوق تھا۔ جب دیکھو، دوسروں کے ملکوں پر حملہ کررہے ہیں۔ ڈنمارک کے برابر سوئیڈن اور ناروے ہے۔ یہ لوگ بھی کرکٹ اور فٹ بال ٹورنامنٹ کی طرح جنگیں لڑتے رہے۔ تاریخ کے ساتھ ڈنمارک کا جغرافیہ بھی بدلتا رہا۔

ایک زمانہ آیا، ڈنمارک کے بادشاہ نے ناروے اور انگلینڈ پر قبضہ کرلیا۔ یقین نہیں آرہا لیکن یہ حقیقت ہے پھر سوئیڈن بھی قبضے میں آگیا۔ اس کے بعد انگلینڈ ہاتھ سے گیا۔ ناروے بھی الگ ہوگیا۔ سوئیڈن کبھی ہاتھ آتا، کبھی جاتا۔ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ بادشاہ تو خوش رہے، بس عوام برباد ہوتی رہی جانی و مالی دونوں صورتوں میں لیکن لڑائی کا عجب نشہ ہے، جب بادشاہ کرتے ہیں تو خوب کرتے ہیں۔ ڈنمارک 30 سال تک جنگ کرتا رہا۔ ایک بار برطانیہ نے موقع پا کر ڈنمارک کے شہر میں اتنے گولے برسائے کہ سب ٹوٹ پھوٹ گیا لیکن فصلیں جلانے سے زمینیں بنجر نہیں ہوتیں۔ کوپن ہیگن پھر ویسا ہی ہوگیا۔

ڈنمارک نے گرین لینڈ کو اپنی نوآبادی بنا لیا۔ آئس لینڈ پر قبضہ کرلیا۔ جرمنی سے جھگڑا ہوا پھر دوستی۔

18ویں صدی کے وسط میں 5 جون کو پارلیمنٹ کی تشکیل کی اجازت دی گئی۔ اس یادگار دن کو چھٹی آج بھی ہوتی ہے۔

ڈنمارک کی نوآبادی آئس لینڈ نے آزادی کے لیے شور کیا۔ پہلے نیم خودمختاری دی لیکن اس سے عوام مطمئن نہیں ہوئے لہٰذا مکمل آزادی دی گئی۔ گرین لینڈ قبضے میں رہا بلکہ شکنجہ اور مضبوط ہوگیا۔

دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ہٹلر نے موقع غنیمت جان کر ڈنمارک پر قبضہ کرلیا۔ اِدھر اُدھر کے ملکوں پر راج کرنے والے غلام ہوگئے لیکن ہٹلر کا سورج ڈوبا، جرمنی کو شکست ہوئی تو ڈنمارک آزاد ہوگیا اور ابھی تک ہے۔ کوپن ہیگن نے ترقی کی۔ خواتین کے حقوق کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس کا فائدہ موجودہ ملکہ مارگریٹ کو ہوا۔ یہ فیصلہ کیا گیا، عورت کو بھی ملکہ بننے کا حق حاصل ہونا چاہیے اس لیے جب شاہِ وقت گزرے تو مارگریٹ ملکہ بن گئیں۔ دنیا میں آزادئ خواتین کا سب سے زیادہ فائدہ ڈنمارک کی شاہی خواتین کو ہوا۔

ڈنمارک، یورپ کا سسرال کہلاتا ہے۔ اس ملک کی شہزادیاں کئی جگہ شادی ہوکر گئیں۔ آج سے 30 سال پہلے ہمیں یہ معلوم ہوتا تو برصغیر کا سسرال بھی بنا دیتے۔ لاکھ ہمارے مخالفین یہ افواہ اڑائیں کہ اگر ہم ڈنمارک کے شاہی خاندان میں شادی کرتے، گھر داماد بن جاتے اور برصغیر کب سسرال ہوتی لیکن رقیبوں کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہیے، ویسے اِن دنوں بھی خسارے میں نہیں، اپنے گھر میں بادشاہ ہیں، ہمارا ہی حکم چلتا ہے۔

ڈنمارک کے شاہ کرسچین نہم کو یورپ کا سسر کہا جاتا ہے۔ شہزادیاں خوبصورت ہوں گی تو رشتے دور، قریب ہر جگہ سے آئیں گے اور سسر بننا بہرحال اچھا ہوتا ہے غلام بننے سے۔

ڈنمارک 500 جزیروں پر مشتمل ہے، بعض اتنے چھوٹے ہیں کہ سمندر میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں اور ان پر آبادی نہیں ہے۔ دو جزیرے سب سے بڑے ہیں۔ ایک جزیرہ زیلینڈ ہے، یہ سوئیڈن سے ملا ہوا ہے۔ اس میں کوپن ہیگن ہے جہاں ملک کی بڑی آبادی رہتی ہے۔ یہ تجارتی، صنعتی شہر ہے۔

دوسرا جزیرہ جٹ لینڈ ہے جو جرمنی سے متصل

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ ان جزیروں کے درمیان فری سروس چلتی رہتی ہے۔

بحری جہازوں کی رہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس تعمیر کیے گئے ہیں۔

فیونن جزیرے میں قلعے ہیں۔ اس کی وجۂ شہرت اینڈرسن ہے جو اس کے دیہات اوڈلیش میں پیدا ہوا تھا۔

ڈنمارک، جرمنی سے ملا ہوا ہے اس لیے لوگ عام طور سے جرمنی زبان سے واقف ہیں۔ دورانِ تعلیم ڈینش کے علاوہ بھی ایک زبان سیکھنی ضروری ہے۔ لوگ جرمنی اور انگریزی سیکھ لیتے ہیں، سیاحوں کو بڑی سہولت ہوتی ہے، ہمیں بھی کوئی دِقت نہیں ہوئی۔

یہ ملک ایک جزیرہ ہے اس لیے سمندر کی آب و ہوا گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گرمیوں میں موسم معتدل اور سردیوں میں نقطۂ انجماد سے نیچے گرا رہتا ہے۔ سیاح خوب آتے ہیں اور اس کے میدان، پہاڑ، جھیلیں اور سمندر دیکھتے ہیں۔ ڈنمارک کے ساحل سفید ریت، یورپ کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دنیا بھر سے اشیاء آتی ہیں۔ ہم اس بات پر خوش تھے کہ پاکستان سے پسند کے آم اور ککڑیاں تک آتی ہیں۔

ڈنمارک کے سرخ جھنڈے پر سفید کراس بنا ہے۔ اس کے بارے میں ایک مشہور روایت مشہور ہے، یہ آسمان سے خاص اس ملک کے لیے جنگ کے دوران گرا تھا۔ ڈنمارک کے لوگ پڑھے لکھے، سمجھدار ہیں پھر بھی ایسی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ اگر اللہ میاں کو جھنڈا ہی گرانا تھا تو وہ پاکستان کے لیے گراتے لیکن یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اُس وقت پاکستان موجود نہیں تھا اس لیے اللہ سے شکوہ جائز نہیں۔ ڈنمارک فلاحی ریاست ہے، عوام کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا ہے، اتنا کہ ہم قیام کے دوران کسی کو مدد مانگتے دیکھنے کو ترس گئے۔ پردیس میں جاتے ہیں، قدم قدم پر دُعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں جہاں جاؤ، سڑکوں پر دُعائیں ڈھیروں ملتی ہیں۔ اگر چند سکے دے دو تو بادشاہ بننے اور بغیر شادی اولاد کی خبر سن لیں۔ ڈنمارک میں فقیر نہیں، حکومت بہانے بہانے لوگوں کو وظیفہ دیتی ہے۔ وہ بھی اتنا کہ ٹھاٹھ سے رہا جا سکتا ہے۔ یہ ماہانہ ہوتا ہے، بعض جلدی خرچ کر کے پھر دفتر پہنچ جاتے ہیں اس لیے ہفتہ وار بلکہ بعض کو روزانہ رقم ملتی ہے۔

ہر بچہ کے پیدا ہونے پر ایک خاص رقم ملتی ہے۔ گھر کے حالات خوش حال نہ ہوں، دو چار بچے پیدا کرلو۔ کیش کے ساتھ عیش کرو بلکہ بعض حضرات یہ کام کر رہے ہیں۔ تعلیم مفت، اوپر سے اچھی خاصی ماہوار رقم بھی ملتی ہے۔ ساری عمر طالب علم رہو، کون روکے گا؟

مزدوروں کو تنخواہ ہر ہفتے اور باقی کو ماہانہ ملتی ہے۔ ملک مہنگا ہے، اکثر لوگوں کو مہینے کے آخر میں مشکل ہوتی ہے۔ حکومت کے وزیروں کو بھی جو تنخواہ ملتی ہے، اس میں گزر بسر میں پریشانی ہوتی ہے۔ بٹ بتانے لگے۔ ”مہینے کے آخری دنوں میں بعض وزیر کپڑے لینے اور ادائیگی کرنے آتے ہیں تو درخواست کرتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ سے زیادہ رقم لے کر کپڑوں کی دھلائی کاٹ کر باقی انہیں دے دیں۔ نہ جانے ان لوگوں کو علم ہے یا نہیں کہ برصغیر میں جس کا نام وزیر ہوتا ہے، وہ بھی اِدھر اُدھر ہاتھ مار لیتا ہے۔ اصلی وزیر اپنے دورِ اقتدار میں کروڑوں کے صرف بینک سے قرضے لے کر ڈکار تک نہیں مارتے۔ دنیا میں دولت وہ چیز ہے جسے کھا کر کوئی ڈکار تک نہیں لیتا۔

معاشرہ مادر پدر آزاد ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ

بعض کو علم نہیں ہوتا ان کا باپ کون ہے؟ کچھ ماں سے واقف نہیں ہوتے۔ جو انہیں پہچانتے ہیں، انجان بن کر آزاد رہتے ہیں۔

ہم سے جب کسی ڈینش کا واسطہ ہوا، اسے بااخلاق اور ملنسار پایا۔ وہ ہمارے بارے میں بھی یہی خیالات رکھتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہوں پھر بھی کیا برا ہے، وہ بھی خوش، ہم بھی......

زندہ گھر

اے ڈی بٹ پُرخلوص انسان ہیں، کوئی بات بھولتے نہیں۔ ہم سے اصرار کر رہے تھے، اُن کے گھر منتقل ہو جائیں، مہمان نوازی انہیں بھی کرنے دیں۔ ہم جھوٹے وعدے کر رہے تھے۔ ترغیب کے گھر بڑا لطف آتا۔ یہ کوپن ہیگن کا ادبی مرکز ہے، شہر میں کوئی آئے اور اُن سے ملاقات نہ ہو، یہ ممکن نہیں۔

رات کے 12 بجے ہیں، کسی کا فون آیا، اصرار ہو رہا ہے۔ ”آجائیے۔“ دوسری طرف والا ذرا سا تکلف کرتا پھر آجاتا۔ جی چاہا، کچھ کھالیا ورنہ چائے کافی تو ضروری ہے پھر باتوں کا سلسلہ، ادیب، شاعر، گلوکار سب رابطے میں ہیں۔ ایک گلوکار جرمنی سے فون کر رہا ہے، دوسرا لندن سے بات کر رہا ہے، اپنی نئی دھن سنا رہا ہے، یہ سر دھن رہے ہیں۔

ترغیب کی بیٹی تعریف واقعی تعریف کے قابل ہے، دو بیٹے اسد اور یزدان پڑھتے ہیں اور پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرتے ہیں۔ ماں کا کہنا اور باپ کی بات سنتے ہیں۔ گھر میں اکثر ڈینش بولتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تسنیم بھی ڈینش جانتی ہیں۔

ترغیب کا ہاتھ اور تسنیم کا دل کھلا ہے، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں، ہر طرح کے پھل، رس، بسکٹ، ڈبل روٹی، ہماری فرمائش پر آم آتے ہیں۔ بغیر بیجوں والا تربوز، انگور اور موسمی بھی آتی۔ ہمارا پسندیدہ پھل آڑو ڈھیروں لائے جاتے۔

ہم نے ترغیب کو سوتے نہیں دیکھا۔ رات کو جب بھی آنکھ کھلی، انہیں فون پر یورپ، پاکستان بات کرتے، اکثر شعر کہتے دیکھا۔ جب دل چاہتا، آواز دے لیتے۔

”عباسی بھائی! سو تو نہیں رہے؟“

ہمارا جواب پا کر، دروازہ کھول کر کمرے میں آتے۔ ”ایک شعر موزوں ہوا ہے، سنیے۔“

ہم اُن کی شعر گوئی کے گواہ ہیں۔ کبھی شعر نہ کہہ رہے ہوں تو دیکھا، جاء نماز پر کھڑے ہیں۔ پڑھتے لکھتے، گفتگو کرتے، ٹیلی وژن کے سامنے، ایسے گھر ہمیں پسند ہیں۔ زندہ، چلتے پھرتے، جاگتے، ہنستے بولتے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ ہمارے کوپن ہیگن آنے سے پہلے ترغیب نے سونے کا کوٹا پورا کرلیا ہے۔ اُن کے دادا، والد اور خاندان کے کئی لوگ شاعر ہیں۔ صاحبِ دیوان اور اُردو شاعری کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اس پر ترغیب نے کبھی کوئی لن ترانی نہیں کی، بس کہتے۔

”بھائی! میں تو تک بند ہوں......“

کاش، ہم بھی ہوتے۔

وہ ضد کرتے۔ ”بھائی......! شاعری کریں۔“

ہم سمجھاتے۔ ”پھول...... پینے...... کی ’چاند چھونے کی عمر جا چکی۔ اب جو کر رہے ہیں، اسی میں کامیابی حاصل ہو تو کارنامہ سمجھیں۔“

ایک دن کسی بات پر ہم نے کہا۔ ”ذرا موسم بدل جائے، میں جب آکر ملوں گا۔“

ترغیب تڑپ گئے۔ ”بھائی......! مصرع ہوگیا۔ دوسرا کہیں......“

نہ جانے کیا ہوا، ہم نے چند مصرعے بنائے۔ وہ واہ واہ کر کے ہمیں داد دینے لگے۔ خدا نے خیر کی۔ ہم نے اسی وقت توبہ کی۔ اُردو میں کیسے اچھے اچھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

شاعر ہیں' انہی کو پڑھ کر لطف لیں گے۔ شاعری کی ہے نہ کریں گے۔

ترغیب کا بیٹا یزدان کینیڈا سے پڑھ کر آیا اور اب کوپن ہیگن میں طالب علم ہے۔ کبھی کمرے میں آتا تو سنجیدہ باتیں کرتا۔ اُس کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہے۔ ایک بار کہنے لگا۔

''ہم اللہ کا نام لیتے ہیں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں جس کا مطلب ہے۔ ''شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔'' پھر انسان کو کیا ڈر۔ اس کا خالق' مالک رحم کرنے والا رحیم ہے۔''

ہمیں اُس کی بات پسند آئی۔ نوجوانی میں وہ گہری باتیں کرتا ہے۔

ترغیب نے ایک دن کہا۔ ''بھائی! اُردو بولنے والوں کو ''اردش'' کا نام دینا چاہیے۔ میں نے رئیس امروہوی کو بھی خط لکھا تھا۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ کی بات معقول ہے لیکن کون مانے گا؟''

ایک صبح بٹ آئے تو ہمارے کپڑے اٹیچی میں ڈالے اور اپارٹمنٹ سے نیچے اتر گئے۔ اس کا مطلب تھا' ہمارا قیام وطعام ترغیب کے گھر ختم ہوا۔ تسنیم سے اجازت لی۔ ترغیب نیچے چھوڑنے آئے۔ ہم نے کہا۔ ''آپ بٹ کے گھر روز آئیں گے ورنہ فون کریں گے۔'' جس دن ایسا نہ ہوا' کوپن ہیگن سے چلے جائیں گے۔ انہوں نے ہنس کر وعدہ کیا' نبھایا بھی۔

اے ڈی بٹ کا گھر ایک خوبصورت کالونی میں ہے جو سبز درختوں اور پھولوں سے ڈھکی ہے' حسین مکانات' صاف ستھری سڑکیں۔

گاڑی دروازے سے داخل ہوئی۔ سیدھے ہاتھ پر ایک سبز لان' اس میں گلاب کے اتنے پھول' ہر طرف رنگ ہی رنگ پھیل رہے تھے۔ اُن میں شوخ سُرخ' گلابی' سفید اور نیلے پھول' یوں محسوس ہوا' لاہور کے پھولوں کے باغ میں آ گئے۔ سامنے ایک پورچ ہے جس کا دروازہ ریموٹ سے کھلتا ہے۔ یہاں ایک طرف منرل واٹر کی بوتلوں اور ٹشوز رول کا ڈھیر ہے۔ ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا ہے۔ ادھر داخل ہوں تو راہ دری جس کے الٹے ہاتھ پر گتے کے ڈبے قطار سے رکھے ہیں' ان میں موسم کا ہر پھل تربوز' خربوزہ' ناشپاتی' آم سے ککڑیاں تک رکھی تھیں۔ بٹ کو کھانے پینے کا شوق ہے اور کھلانے کا بھی۔

راہ دری کے بعد ایک کمرہ' اس کے برابر باورچی خانہ جس میں دو دروازے کھلتے ہیں' ایک ڈائننگ ہال میں دوسرا پتلی راہ دری میں جس میں تین بیڈروم' اس کے برابر باتھ روم پھر ایک راستہ جو بڑے دروازے کو جاتا ہے' یہ گھر میں داخل ہونے کا دروازہ الیکٹرونک چابی سے کھلتا ہے' دروازے کے برابر ایک باتھ روم اور ہے' ڈرائنگ روم سے ملا ایک بیڈروم ہے' باورچی خانے کے دروازے کے آگے زینہ اوپر اور دوسرا نیچے جاتا ہے۔ یہاں بھی بیڈروم' ڈرائنگ روم اور باتھ روم ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز نیچے ایک فریزر بھی ہے جس میں انواع واقسام کی اشیاء رکھی جاتی ہیں۔

ڈرائنگ روم کشادہ ہے۔ خوبصورت فرنیچر' شیشے کے حسین پھولوں' پھلوں اور پتوں سے ہے۔ روشنی کا بڑا اچھا انتظام ہے۔

جو کمرہ ہمیں دیا گیا' پورے کمرے کی چوڑائی میں شیشے کی کھڑکی تھی جس سے مکان کی پچھلی طرف کا باغ نظر آتا' پھول دکھائی دیتے' اس کا دروازہ باورچی خانے سے بھی تھا۔ یہاں بھی ڈھیروں گلاب مسکرا رہے تھے۔ باغ کے درمیان پھولوں کے تختے تھے۔ دائیں طرف ایک پودے میں

ڈھیروں بلیک بیریز لگی تھیں۔ اس کے ساتھ آلوچے کا درخت تھا۔ ہم پہنچے تو شاخ در شاخ زرد آلوچے لدے تھے۔ درخت کا آدھا حصہ دوسرے گھر میں جا رہا تھا۔ زمین پر بھی ڈھیروں گرے تھے۔ یہ رات کو شاخوں سے اس لیے جدا ہو گئے تھے کہ پک گئے تھے۔

ہم نے ایک جھکی ہوئی شاخ سے زرد آلوچہ توڑ کر کھایا تھا۔ عجیب ذائقہ تھا۔ خوبانی پلم کا مزہ۔

بٹ نے بتایا' اسے کراس کیا گیا ہے جب ہی کئی پھلوں کا لُطف دے رہا ہے۔ بائیں طرف ایک چھوٹا پودا سرخ پلم سے بھرا کھڑا ہے۔ ایک طرف سیب کا درخت جس کی شاخیں پھلوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ باورچی خانے سے جو دروازہ باغ میں کھلتا ہے' اس کے آگے سفید سیمنٹ کا فرش' اس پر سفید چھ گارڈن کرسیاں اور سفید میز رکھی تھی۔ اس حصے کے اوپر شیشے کی چھت تھی۔ اس کے برابر ایک حوض تھی۔ ہمیں یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ قدرت زمین پودوں' پتوں' گھاس اور پھولوں سے سجاتی ہے۔ یورپ والے اس کا بھرپور لطف اٹھاتے ہیں۔ موسم بھی مدد کرتے ہیں۔ اُن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔

پہلی صبح ہماری آنکھ ایک خوبصورت آواز سے کھلی۔ کھڑکی سے دیکھا تو سُرخ پروں اور نیلے سُروں والا پرندہ آلوچے کی شاخ پر بیٹھا بول رہا ہے۔ دل میں ایک انجانی خوشی جاگ اُٹھی۔ یہ اللہ کا کیسا کرم ہے۔ اس نے رنگوں کو آواز دی' ہوا میں اڑایا۔ ہم دیکھ کر اس کی قدرت کی تعریف کریں۔ بے شک میرا رب حسین ہے اور حُسن پسند کرتا ہے۔

مفت سہولت

عطاء الحق قاسمی شاعر' کالم نگار' بستی بستی گھومتے امریکا اکثر آتے ہیں۔ ایک دن ''اُردو ٹائمز'' نیوز کے ایڈیٹر خلیل الرحمان کا فون آیا۔

''عطاء الحق قاسمی پاکستان جا رہے ہیں۔ ہوائی اڈے آ جائیے' گپ لڑائیں گے' کافی پئیں گے۔''

ہم کسی کو الوداع نہیں کہتے' افسوس ہوتا ہے جانے والا لوٹ کر آئے نہ آئے' کیوں جدا کریں۔ عطاء الحق قاسمی کے بارے میں یقین تھا' دو چار ماہ بعد لوٹ آئیں گے اس لیے مسرور جاوید کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچے تو دیکھا' عطاء الحق قاسمی کاؤنٹر سے بورڈنگ کارڈ لے رہے ہیں پھر اچانک وہیل چیئر میں بیٹھ گئے۔ ہم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''خیریت' آپ ماشاء اللہ' بھلے چنگے ہیں۔''

وہ ہنس کر بولے۔ ''یہ ایک سہولت ہے' مل سکتی ہے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

اُس دن احساس ہوا' اگر کوئی سہولت مفت مل سکتی ہے تو استعمال میں کیا مضائقہ' سنا ہے' مفت کی ملا کو بھی جائز ہوتی ہے۔ ملا سے مراد' ملا دو پیازہ ہے۔ دوسرے دل پر نہ لیں۔ مفت سہولت کا فائدہ کوپن ہیگن میں لوٹا۔

نیشنل میوزیم کی شہرت سنی تھی۔ ڈینش کلچرل ہسٹری کا مرکز سب سے پرانا' بڑا' قابل دید' خاص طور سے ہندوستانی حصہ۔ سیاحوں کو دیکھنا ضروری ہے۔ یہ سنا تو ایک صبح حملہ کر دیا۔ بٹ نے ٹکٹ خریدے۔ کاؤنٹر والی لڑکی نے اوپر جانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔

بٹ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ہم نے روکا۔ لفٹ کی سہولت ہے' فائدہ اٹھائیں۔ لڑکی نے انگلی راہ دکھانے کے لیے کم اونچی کی تھی اس لیے پہلی منزل پر جا اترے۔ دوسری پر جانا تھا پھر لفٹ استعمال کی۔ جہاں جہاں معلومات کے کاؤنٹر تھے وہاں کچھ نہ کچھ پوچھا۔ یہ سہولت مفت تھی۔ جو پمفلٹ اور کتابچے رکھے تھے' اٹھا لیے یہاں تک کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈینش بھی لے لیے۔ مفت تھے۔ بٹ کو حیرت ہوئی۔ ہم نے کہا۔ ''اگر کبھی ڈینش زبان سیکھ لی تو پڑھ لیں گے۔'' جہاں لکھا تھا۔ ''اس ڈبے میں کوڑا ڈالیے۔'' جیب سے کوئی بے کار کاغذ ڈالا۔ ایک جگہ پانی کا نل لگا تھا مفت' منہ لگا کر پیا۔ باتھ روم کی سہولت بغیر کراؤن خرچ کیے میسر تھی' استعمال کی۔ کاری ڈور' کمروں' ہال' نوادرات کی الماریوں کے پاس جو خواتین نظر آئیں' انہیں توجہ سے دیکھا۔ ذرا دیر میں مفت سہولت کی ایسی عادت ہوئی کہ نوادرات کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں ہاتھ لگایا۔

نیشنل میوزیم میں بدھ کے دن داخلہ مفت ہے۔ ہم اتوار کو گئے تھے۔ مفت کی سہولت سے محروم رہے۔ دل کو تسلی دی۔ ہم بدھ کو آتے تو بورڈ لگا ہوتا۔ ''اتوار داخلہ مفت'' ہمارے ساتھ ایسا اکثر ہوا ہے۔ قاہرہ میں مصری ہوائی سروس کے ڈنر پر گئے تو ذرا دیر پہلے رقاصائیں تھک کر پچھلی گلی سے جا چکی تھیں۔ کوالالمپور میں ایک رات ہوٹل میں مفت قیام کی سہولت ہمارے پہنچتے ہی موقوف کردی تھی۔ ایڈنبرا میں سینڈک ہوٹل والوں کو معلوم ہوا' ہم دو رات کے مہمان ہیں۔ دو دن ٹھہرنے والے کو تیسرے دن مفت قیام کا پمفلٹ جاری کردیا۔ دورانِ سفر اپنی آمدورفت پوشیدہ رکھتے ہیں پھر بھی مقامی انتظامیہ پتا لگا کر مفت رعایت سہولت اور راحت اِدھر اُدھر کردیتے ہیں۔ ہم نے بھی اب شکوہ کرنا بند کردیا ہے' کچھ خودداری بھی ہوتی ہے۔

نیشنل میوزیم والوں کا دعویٰ ہے' یہ 10 ہزار سال کی ثقافتی تاریخ کا مرکز ہے۔ جب وہ ٹیبڈیر سے برف پر شکار کھیلتے تھے' اُس دور سے آج تک کی تاریخ محفوظ کی گئی ہے۔ جس عمارت میں یہ میوزیم ہے' وہ تین سو سال پہلے شہزادے فیڈرک پنجم کا محل تھا۔ دو سال سے زیادہ ہوئے' یہ سیاحوں کے لیے عجائب گھر بنا ہوا ہے۔ سو سال بعد کوپن ہیگن دوبارہ جانا ہوا تو ایک دو اور شاہی محل عجائب گھر میں تبدیل ہو چکے ہوں گے۔ عوام بیدار ہوتی جائے گی تو بادشاہ اور ان کے قلعے' محل دِیدۂ عبرت بنتے جائیں گے۔ اسی خوف سے ہم نے کبھی بادشاہ بننے کا نہیں سوچا۔ میوزیم میں ڈنمارک کے علاوہ دوسرے ملکوں کے نوادرات بھی ملتے ہیں۔ شاہی خزانے کے سکے بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ سیاحوں کو دوسرے ملکوں کا سامان بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ بچوں کی تفریح کا بھی معقول انتظام ہے۔ کھلونے' رنگ برنگی اشیاء اور بحری قزاقوں کے جہاز کی سواری موجود ہے۔

نیشنل میوزیم میں ہندوستانی حصے کی تلاش تھی جہاں کئی حیرت انگیز نوادرات کا شہرہ تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ایک زمانے میں ہندوستان اور ڈنمارک کے گہرے مراسم تھے۔ ہندوستان کے علاقے تامل ناڈو میں ڈینش گورنر راج کرتے تھے۔ اُن دنوں ڈنمارک کے شاہ کرسچین چہارم اور ہندوستان کے مہاراجہ رگھورام کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جو پان کی شکل کے ایک سونے کے پترے پر تحریر تھا۔ یہ ڈینش اور تامل زبانوں میں تھا۔ دروغ برگردنِ راوی' مہاراجہ کو ڈینش بادشاہ پر اعتبار نہیں تھا۔ جانے ڈینش میں کیا لکھ دیں اس لیے اپنی زبان بھی شامل کی۔ اس میں تحریر تھا۔ ''ہندوستان اور ڈنمارک کے باشندے کسی روک ٹوک کے بغیر ایک دوسرے کے ملک سفر کرسکتے ہیں۔'' ہم اس معاہدے کی تلاش میں تھے تاکہ تامل حضرات کو اطلاع دے سکیں' وہ ڈنمارک دوڑ جائیں۔ خیال یہ بھی تھا' مغلوں نے ہزاروں سال ہندوستان پر حکومت کی ہے' کچھ اُن کی باقیات بھی شاید دیکھنے کو مل جائیں۔

کوری ڈور میں بٹ نے ایک محافظ خاتون سے

ہندوستانی شعبے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے ڈینش میں کچھ سمجھایا اور ایک سمت اشارہ کیا۔ اس میوزیم میں یہ دوسرا اشارہ تھا۔ نہ جانے یہ خواتین اشاروں سے کیوں سمجھانا چاہتی ہیں؟ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے' ہم ڈینش زبان سے ناآشنا۔ بٹ سے گفتگو اور ہمیں اشارہ کرتی تھیں۔

ذرا دور چلے۔ سامنے ایک اسمارٹ باوردی خاتون نظر آئیں۔ ہم نے بٹ سے کہا۔

''ان سے راستہ پوچھیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ کہنے لگے۔

ہم مچل گئے۔ ایک سہولت ہے' دام درہم خرچ نہیں ہوتے' اس سے فائدہ اٹھائیں۔ فارسی کا ایک شعر ہے جس کا مطلب ہے۔

''تم نے شراب دی' آنکھوں سے دیکھا' جام ہاتھ میں لیا' جسم نے چھوا' منہ کے نزدیک کیا' ناک نے سونگھا' لبوں سے لگایا' زبان نے لطف لیا' صرف کان محروم رہ گئے۔ خدارا' آواز سے بتاؤ۔'' یہ شراب ہے...... ''میوزیم میں محسوس کر رہے تھے' دیکھ رہے تھے' سننا بھی چاہتے تھے' چاہے وہ ڈینش ہی کیوں نہ ہو۔

بٹ نے مہمان نوازی کی رسم نبھاتے ہوئے خاتون سے پوچھا۔ خاتون نے مسکرا کر ڈینش میں جواب دیا۔ اس موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے۔

اوروں سے سنا تم نے' اوروں سے کہا تم نے
کچھ ہم سے سنا ہوتا' کچھ ہم سے کہا ہوتا

ایک لمبے کاری ڈور میں چل دیئے۔ کئی جگہ نقشے اور ہدایات لکھی تھیں۔ ہم رک جاتے۔ یہ ڈینش میں تحریر تھیں' بعض کو انگریزی سے نوازا گیا تھا۔ اُن سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا لیکن دیکھنے آئے ہیں تو یہ کیوں محروم رہیں۔

شوکت تھانوی اُردو کے ممتاز مزاح نگار ایک افسانے میں لکھتے ہیں۔ ''بیگم' آج پیک اگلتے اگلتے بے حال ہوگیا۔''

بیگم نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''بھئی' جس عمارت میں گئے' وہاں جگہ جگہ لکھا تھا' برائے کرم یہاں تھوکیے۔ اب اتنے بداخلاق نہیں کہ کسی کی درخواست مسترد کردیں۔''

ہم ہر ہدایت کاؤنٹر اور میوزیم کے محافظ کے پاس رکتے' آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ایک دروازہ آ گیا۔ یہ شیشے کا بنا تھا۔ دھکا دے کر کھولا تو راہ دری پھر کمرہ آ گیا۔ یہ ہندوستانی ثقافت اور تہذیب کا حصہ تھا۔ ایک ڈولی رکھی تھی' وہی جس میں دلہن کو الوداع کہا جاتا ہے اور سکھیاں' سہیلیاں ''چھوڑ بابل کا گھر'' گاتی ہیں۔ ہندوستان والوں نے دلہن رکھ لی۔ خالی ڈولی ڈنمارک بھجوادی۔ خیر' اس کی کیا شکایت' یہاں دلہن کی کیا کمی۔ یورپ کی سسرال ہے' وہ ساری پری چہرہ شہزادیاں لے گئے۔ اب بھی بازار' گلی کوچے بھرے ہیں' بس ہمتِ مرداں۔ وہاں جانے کے لیے ویزا اور ڈھیروں کراون کی ضرورت ہے۔ اگلی الماری میں چاندی کے زیورات پرانے انداز کے۔ ان کے درمیان بھگوان براجمان تھے' ان کی حفاظت کے لیے' ہوسکتا ہے' یاد کرانے کے لیے زیورات کی لالچ نہ کرو ورنہ مکتی نہیں دیں گے۔

ذرا فاصلے پر گوتم بدھ بیٹھے تھے۔ ہندوستان نے تو انہیں اپنایا نہیں۔ بدھ مت باہر زیادہ مقبول ہوا۔ آج چین تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جگہ گوتم بدھ اچھے لگے۔ ان کا دیدار مشرق بعید کے بہت سے ملکوں میں ہوا تھا۔ بنکاک میں نرملا تو بہت ہی اچھی لگی تھی۔ وہ بدھ تھیں۔ ان سے بدھ کے دن نہیں' ہر روز ملتے تھے۔ ایک جگہ مختلف لباس اور برتن بھی رکھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ گھر گرہستی کا سارا سامان موجود تھا۔ دلہن نہیں تھی۔ عجائب گھروں میں یہی پریشانی ہوتی ہے۔ ہم برطانیہ میں چرچل کا گھر دیکھنے گئے' وہاں سب کچھ تھا۔ ایک الماری میں کپڑے ٹنگے تھے۔ اوپر ہیٹ رکھا تھا۔ نیچے جوتے' برابر میں چھڑی' بس چرچل نہیں تھے۔ آپس کی بات ہے' اگر ہوتے تو ہم یوں بے دھڑک ان کے گھر نہ جاتے۔ یہ الگ بات ہے' ہم جاتے کیوں؟ دیکھنا تھا تو کسی چشم و لب اور سروخوش ادا کے نزدیک جاتے۔

موسیقی کے ساز بھی تھے۔ سارنگی کتنے دنوں بعد دیکھی۔ ایک ستار بھی رکھا تھا۔ ہندوستان کی ایک زبان موسیقی بھی ہے۔ ہندو مذہب' رنگ' رقص اور موسیقی کا مرکب ہے۔ ایک الماری میں صراحیاں' چائے کے پیالے' پانی کے برتن نظر آئے۔

ہندوستانی حصے میں بدھ کے علاوہ مسلمانوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ خوبصورت قالین' شوخ رنگوں کے پھول الماریوں میں رکھے۔ تخت پر بچھے' مسلمانوں کا لباس' کرتہ' پگڑی' کشیدہ کاری کے نمونے' ہاتھی دانت کی اشیاء ایک جگہ۔ ہندوستان کے مرد' عورتوں' بچوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے' مختلف علاقوں کے لباس میں نہ جانے کب سے کھڑے سیاحوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی دیکھا ہوگا' بول نہیں سکتے جیسے ہندوستان کے غریب عوام زبان نہیں کھول سکتے۔

جو کچھ ڈنمارک والوں کے ہاتھ لگا' لا رکھا۔ دیکھو اور لطف اٹھاؤ۔ ہندوستان کی ثقافت' تہذیب' مذہب' رہن سہن ایک جگہ کر دیا۔

ہم نے ہر الماری' شوکیس کو غور سے دیکھا' افسوس' سونے کا وہ پترا نظر نہیں آیا جس پر ہندوستان اور ڈنمارک کا معاہدہ تحریر تھا۔ اس بہانے کئی نگران اور محافظوں سے پوچھا بھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا حالاں کہ ہم سیدھی سیدھی انگریزی بول رہے تھے۔ عربی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ معاہدہ یقیناً ہٹا دیا گیا ہے۔ کسی تہہ خانے میں رکھا ہوگا جس طرح شاہِ وقت اپنے دشمنوں کو تہہ خانوں میں رکھ لیتے تھے۔ یہ کارروائی امیگریشن قوانین کے تحت ہو سکتی ہے' تامل لوگوں سے خطرہ ہوگا۔ ایسا نہ ہو تو وہ اس تعداد میں آجائیں کہ بچہ بچہ تامل بولتا سنائی دے پھر ہم کوپن ہیگن نہیں' ہندوستان ہی جاتے۔

ہندوستانی شعبے سے دوسری سمت آئے۔ ایک کمرے میں دس بارہ کرسیاں رکھی تھیں۔ یہ سہولت مفت تھی۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک کرسی پر بیٹھے' ہتھے پر بازو رکھ لیا۔ جانے کیا ہوا' سامنے اسکرین روشن ہوگیا۔ فلم نظر آنے لگی۔ بٹ نے ہماری طرف دیکھا' ہم نے انہیں گھورا' غلطی دونوں کی نہیں تھی' یہ خود بخود ہوگیا۔ ہندوستان' تھائی لینڈ کے مناظر سامنے آنے لگے۔ ایک شادی کا منڈپ' رسمیں' اس کے بعد ایک رقاصہ آئی تو ظالموں نے فلم کے بجائے سلائیڈ دکھانے شروع کردیئے۔ ہم انتظار کرنے لگے' شاید اسکرین پر لکھا آئے۔ ''اصلی رقص بدھ کے دن۔'' یہ پسند نہیں آیا۔ کرسی سے اٹھے تو اسکرین کی روشنی جاتی رہی۔ فلم کے دوران اندھیرے میں برابر ایک خاتون آ بیٹھی تھیں۔ وہ کسی انجانی زبان میں کچھ کہنے لگیں۔ شاید ہمارے اٹھنے سے فلم بند ہونے پر برا جمان رہی ہوں۔ ہندوستانی حصے سے متاثر ہو کر جانا تو تھا ہی۔

کاری ڈور میں آئے تو باہر پھوار گرنے لگی تھی۔

(یہ دلچسپ سفر نامہ ابھی جاری ہے
بقیہ آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔)

......☆☆......

صائمہ سحر

یہ ہے زندگی میری

حامد علی سید کا خیال

زبان رکھتے ہیں پتھر بھی، چٹانیں بولتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

سچی کہانیاں کی نئی لکھاری کی دلچسپ رودادِ زندگی

میرا نام صائمہ سحر ہے' دو بھائی اور پھر دو بہنوں میں میرا نمبر پہلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کی لاڈلی ہوں۔ میرا بچپن بھی اور بچوں کی طرح کھیلتے اور مستی کرتے ہی گزرا۔ مجھے جب اسکول میں داخل کرایا گیا تو میں بہت خوشی خوشی اپنی کلاس میں گئی اور پہلے ہی دن A,B, لکھنا سیکھا اور گھر آکر گھر کی دیواروں پر بھی لکھنا شروع کردیا۔ مجھے شروع سے ہی لکھنے پڑھنے میں بہت دلچسپی رہی ہے' یہی وجہ ہے کہ میں پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹس میں سے تھی۔

میں ہمیشہ سے ہی بہت ہنس مکھ ہوں اور دوسروں کو ہنسانے میں مجھے بہت مزا آتا ہے۔ بچپن بہت اچھا ہوتا ہے ناں!...... نا کوئی غم نا دکھ' کچھ سمجھ میں جو نہیں آتا' بس خوشیاں ہی خوشیاں' ارے ہاں! بچپن میں میرے ساتھ ایک بڑا مسئلہ تھا' وہ یہ کہ اگر کوئی مجھے مارتا تو میں گھر میں آکر نہیں بتاتی تھی کیونکہ میری مما مجھے ہی ڈانٹ دیتی تھیں کہ تمہاری ہی کوئی غلطی ہوگی لیکن سچی بات تو یہ ہے' نہ میں بچپن میں کسی سے لڑتی تھی نا ہی اب لڑائی پسند ہے لیکن اب بڑے ہو کر جب میں ہر کسی کو لڑتے جھگڑتے دیکھتی ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ...... یہ انسان ہمیشہ محبت کے ساتھ مل کر خوشی خوشی ساتھ کیوں نہیں رہتا!...... کیا زمانہ ہے کہ میں نے خون کے رشتوں کو جائیداد کے لیے دشمنی میں بدلتے دیکھا ہے۔ اللہ رحم کرے! اور کرم کرے کہ...... ہر انسان' انسان دوست بن جائے!!

میرے والد کا تعلق پشاور کی ایک پٹھان فیملی سے ہے اور میرے والد کے تمام رشتے دار پشاور میں ہی رہائش پذیر ہیں اس لیے ہم سال میں ایک بار وہاں اپنی دادی (بے بے) سے ملنے ضرور جاتے ہیں۔ میں رشتوں کے معاملے میں بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوش نصیب ہوں کہ ہر طرف‘ ہر جگہ سے مجھے محبت ہی ملی ہے اور مل رہی ہے‘ سب مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے پاس رشتے اور محبتیں ہیں جنہوں نے مجھے جینے کا انداز سکھایا اور سمجھایا ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تھی تو میری پسندیدہ بیسٹ ٹیچر اور اسکول کی وائس پرنسپل مس مہرافروز نے مجھے زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں جو سمجھایا‘ مجھ پر اُن کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے زندگی اور لوگوں کو سمجھنے کا گر سکھایا۔ اسکول میں میری تین کلاس فیلوز دوست روزی‘ فرحین‘ نازیہ اور میرا ایک گروپ تھا اور میں گروپ لیڈر تھی۔ ہمارے گروپ نے کسی کو بھی کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا‘ ہمارا گروپ خصوصاً میں بہت شرارتیں کرتی تھی مگر کبھی کوئی ایسی بات یا شرارت نہیں کی جو دوسرے کے لیے پریشانی یا دکھ کا باعث بنے!

اسکول کا سنہرا دور ختم ہوا تو کالج کا دور شروع ہوا مگر مجھے کالج کبھی اچھا نہیں لگا‘ شاید اسی لیے میں اکثر کالج نہیں جاتی تھی اور شام کے اوقات میں کوچنگ سینٹر جوائن کرلیا تھا۔ وہاں مجھے اور بھی بہترین دوستوں نیلم‘ طیبہ‘ ثمرین‘ سدرہ‘ عروج وغیرہ کا ساتھ ملا‘ یہ ساتھ انٹرکلیئر کرنے کے بعد بھی اَب تک قائم ہے۔

مجھ میں جہاں بہت سی اچھائیاں ہیں‘ وہاں بہت ساری خرابیاں بھی ہیں جن میں سرِفہرست میرا غصہ ہے‘ مجھے غصہ بہت زیادہ آتا ہے اور بہت جلدی بھی لیکن جب گئے دنوں کوچنگ کے دوران میں سر وسیم احمد خان نے یہ سمجھایا کہ بیٹا! غصہ مت کیا کرو اور غصے کے بارے میں اسلامی باتیں بتائیں اور سمجھائی بھی تھیں تو اُس کے بعد اَب میرا غصہ قدرے کم ہوگیا ہے!!

سچی بات تو یہ ہے کہ...... میری زندگی بنانے میں میری مما کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے کیونکہ میرے ابا کے خاندان والے تعلیم کے حامی نہ تھے‘ خصوصاً میرے چچا وغیرہ اس بات کے مخالف تھے کہ خاندان میں تعلیم وغیرہ کا کوئی سلسلہ ہو اور خصوصاً لڑکیوں کو تعلیم دلوائی جائے...... مگر میری مما اُن کے مقابلے میں ڈٹ گئی تھیں کہ میری بیٹیاں ضرور پڑھیں گی......

”شکریہ مما! کہ آج ہم بہنیں جو کچھ بھی ہیں‘ آپ کی وجہ سے ہیں۔“

جب میں نے رسائل وغیرہ میں لکھنا شروع کیا تو میری مما نے ہی میری سپورٹ کی اور کہا کہ لکھوں! پھر میں نے ایک کہانی ”سچی کہانیاں“ میں بھیج دی اور اُس کے چھپنے کا انتظار کرتی رہی مگر کہانی کا کچھ پتا نہیں چلا اور سچ کہوں تو دو ڈھائی ماہ میں‘ میں یہ بھول بھی گئی تھی کہ...... میں نے کہانی کے نام پر کچھ لکھا بھی تھا۔

اُس دن میری Birthday تھی کہ شام کے وقت ڈاکیا آیا تھا اور پھر گیٹ پر جانے والے بھائی نے آکر مجھے بتایا تھا کہ تمہارے نام پر ڈاک آئی ہے۔

میں حیران و پریشان تھی کہ مجھے کس نے کیا بھیجا ہے؟ مگر جب وہ خاکی لفافہ دیکھا اور کھولا تو اتنی زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ بتا نہیں سکتی! میرے سامنے ادارہ ”سچی کہانیاں“ سے بھیجا گیا وہ شمارہ موجود تھا جس میں میری پہلی کہانی موجود تھی‘ بس پھر تو لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا جو اب تک جاری ہے اور انشاء اللہ‘ جاری رہے گا۔

”سچی کہانیاں“ میں جب بھی میری کہانی یا پھر کوئی تحریر لگتی ہے‘ سب میری بہت تعریف کرتے ہیں جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے بلکہ سب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ صائمہ......! کچھ اور لکھا؟ اور جب میں نہیں لکھتی ہوں تو مما کہتی ہیں کہ لکھو اور پھر مما ہی میری وہ تحریر پوسٹ کرواتی ہیں۔

میں صرف ”سچی کہانیاں“ کے لیے ہی لکھتی ہوں اور ہمیشہ ”سچی کہانیاں“ اپنی پاکٹ منی سے خریدتی ہوں۔ میری وجہ سے ہی میرے گھر والے‘ میری فرینڈز‘ کزنز اور میری رضاعی بہن ماریہ بھی ”سچی کہانیاں“ پڑھنے لگے ہیں اور ”سچی کہانیاں“ کو بہت پسند بھی کرتے ہیں۔

اَب تک تو زندگی بہت اچھی گزری اور گزر رہی ہے مگر چند ماہ پہلے میری پیاری مما کو کینسر جیسا موذی مرض لاحق ہوگیا ہے‘ سو سارا گھر پریشان ہے۔ مما کا علاج جاری ہے اور ہمیں اللہ پر بہت بھروسہ ہے۔ انشاء اللہ‘ وہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ آپ تمام پڑھنے والے بھی اُن کی صحت کے لیے دُعا کریں۔

آخر میں‘ میں ناصر انکل‘ منزہ آنٹی اور ”سچی کہانیاں“ کے تمام اسٹاف کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے مجھے اِس قابل سمجھا کہ...... نا صرف میری تحریروں کو ”سچی کہانیاں“ میں جگہ دی بلکہ انہیں سنوارا بھی!...... اور اب اپنے اِس زیست نامے سے اجازت کہ...... زندگی کو تو چلتے ہی جانا ہے‘ چاہے میں چاہوں یا نا چاہوں...... تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ مجھے ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیں! اللہ حافظ!

......☆☆......

غزل

جاں سے اپنی گزر گیا ہوتا
تم نہ ملتے تو مر گیا ہوتا

ہوں سلامت تبھی تو ہوں یکجا
ٹوٹتا تو بکھر گیا ہوتا

وہ تو مقتل میں سوگ تھا ورنہ
آج اپنا بھی سر گیا ہوتا

انتہا بے رخی کی کرنے میں
کاش میں آپ پر گیا ہوتا

ناصحوں نے ذرا سی غفلت کی
ورنہ میں بھی سدھر گیا ہوتا

درد ہوں اس لیے تو اٹھتا ہوں
زخم ہوتا تو بھر گیا ہوتا

فرخ اظہار صدیقی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلسلے وار کہانی ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

ارشد علی ارشد

مکھنی

حزیں صدیقی کا خیال

جب حقیقت فسانہ بن جائے
کیا حقیقت کسی فسانے کی

خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد ایک عجوبہ لڑکی کی داستان، تیسری کڑی



خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار اوروں سے مختلف سوچ' خیالات' نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ' دو بھائیوں اظہر اور مظہر' ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام' غیر شادی شدہ پھوپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے' مکھنی اس محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے!!

محبت اور عشق کی باتیں کرتی' گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنی' سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اظہر کی دوبئی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا' مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھی کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

(اور اب آگے پڑھیے۔)

میں کچھ دیر میں ہی چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں پہنچ گئی تھی۔ یہ نام کا حجرہ ایک بہت بڑی کوٹھی کی شکل میں تھا۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے روایتی رعب و دبدبہ کے ساتھ مسہری پر براجمان تھا۔ سر پر پگڑی' سفید کلف شدہ کاٹن کا سوٹ اور پاؤں میں سفید تلے کا کھسہ' دونوں ہاتھ تکیوں پر پھیلائے ہوئے اس نے میری طرف طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ دو بندے اس کا کندھا دبا رہے تھے۔ یہ بھی چوہدریوں کی روایت میں شامل ہے ورنہ توانا اور مضبوط افراد ذرا ہاتھ کو دبا دیں تو چوہدری بلبلا اٹھے۔ کمرے میں چار پانچ گن مین باادب باملاحظہ کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہ پروٹوکول بھی روایتی رعب و دبدبہ کے لیے کیا گیا تھا ورنہ میر داد نگر میں چوہدری اللہ رکھا کی مرضی کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے مگر آج اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے' یہ خود میں بھی نہیں جانتی ہوں۔ چوہدری مجھے عیار اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انگ انگ میں فتح کا احساس ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کی فتح کا توازن بس یہیں تک تھا۔ چوہدری اللہ رکھا کی بڑی بڑی مونچھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ بوڑھے چہرے پر خباثت واضح دیکھی جا سکتی تھی۔ کوئی اس کی بیٹی کو یوں مردوں کی محفل میں لا کھڑا کرے تو چوہدری اسے کچا چبا جائے مگر مجھے اپنی محفل میں بے بس کھڑا ہوا دیکھ کر اس کی خبیث آنکھوں میں چمک گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"مکھنی' تو نے چوہدری اللہ رکھا کا ہاتھ روکا تھا' چوہدری اللہ رکھا کا اٹھا ہوا ہاتھ آج تک کسے نے (کسی نے) نہیں روکا۔ میں چاہتا تو تیرے اس خوبصورت جسم کو لی راں' لی راں (کپڑے کے ٹکڑے) کر دیتا اور تیرے جسم کے انہوے (اپنے) پالتو کتے چھوڑ دیتا مگر اس نوں پہلوں (اس سے پہلے) تجھے ناچنا ہے' میرے سامنے مجرہ کرنا ہے کیونکہ تو بہتوں سونہڑی کڑی اے۔ (بہت خوبصورت لڑکی ہے۔)"

میں نے چوہدری کو کوئی جواب نہیں دیا' میرا ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ میں یہاں سے بھاگ جانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ کمرے میں ٹوٹل سات افراد موجود تھے۔ دو چوہدری کے کندھے دبا رہے تھے دو دائیں طرف سر دو بائیں طرف کی دیواروں کے ساتھ مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ خارجی دروازہ میرے عقب میں تھا اور چوہدری کی مسہری جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا' میرے بالکل سامنے تھی۔ اچانک چوہدری نے ایک آدمی کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور چھن چھن چھن کرتا ہوا گھنگروؤں کا جتھہ میرے قدموں میں آ گرا۔

میں نے چوہدری اللہ رکھا کے چہرے کی طرف دیکھا' پتا نہیں' ایسے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ زمین پر اتنی ڈھیل کیوں دیتا ہے جنہیں ماں بہن کی تمیز نہ ہو انہیں اس دھرتی کا بوجھ زیادہ دیر تک بننے نہیں دینا چاہیے۔ چوہدری نے حقے کی نے منہ میں ڈالی' بڑ بڑ بڑ' حقے کے پانی سے ابھرنے والی آواز میری سماعت میں زہر گھول رہی تھی۔

چوہدری اللہ رکھا نے لمبا کش لے کر چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا اور سارا دھواں پھونک مار کر باہر نکال دیا۔ دھوئیں کے اٹھتے مرغولے میں چوہدری کا چہرہ مزید بھیانک ہو گیا تھا۔ چوہدری نے گھنگروؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پہن لے چھوری...... بہت دنوں سے میرے حجرے میں کوئی مجرہ نہیں ہوا' سازندے تو نہیں ہیں مگر نور جہاں کے گانے کا بندوبست کر رکھا ہے میں نے۔'' میں نے گھنگروؤں کے جتھے کو دیکھا' مجھے یوں لگا جیسے یہ چھوٹے چھوٹے گھنگرو نہیں' بے شمار بم ہیں جنہیں میں نے ہاتھ لگایا تو پھٹ جائیں گے۔

''چوہدری اللہ رکھا' تمہاری دو بیٹیاں ہیں ناں' بچپن میں تمہاری حویلی میں' میں تمہاری بیٹی ہاجرہ کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھی آئی تھی۔ جب میں آٹھ نو سال کی ہوئی تو اس پر پابندیاں لگ گئیں پھر وہ بڑی بڑی پگڑیوں اور بندوقوں کے سائے میں باہر نکلتی تھی۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایسا کرو' اسے بھی بلا لو' ہم دونوں سہیلیاں مل کر یہاں مجرہ کریں گی۔'' میری بات مکمل ہوئی تو چوہدری یوں اچھلا جیسے اس کی مسہری میں بم پھٹ گیا ہے۔ اس کی بڑی گھنی مونچھوں میں زلزلہ آ گیا تھا' چہرہ غصے سے سرخ ہو کر بھیانکی کی ساری حدیں پار کر چکا تھا۔ میں نے دیکھا' غصے کی وجہ سے اس کا وجود لرزنے لگا ہے۔

اس نے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔ ''گھنگرو اٹھا اور ناچ...... تیری اوقات میرے سامنے ناچنے کی ہے' اپنی اوقات سے باہر نہ نکل۔ جب تو نچ نچ کے تھک جائے گی اور میرے قدماں وچ (قدموں میں) گر جائے گی' تب تجھے تیری اس گستاخی کی سزا دوں گا۔ گھنگرو اٹھا ورنہ انہیں دیکھ رہی ہے' میرے ایک اشارے پر تیرے جسم کو کتوں کی طرح بھنبھوڑ کے رکھ دیں گے......'' چوہدری نے اسلحہ بردار آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ماحول کی کشیدگی کی وجہ سے اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

میں نے سوچا' رزق کمانے کے تو بہت سے ذرائع ہیں۔ انہوں نے کون سا ذریعہ اپنایا ہے؟ اپنی ماں بہن کی عزت کے رکھوالے' دوسروں کی عزت لٹتے دیکھ کر خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے جھک کر گھنگروؤں کا جتھہ ہاتھوں میں اٹھایا۔ چھن...... چھن...... گھنگروؤں کی آوازیں میرے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھ نہیں رہی تھی بلکہ نفرت سے گھور رہی تھی۔ ''میری پکار پر یہاں کوئی محمد بن قاسم نہیں آئے گا۔ آج کے سارے محمد بن قاسم اپنی اپنی ضرورتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔'' میں نے تلخی سے سوچا مگر میں مجرہ نہیں کر سکتی۔ میں عزت دار گھرانے کی باحیا لڑکی ہوں۔ میں نہ کنجری ہوں نہ طوائف...... میرے ابا نے ساری زندگی عزت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ میں ناچ کر اس کی عزت کا جنازہ نہیں نکال سکتی۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے تھے۔ کبھی کبھی قسمت ہمیں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے چند لمحے دیتی ہے'

انہی چند لمحات میں اچھا ہو جاتا ہے یا پھر بہت ہی برا مگر میں نہیں جانتی' میں نے جو فیصلہ کیا ہے' وہ اچھا ہے یا برا' میں نے پوری قوت سے بازو گھما کر گھنگروؤں کا جتھہ چوہدری کی طرف پھینک دیا جنہیں چھن چھن کی تیز آواز پیدا کرتا ہوا جتھہ سیدھا چوہدری اللہ رکھا کی لمبی ناک کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ چوہدری اللہ رکھا کی حویلی میں یہ پہلا دھماکہ تھا جس کی گونج اور تباہی بہت زیادہ تھی' یہ دھماکہ سینکڑوں گھنگروؤں نے مل کر کیا تھا۔ چوہدری کی ناک سے خون ابل پڑا تھا اور چہرے کی کچھ جلد بھی پھٹ گئی تھی۔ اس نے جھٹکا کھایا اور مسہری سے نیچے پیچھے کی طرف گر گیا۔ کسی کو بھی اس چویشن کا تصور نہیں تھا۔ چند لمحے سب کو سانپ سونگھ گیا' اجڈ دیہاتی محافظ جن کی حیثیت پالتو کتوں سے کم نہ تھی' سارے چوہدری کی طرف بھاگ پڑے۔ انہیں حملہ آور کو پکڑنے کی ٹریننگ نہیں دی گئی تھی' بس ہاتھوں میں رائفلیں تھما کر رعب جھاڑنے کے لیے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ سارے چوہدری کے گرد جمع ہوئے تو میرے لیے بھاگ جانے کو میدان خالی تھا۔ میں فوراً پلٹی اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ دروازہ پار کرتے ہوئے میرے کانوں سے چوہدری اللہ رکھا کی پھنکارتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''ارے حرام زادو' مینوں چھڈو' اس کتیا نوں پکڑو۔'' (حرام زادو' مجھے چھوڑو' اس کتیا کو پکڑو......) ساتھ ہی چوہدری نے انہیں ماں کی موٹی سی گالی دی۔ میں نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا' کمرے سے نکلتے ہی میں بائیں جانب دیوار کی جڑ میں بیٹھ گئی۔ اس طرف راہداری بند تھی۔ چوہدری کے پالتو کتے زناٹے کی طرح باہر نکلے اور ٹھکا ٹھک منہ اٹھائے دائیں جانب بھاگتے چلے گئے۔ نہ کسی نے بائیں جانب دیکھا اور نہ سوچا۔ آدھے منٹ سے باہر نکلنے والی لڑکی پچاس میٹر لمبی راہداری پار کرتے کیسے غائب ہو گئی؟ میں واپس کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں تنہا چوہدری زخمی شیر کی طرح اضطرابی حالت میں پیچ و خم کھا رہا تھا اور ہتھیلیوں پر مکے مارتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی' تب اس کی میری جانب پیٹھ تھی۔ میں نے ایک طرف پڑا ہوا بڑا گلدان اٹھا کر چوہدری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چوہدری اللہ رکھا...... اللہ سے اپنے لیے معافی مانگ لے۔'' میری آواز پر وہ پھرتی سے پلٹا۔ اگر حیرانگی سے موت ہوتی تو شاید وہ یوں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے مر جاتا۔ اس کے لب کچھ کہنے کے لیے تھرتھرا رہے تھے۔ میں چل کر اس کے بالکل قریب سامنے چلی گئی۔

''گاؤں کی ہر لڑکی تیری زرخرید غلام نہیں چوہدری اللہ رکھا' تو نے پنڈ مہر داد نگر والوں پر بہت ظلم ڈھالیے اب تیرے حساب کا وقت آ چکا ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔'' میں نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ حیرت ابھی تک چوہدری کے چہرے سے ہٹی نہیں تھی اور جب تک حیرت رفع ہوتی' بھاری بھرم گلدان اس کے سر سے ٹکرا چکا تھا۔ اس کے منہ سے تیز اوغ...... کی آواز نکلی۔ پہلے وار سے چوہدری کی پگڑی گر چکی تھی' دوسرے وار سے چوہدری بھی لہرا کر پیچھے پڑے ہوئے صوفے پر جا گرا۔ میں نے بھاگ کر دیوار پر لٹکی ہوئی رائفل اتاری' اس میں کارتوس چیک کیے' رائفل لوڈ تھی' چوہدری اللہ رکھا صوفے پر سیدھا گرا ہوا تھا' میں نے رائفل کا بٹ اس کے دونوں پاؤں میں تھپتھپایا اور رائفل کی نال چوہدری کی تھوڑی کے نیچے رکھ دی۔ چوہدری کے پاؤں سے جوتے پہلے ہی نکل گئے تھے۔ میں نے اس کا انگوٹھا ٹریگر پر رکھا اور چوہدری کا جوتا اٹھا کر اس کے پاؤں پر ضرب لگائی' ضرب لگنے سے انگوٹھا دب گیا۔ سنسان حویلی میں جی ایس کے کارتوس نے ایک دھماکا کر دیا' کارتوس چوہدری کے چہرے کا حلیہ بگاڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ اب حویلی میں ہنگامہ مچ اٹھا تھا۔ میں فوراً باہر نکل کر راہداری

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ کمرا بالکل خالی تھا اور میرے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی بھاگنے اور تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

''اوئے چوہدری کے کمرے سے آواز آئی ہے۔'' باہر سے کسی شخص نے پکارا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا' بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے چوہدری کے کمرے کی جانب جا رہے تھے' کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہوئیں۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا' راہداری خالی تھی' یقیناً سب لوگ چوہدری کے کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ میں جلدی سے باہر آئی اور اطمینان سے حویلی سے باہر نکل آئی۔ اُس حویلی سے جس کی اونچی فصیلوں سے کوئی لڑکی اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

میں اپنے گھر میں داخل ہوئی تو پریشانی کا طوفان وہاں بھی تباہی مچا رہا تھا' وہ میرا ہر ممکنہ جگہ معلوم کر چکے تھے' ابا کے سامنے میری حاضری ہوئی تو مجھے پتا چلا' احساس نام کی چیز کتنی پاورفل ہے' میں جس نے گاؤں کے ظالم چوہدری کو بلاخوف وخطر موت کے گھاٹ اتار دیا' ابا کے سامنے خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ مجھے احساس تھا' یہ میرا سخت مزاج ابا ہے۔ جس نے ہمارے اکیلے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگا رکھی تھی مگر یہ غلطی کر بیٹھی تھی اور اس کی سزا ابھی بھگت چکی تھی اور کچھ ابھی باقی تھی۔

چوہدری اللہ رکھا کا قتل معمولی بات نہیں تھی' اس سانحہ نے لوگوں کو سکتے میں ڈال دیا تھا۔ لوگ چوہدری اللہ رکھا کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے' دہشت اور خوف کی علامت چوہدری اللہ رکھا کو قتل کر دیا گیا' وہ بھی رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی مکھنی نے...... یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پنڈ مہر داد نگر کے علاوہ اردگرد کے سینکڑوں دیہاتوں میں پھیل گئی۔ جب پولیس والوں نے مجھے گرفتار کیا تو لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم وہاں جمع ہو گیا۔ مہر داد نگر کے سارے مرد اور عورتیں تو جمع ہی تھے' اردگرد کے بہت سے دیہاتوں کے لوگ بھی آ کھڑے تھے۔ وہ اس لڑکی کی جھلک دیکھنے کو جمع تھے جس نے چوہدری اللہ رکھا جیسی قدآور شخصیت کو قتل کیا ہے۔ جب مجھے وین میں بٹھایا جانے لگا تو میں نے قریب ہی کھڑی ہوئی صفیہ ماسی سے کہا۔

''ماسی' ذرا ادھر آنا۔'' وہ میرے قریب آئی تو میں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ہاتھوں سے چوڑیاں نکال دو ماسی...... سنا ہے' ہتھکڑیاں مرد کا گہنا ہوتی ہیں' مرد کا یہ گہنا میرے ہاتھوں میں ہے اس لیے عورتوں کا گہنا ان مردوں کو پہنا دو۔''

صفیہ ماسی نے میرے چہرے کی طرف دیکھا' اس کی بوڑھی آنکھوں میں پانی کے قطرے تھے۔ چوڑیاں اتارنے کے بعد اس نے ایک نظر مجمع کو دیکھا اور پھر پوری قوت سے چوڑیاں ان کی طرف پھینک دی تھیں۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

''جتنے مرد کھڑے ہو' سارے پہن لو۔ دوسروں کا تماشہ دیکھنے کے لیے کیسے اکٹھے ہو جاتے ہو مگر اپنی عزت' جان و مال اور زندگی کو یوں ہی چوہدریوں' وڈیروں اور سرمایہ داروں کے پاس رہن رکھے رکھنا۔ کبھی اپنے حقوق کے لیے آواز نہ اٹھانا' مٹتے رہنا مگر چپ رہنا۔ تماشوں کے لیے ایک ہو جانا مگر اپنے حق کے لیے کبھی بھی ایک نہ ہونا۔ لعنت ہے تم مردوں کی زندگیوں پر......'' کہہ کر میں وین میں چڑھ گئی۔ مجمع سکتے میں چلا گیا تھا' ویسے ہی جیسے اندر میرے گھر والے سکتے کی کیفیت میں تھے۔ وین ان سے دور ہو رہی تھی' کھیت کھلیان' جانور' انسان' گاؤں اور گاؤں والے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا تھا۔

•......•......•......•

گھر میں کسی کو بھی وقت نہیں ملا تھا کہ وہ مجھ سے لپٹ کر رو لیں۔ ابا کے سامنے پیشی ہوئی تو ابھی باز پرس جاری تھی کہ پولیس گاڑی کے سائرن گونج اٹھے تھے۔ اس کے بعد سارے مراحل عجلت میں طے ہوئے۔ گھر والے حیرت کے مارے اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کر سکے اور پولیس والے مجھے تھانے لے آئے۔ دوسرے دن ملاقات کو آئے تو انہیں موقع ملا۔ آہوں' سسکیوں اور آنسوؤں میں تھانے کا کمرہ ڈوب گیا۔ امی' پھوپھو' سکھاں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں لوہے کی موٹی سلاخوں کو پکڑے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ میری آنکھوں کی ندی ابھی خشک تھی' بس میں امی سے لپٹ جانا چاہتی تھی مگر بیچ میں موٹی لوہے کی سلاخیں تھیں۔ میں نے دیکھا' مظہر بھائی دانت بھینچے کسی گہری سوچ میں ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سارا خون منجمد تھا۔ وہ آنسوؤں' جذبات اور نجانے کیا کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''امی......! ابا کیسا ہے؟ اس کی طبیعت ٹھیک تو ہے؟ ابا مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات پوچھ ڈالے۔ ''مجھے سب سے زیادہ فکر ابا کی ہے۔''

امی نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''منجھی کل (چارپائی لے لی۔) لی ہے تیرے ابا نے۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔'' امی اس سے آگے کچھ نہ کہہ پائی۔ ابا کی باقی کہانی ان کے آنسوؤں نے مجھے سنا دی۔

میں نے قریب کھڑی ہوئی پھوپھو سے پوچھا۔ ''اظہر بھائی نہیں آیا؟''

''بھائی کے پاس ہے۔'' پھوپھو نے جواب دیا پھر میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''مکھنی' یہ تُو نے کیا کر دیا؟ تُو' تو سکھاں کے ساتھ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے' خود ان پر عمل کیوں نہ کر سکی؟''

''پھوپھو......! میں......!''

''دھیے......! (بیٹی......!) کہتے ہیں' جل کی مچھلی' جل میں ہی بھلی۔ ہم غریب لوک (لوگ) ہیں۔ سر نیچے کر کے زندگی گزارنا ہی ہماری بھلائی ہے۔'' پھوپھو نے بڑی عجیب بات کہہ دی تھی۔ وہ پھوپھو جو میری باتیں سن کر بھاگ جایا کرتی تھی' آج نجانے کہاں سے اتنی گہری باتیں سیکھ آئی تھی۔ میں خاموش رہی تو وہ بولی۔ ''دھیے......! یہ روپے پیسے والے لوگ بری عادتیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ چوہدریوں سے ٹکر غریبوں کا کام نہیں ہے۔''

''پھوپھو......! میں سب کچھ کر سکتی ہوں' ہر ظلم و ستم برداشت کرنے کی طاقت ہے مجھ میں اور میں یہ بھی جانتی ہوں' دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا مگر پھوپھو......! میں کنجری بن کے مجرہ نہیں کر سکتی۔ میں......!''

میری نظر اچانک مظہر بھائی کی طرف اٹھی۔ مجھے لگا جیسے میری باتیں سن کر اس کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ رہا تھا اور کھول رہا تھا۔ میں خاموش ہو گئی کیونکہ مظہر بھائی خاموش سمندر کی طرح چپ کھڑا ہوا تھا اور خاموش سمندر کسی بہت بڑے طوفان کی علامت ہوتا ہے۔

وہ لوگ چلے گئے' مہر داد نگر کے حالات دگرگوں تھے۔ چوہدری اللہ رکھا کی موت کے بعد اس کی جگہ بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے لے لی تھی۔ مہر داد نگر کے باسیوں کا خیال ہے' چوہدری اللہ رکھا اگر بھیڑیا تھا تو چوہدری مشتاق بھیڑیا بھی ہے اور درندہ بھی' عوام الناس کو اس کے آنے سے اندازہ ہو جاتا ہے' چوہدری

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشتاق اب کیا گل کھلائے گا۔ اس کا بھائی چوہدری راحیل بھی انہی خصلتوں کا مالک ہے۔ مظہر بھائی کی وجہ سے میں نے سکھاں سے چوہدری راحیل کے بارے میں کچھ سوال نہیں کیا نہ ہی سانول کے بارے میں کچھ پوچھ سکی۔ چند دنوں بعد مجھے پھر اطلاع دی گئی۔ ''ارے لڑکی' تیری ملاقات آئی ہے۔'' میں جو اداس اور پریشان بیٹھی ہوئی تھی' اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ملاقات کے لیے تنہا سکھاں کو دیکھا تو دل میں کئی قسم کے وسوسے اٹھنے لگے۔

''سکھاں' کس کے ساتھ آئی ہو؟''

''سانول کے ساتھ۔'' سکھاں نے جواب دے کر مجھے حیران کردیا۔

''سا...... سانول کے ساتھ...... کہاں ہے سانول؟''

''تھانے دار کے کمرے میں بیٹھا ہے۔ مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے مکھنی' اس لیے اسے وہاں بٹھا کے آئی ہوں۔''

''سکھاں' تو سانول کے ساتھ آئی کیسے؟ ابا' امی' بھائی سب ٹھیک تو ہیں؟''

''سب ٹھیک کیسے ہوسکتا ہے مکھنی' تو حوالات میں بند ہے اور گھر میں سب ٹھیک ہیں؟''

''کیا ہوا سکھاں؟ تو مجھے بہت پریشان لگ رہی ہے؟''

''مکھنی' چوہدری مشتاق نے پیغام بجھوایا ہے۔ اگر سکھاں کا رشتہ چوہدری راحیل کے لیے قبول ہے تو ہم مکھنی کو معاف کردیتے ہیں یا دیت کے قانون سے رہائی دلوادیتے ہیں۔''

''کیا......؟'' میں نے حوالات کی سلاخوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو سکھاں؟ کیا انہونی بات ہے' چوہدریوں کو ترکھان دیت کی رقم ادا کریں گے؟''

''مکھنی' اس کا کہنا ہے' یہ رقم بھی ہم نے ادا کرنی ہے۔ ہمیں سکھاں کا نکاح چاہیے۔''

''سکھاں کا نکاح؟'' میں نے انتہائی تلخی سے دہرایا۔ مجھے یوں لگا جیسے زہریلا تیر میرے دل کے آرپار ہوگیا ہے۔

''مکھنی' وہ کہتا ہے' مکھنی کو جیل سے باہر لانا ہمارا کام ہے ورنہ وہ سیدھی پھانسی کے تختے پر لٹکے گی۔ یہ پہلا پیغام ہے جو چوہدریوں نے باعزت طریقے سے بھجوایا ہے ورنہ ان کے ارادے مجھے بہت خطرناک لگتے ہیں۔''

''تو پھر سکھاں' فیصلہ تو تم نے کرنا ہے' کیا سوچا ہے؟''

میرے سوال پر سکھاں کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹا اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''اللہ کی قسم! مکھنی' تم مجھے سانول سے زیادہ عزیز ہو۔ میں اس کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

سکھاں کی بات سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر سکھاں کو پکڑ لیا۔ ''نہیں سکھاں' نہیں' یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ جس پاک اللہ کی قسم تم نے کھائی ہے' اسی پاک ذات کی قسم! میں مرجاؤں گی لیکن تمہیں قربانی کا بکرا نہیں بننے دوں گی۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے جو میری بہن کو زندہ لاش بنا کر کتوں کے آگے بھنبھوڑنے کے لیے پھینک دے۔'' میں نے اسے جھنجھوڑا اور چیخ کر کہا۔ ''نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی' سمجھیں تم؟''

''تو پھر پھانسی پر لٹکنے سے پہلے ابا کا جنازہ بھی پڑھ جانا۔'' سکھاں بھی جواباً چیخ پڑی تھی اور اس کی چیخ' میری چیخ سے زیادہ بلند تھی۔ اُس نے جھٹکا دے کر خود کو میرے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ ''پتا بھی ہے تمہیں' تیری موت سے کتنے کو موت آئے گی؟ ابا چارپائی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ رحیم اللہ ترکھان جس کی غیرت کی مثالیں پورا مہر داد نگر دیتا ہے۔ آج اس کے کندھے جھک گئے ہیں' زندہ لاش تو وہ بھی بن گیا ہے مکھنی' کہ اس کی بیٹی پولیس کی تحویل میں ہے۔''

''مگر سکھاں......!''

''مکھنی' مظہر بھائی نجانے کہاں سے پستول لے آیا ہے' اس کے کندھے سے کلہاڑی لٹکی ہوئی ہے اور ہاتھ میں پستول رہتا ہے۔ ساری ساری رات چھت پر جاگ کر ٹہلتا رہتا ہے' کہتا ہے۔ ''رب کائنات کی قسم! کسی نے رحیم اللہ کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا تو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔'' اظہر بھائی کہتا ہے' جب تک مکھنی حوالات سے باہر نہیں آتی' دبئی نہیں جاؤں گا۔ بھابھی اسے مجبور کررہی ہے کہ وہ جلدی چلا جائے' پورا گھر انتشار کا شکار ہے مکھنی......!'' مجھے سکھاں کی باتوں نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ سکھاں سابقہ لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے بولی۔ ''مکھنی' یاد ہے' تم نے مجھے کہا تھا' محبت پالے یا خاندان بچالے' بات میری سمجھ میں آگئی ہے مکھنی' میں اتنی خودغرض نہیں بن سکتی۔ اپنی محبت کے لیے پورے خاندان کو سولی پر نہیں لٹکا سکتی۔ میں چوہدری راحیل سے نکاح کروں گی تو جیل سے باہر آجائے گی تو سب کو سکون مل جائے گا۔'' سکھاں نے مجھے لاجواب کردیا۔ آج سکھاں نے ثابت کردیا' وہ کالج وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں جاتی تھی' وہاں سے کچھ لے کر آتی تھی۔

''سکھاں......! مجھے پھانسی نہیں ہوگی۔ میں انشاء اللہ' جلدی باہر آجاؤں گی۔''

''مکھنی' ان جھوٹی تسلیوں سے نہ خود فریب کھاؤ اور نہ ہمیں دو۔ چوہدری اللہ رکھا کا قتل ہوا تیرے ہاتھوں اور چھ سات آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے سکھاں' لیکن ثبوت ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' سکھاں بے اختیار سلاخوں کے قریب کھسک آئی۔

''سکھاں! چوہدری اللہ رکھا مجھے اٹھا کر اپنے حجرے میں مجرہ کروانے کی غرض سے لے گیا تھا۔ وہاں چوہدری سمیت سات افراد موجود تھے۔ چوہدری اللہ رکھا نے میرے قدموں میں گھنگروؤں کا جتھہ پھینک کر کہا' اسے پہن کر ناچو۔ میں نے جواباً وہی جتھہ چوہدری کے منہ پر دے مارا۔ چوہدری اللہ رکھا زخمی ہوگیا اور میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ اس کے بندے میرے پیچھے بھاگے تھے۔ میں حویلی سے نکل آئی تھی۔ بعد میں پتا چلا' چوہدری اللہ رکھا کا قتل ہوچکا ہے۔ جانتی ہو سکھاں' اسے کس نے قتل کیا ہے؟''

''نن...... نہیں......'' سکھاں میری باتیں پوری محویت سے سن رہی تھی۔

''چوہدری اللہ رکھا کو اس کی غیرت نے قتل کیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں مکھنی......!''

''سکھاں! چوہدری اللہ رکھا کو ایک نازک لڑکی اس کے بندوں کے سامنے ذلیل و رسوا کرکے بھاگ نکلی تھی' وہ گھنگرو جو لڑکی کے پاؤں میں بندھے ہونا چاہیے تھے' وہ چوہدری کے چہرے پر برس پڑے' یہ بات چوہدری کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

غیرت کے خلاف تھی اس لیے اس نے اپنے بندوں سے شرمندگی چھپانے کے لیے خودکشی کرلی......"

"خودکشی......"

"ہاں سکھاں......! اگر پولیس دیانت داری سے تفتیش کرے اور آلۂ قتل برآمد کر کے فنگر پرنٹ لے تو مجھے یقین ہے' قاتل میں نہیں' خود چوہدری اللہ رکھا نکلے گا۔"

"مکھنی' اگر تُو سچ بھی کہہ رہی ہے مگر ہوگا کیا؟ پورا تھانہ چوہدری کا ہے' پوری تحصیل بلکہ ضلع بھر میں چوہدری اللہ رکھا کا سیاسی اثر و رسوخ ہے۔ اس کے جنازے میں صوبائی وزراء' ایم این اے اور ایم پی اے تک شرکت کرنے آئے تھے۔ کہاں چوہدریوں کا گھرانہ اور کہاں رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی!"

"سکھاں' تم اللہ تعالیٰ کو مانتی ہو؟" میرے سوال پر سکھاں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں مکھنی......!"

"کتنے یقین کے ساتھ؟"

"اتنے ہی یقین سے جتنے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مکھنی اس وقت میرے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔"

"تو پھر سکھاں' کوئی بھی فیصلہ جذبات میں آکر مت کرو۔ سنا ہے' چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت ایسا بھی ہے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر پکارتے ہیں۔ "ہے کوئی مانگنے والا اور اپنی بخشش کروانے والا؟" آج رات خدا کو آزما کے دیکھوں گی۔ اس کے بعد تمہیں کھلی چھٹی ہے' جو مرضی آئے' کرنا۔"

سکھاں چلی گئی مگر میرے لیے سوچوں کے انبار لگا گئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ آج کی رات آزمائش کی رات تھی۔ میرے ذہن میں مولوی محمد عمر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ایک دن میں چھت پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر کر رہے تھے۔ میں غور سے سننے لگی تھی۔ "دنیا کے تمام رشتوں میں ماں انسان سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ اگر رات کی تاریکی میں بھی ماں کو پکارو تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتی ہے اور کہتی ہے۔ "جی میرے لعل!" پھر پکارو اور وہ پھر کہے گی۔ "بول میری جان!" پھر پکارو' اس پر کہتی ہے۔ "میں سن رہی ہوں چاند!" پھر پکارو' وہ کہے گی۔ "اب بولو بھی؟" پھر پکارو' وہ کہے گی۔ "بولو ورنہ سو جاؤ۔" پھر پکارو' وہ تنگ آکر کہے گی۔ "پرے مر' نہ خود سوتا ہے نہ سونے دیتا ہے۔" مگر اللہ تعالیٰ میرا اور آپ کا اللہ' اسے پکارو۔ "یا اللہ!" وہ کہے گا۔ "لبیک میرے بندے!" پھر پکارو پھر پکارو اور پکارتے ہی رہو۔ وہ کہتا رہے گا۔ "لبیک! لبیک!" کیونکہ اے بندے! تُو نے اللہ کو پکارا ہے جو غفور بھی ہے' رحیم بھی ہے' کریم بھی ہے۔ تُو قیامت تک پکارے گا تو بھی وہ برا نہیں مانے گا۔ تُو پکارتے پکارتے تھک جائے گا' وہ لبیک کہتے ہوئے نہیں تھکے گا۔" ...... میں ایک ہی رات اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئی اور اگلی ہی شام وہ معجزہ ہوگیا جس نے تاریخ ایک بار پھر پلٹ دی۔

مجھ سے تفتیش کرنے کے لیے شہر سے لیڈی انسپکٹر شبانہ کو بلایا گیا تھا...... شبانہ میانہ قد کی تیس' پینتیس سالہ خوبرو عورت ہے' جسم فربہ مائل تھا مگر اس کے جسم میں کشش تھی مگر تھی روایتی پولیس والوں جیسی' بات بات پہ گالی دینا اور رعب جھاڑنا اس کی عادت ہے' مجھے اپنے کمرے میں بلا کر اس نے میرا سرتاپا جائزہ لیا' کمرے میں دو کانسٹیبلز بھی موجود تھے' ایک ادھیڑ عمر کا جبکہ دوسرا جوان آدمی تھا۔ شبانہ میرا مکمل جائزہ لینے کے بعد بولی۔

"کلاشنکوف' رائفل یا پستول چلانا ہر کوئی سیکھ لیتا ہے مگر ان سے بندہ مارنا ہر کسی کا کام نہیں' یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تجھ جیسی لڑکی نے یہ کام کیا تو کیسے کیا؟"

"میں نے واقعی قتل نہیں کیا۔"

"تو چوہدری اللہ رکھا کو آسمان سے فرشتوں نے اتر کر گولی ماری ہے؟" اس نے انتہائی غصے میں کہا۔ دیکھا جائے تو خوبصورت عورت کا غصہ خاص اثر نہیں کرتا۔

"تُو سمجھتی ہے اسے میں نے گولی ماری ہے؟" میں نے نارمل لہجے میں جواباً کہا۔

"سمجھتی نہیں ہوں' یقین ہے مجھے کیونکہ میرے پاس گواہ بھی ہیں اور ثبوت بھی موجود ہے' بس تجھ سے اقرار کروانا ہے۔"

"اور اگر میں اقرار نہ کروں تو؟"

وہ میری بات سن کر کھڑی ہوگئی۔ ہاتھوں میں ڈنڈا گھما کر بولی۔ "میں مولا بخش کم ہی استعمال کرتی ہوں۔" اس نے ڈنڈا میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر کہا۔ "تجھ جیسی لڑکی سے اقرار کروانا میرے لیے الٹے ہاتھ کا کھیل ہے کیونکہ مجھے یقین ہے' جب تیری شلوار کے دونوں پائنچے باندھ کر میں اندر چوہے چھوڑوں گی تو تُو ان کا نوچنا برداشت نہیں کر سکے گی یا پھر بدبودار کمرے میں جس میں انسانی فضلے کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں' اس میں بھی دن نہیں گزار سکے گی اور نہ ہی ان ہزاروں چیونٹیوں کا جسم پر رینگنا برداشت کر سکو گی جو میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہارے جسم پر چھوڑنے والی ہوں......"

"شبانہ......! عورت بن کے سوچو' غیر اخلاقی سوچ اور عمل سے دور رہو۔"

"غیر اخلاقی عمل......؟" اس نے میری تھوڑی ڈنڈے سے اوپر اٹھائی۔ "کیا خوب بات ہے' ایک قاتلہ قانون والوں کو اخلاق سکھا رہی ہے۔ جانتی بھی ہو' ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے؟"

"جانتی ہوں مگر انسان کا قتل' حیوان کا نہیں۔"

"چوہدری اللہ رکھا انسان تھا' حیوان نہیں۔"

"میری نظروں میں وہ حیوان تھا' ساٹھ سال کی عمر میں سترہ برس کی لڑکی کو اٹھوا کر مجرہ کرواتا ہے' تم بتاؤ' یہ انسانوں والا عمل ہے؟"

میری بات سن کر وہ تلملا گئی۔ غصے سے بولی۔ "باتیں بہت کرتی ہے تُو' جب میں آپے سے باہر آؤں گی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔" اس نے ایک موٹی گالی دی مجھے۔ پولیس والے ہوں یا والیاں' گالی کو تھانے کی لونڈی سمجھتے ہیں۔

"میں حیوان کا قتل کروں تو پوری انسانیت کی قاتلہ ٹھہروں اور تو مجھے بار بار گالی دے رہی ہو تو تم کیا ہو؟ اتنی پوتر تم بھی نہیں ہو جتنی خود کو سمجھ رہی ہو۔"

میری جرأت پر وہ ششدر رہ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیا اور بولی۔

"کس بات کا زعم ہے تجھے؟ یہاں کوئی نہیں آئے گا تجھے چھڑانے والا۔"

"وہ آرہا ہے' مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے' اس کے سفید گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اچھا' تیرے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گونج رہی ہے؟" انسپکٹر شبانہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا پھر ہنسی اڑانے والے انداز کو جاری رکھتے ہوئے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ "بھئی' یہاں تو صرف کانسٹیبل بشارت اور میاں علی کھڑے ہیں' کیا یہ تمہیں چھڑائیں گے؟"

"تم دھیان سے سنو' کان لگا کے سنو' آوازیں آ رہی ہیں۔"

"او بھائی بشارت......! یہ تو گئی کام سے!"

"میڈم' لگتا ہے' صدمے سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔"

"دماغ خراب نہیں ہے میرا' سندھ میں ایک عرب عورت نے محمد بن قاسم کو پکارا تھا جس پر محمد بن قاسم نے لبیک کہا تھا۔ یہاں بھی آئے گا۔"

"اوئے......! کون سا محمد بن قاسم؟" شبانہ نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر پوچھا جیسے یقین کر رہی ہو میں نیند میں ہوں یا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہوں۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "وہی محمد بن قاسم جس نے اروڑ کے مقام پر پہلی مسجد تعمیر کی تھی۔"

"ہاتھ آگے کر۔" شبانہ میرے بالکل نزدیک آ کر بولی۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ کر کے کہا۔ "لگی شرط' اگر محمد بن قاسم ابھی یہاں نظر آ جائے تو تُو بری۔"

"اور اگر نہ آیا تو میں اقرار نامے پر دستخط کر دوں گی۔" اس کا اگلا جملہ میں نے پورا کر دیا تھا۔

"منظور ہے۔" میں بولی۔ "اب لا دکھا مجھے!"

"دیکھنے سے پہلے سن شبانہ' دھیان دے' غور کر۔" میرے لہجے میں یکدم پراسراریت عود آئی تھی۔ "گھوڑے دوڑ رہے ہیں' مٹی اور دھول اڑ رہی ہے' محمد بن قاسم کا لشکر بڑھ رہا ہے۔ غور سے سن گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں۔"

کمرے میں پراسرار خاموشی تن گئی' گہری اور مہیب خاموشی میں بہت سے گھوڑے بھاگ رہے تھے' یوں لگتا تھا جیسے پورا ایک لشکر اس طرف بڑھ رہا ہے۔ آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ انسپکٹر شبانہ پر خوف سوار ہو چکا تھا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔ پیچھے اس کی کرسی پڑی ہوئی تھی' وہ کرسی سے ٹکرائی اور اس پر بے سدھ' بے جان جسم کے ساتھ بیٹھ گئی۔ دونوں کانسٹیبلز بھی خوف سے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔

"اُدھر دیکھو' سفید دیوار کی طرف۔" میرے اشارے پر انہوں نے وہاں دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ حیرت اور خوف سے وہ زندہ لاشوں میں بدل گئے تھے۔ انسپکٹر شبانہ کرسی پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔

مجھے اسکرین پر سجیلا جواں سال محمد بن قاسم نظر آنے لگا۔ "دیکھو شبانہ......! یہ ہے جواں سال سپہ سالار محمد بن قاسم' یہ اپنے چچا حجاج کے کہنے پر چھ ہزار شامی فوج کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہے۔ تمام جنگی ساز و سامان کے ساتھ محمد بن قاسم کا لشکر اللہ اکبر کے نعروں سے گونجتا ہوا دیبل کے مقام پر پہنچ گیا۔ فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور اپنے آگے خندقیں کھود لیں اور منجنیقیں نصب کر لیں اور یہ دیکھو انسپکٹر شبانہ' وہ مشہور و تاریخی منجنیق عروس جسے پانچ سو آدمی کھینچ رہے ہیں' اب اُسی سے سنگ باری کی گئی۔ دیکھو...... دیکھو...... دیبل کا گنبد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکا ہے۔" اسکرین پر گرد و غبار کے بادل چھائے ہوئے تھے' گرد و غبار چھٹا تو چند مسلمان کمند لگا رہے تھے' وہ کمند لگا کر فصیل پر چڑھ گئے۔ جیسے ہی مسلمان شہر میں داخل ہوئے' دیبل کا حاکم بھاگنے لگا۔ یہاں محمد بن قاسم

نے چھ ہزار مسلمانوں کو آباد کیا۔ ایک جامع مسجد تعمیر کی اور آگے بڑھ گیا۔ محمد بن قاسم کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیرون' سری ویدوس کی کامیابی کے بعد اب وہ دریائے سندھ پار کر کے راجہ داہر کے علاقے میں داخل ہو چکا ہے۔ یہاں اس کے مقابلے کے لیے راجہ داہر کی 60 ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج جنگی ہاتھیوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ خون ریز معرکہ جاری ہے۔ دیکھو جذبۂ ایمانی' جو بھی کافر سامنے آیا' کٹ گیا۔ راجہ داہر بھی مارا گیا اور سندھ پر محمد بن قاسم نے اسلام کا پرچم لہرا دیا اور اب محمد بن قاسم زمین پر گھٹنے ٹیک کر سینے پر ہاتھ رکھ کر اس عرب عورت سے مخاطب ہے' جس نے خط میں اسے پکارا تھا۔ تُو گواہ رہنا' روزِ محشر میں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور اب سترہ برس کا سجیلا نوجوان سپہ سالار اپنی فوج کی امامت کر رہا ہے۔ اس کے بعد یہ آگے بڑھے گا اور شہر در شہر فتح کرے گا۔ راوڑ' برہمن آباد' ساوندری' سمند اور اروڑ کو زیر نگیں کرنے کے بعد ملتان کے راجہ گھور سنگھ کو للکارا جس نے تھوڑی مزاحمت کی مگر شرمناک شکست سے دوچار ہوا۔ یہ ہے محمد بن قاسم! دھیان سے دیکھو لو کیونکہ اس کے ہاتھ میں گولہ ہے' جو پھٹے گا تو تیرا تھانہ بھی اڑ جائے گا......" تھانہ اڑانے کے الفاظ میری زبان پر تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہ دیوار جس پر اسکرین روشن تھی' ریزہ ریزہ ہو کر زمین بوس ہو گئی۔

میں نے شبانہ کی طرف دیکھا' وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں سمجھ گئی' وہ کتنے مضبوط دل کی مالکہ ہے۔ میں نے دونوں مرد حضرات کو دیکھا' وہ جس حالت میں تھے' اُسی حالت میں کھڑے رہ گئے۔ حیرت' خوف اور دہشت کے آثار ان کے چہروں پر ثبت ہو کر رہ گئے۔ میں چلتی ہوئی شبانہ کے پاس پہنچی۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ بری طرح چونک پڑی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کھڑی ہو کر مجھ سے دور کھسکنے لگی۔ اس کا مولا بخش پہلے ہی اس کے ہاتھوں سے گر گیا تھا۔

"نن...... نہیں...... مجھے معاف کر دو۔" اس پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ وہ حد درجہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ تھانے کا مزید عملہ بھی وہاں پہنچ آیا تھا اور سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے ٹکڑے کافی دور تک پھیل گئے تھے۔ میری نظر شبانہ کی پینٹ کی طرف اٹھی تو میرے قدم تھم گئے۔ اس کی پینٹ گیلی نظر آ رہی تھی۔ مجھے شک ہوا' اگر میں اس کے مزید قریب گئی تو وہ خوف سے مر جائے گی۔ میں نے اشارے سے ادھیڑ عمر کانسٹیبل کو بلایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ پیٹ موٹے اور بال چھوٹے ہوتے جاتے ہیں' وہ بھی انہی مراحل میں تھا۔ "اِدھر آؤ۔" وہ ڈرتے ڈرتے میرے قریب آیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی...... بشارت حسین......!"

"گاڑی چلانا جانتے ہو؟" وہ کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "جھوٹ مت بولنا۔ بصورتِ دیگر اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہو۔"

"جی...... جانتا ہوں۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے کیس کا تفتیشی افسر کون ہے اور اس وقت کہاں ہے؟"

"جی' انسپکٹر درانی صاحب ہیں اور اس وقت اپنے گھر میں ہوں گے۔"

"تمہیں پتا ہے' اس کا گھر کہاں ہے؟"

"جی' مجھے پتا ہے' میں اکثر ان کے گھر کا سودا سلف لے جاتا ہوں وہاں!"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''چلو جیپ نکالو۔'' بشارت نے میرے حکم کی تعمیل میں جیپ نکالی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔
انسپکٹر درانی ہمیں سامنے پا کر حیران رہ گیا۔ ''مکھ...... مکھنی...... !تُو؟ یہاں میرے گھر؟''

میرے بولنے سے پیشتر ہی کانسٹیبل بشارت نے اسے فرفر ساری روداد سنا دی۔ اسے میں نے اشارہ کیا تھا اس لیے وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ وہ روداد سناتا رہا اور تھانے دار درانی محوِ حیرت کبھی اس کا چہرہ دیکھتا اور کبھی مجھے دیکھنے لگتا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' پوری کہانی سننے کے بعد وہ ناقابلِ یقین لہجے میں بولا۔ ''اس کا چہرہ بتا رہا تھا' اسے اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔

''اللہ کی قسم! سر جی......! مجھے میری بیوی بچوں کی قسم' اس لڑکی کے اشارے پر دیوار روشن ہوئی۔ اس پر نظر آنے والا شخص محمد بن قاسم ہی تھا۔ میں نے ایک بچے کی کتاب میں ایک بار محمد بن قاسم کی تصویر دیکھی تھی۔

''تھانے دار جی' آپ کو یقین نہیں آتا تو اپنے تھانے فون ملا کے پوچھ لو' آپ کے تھانے کی ایک دیوار اب بھی ٹکڑوں میں بکھری پڑی ہے۔'' میں نے دیکھا' وہ موبائل نمبر ملانے لگا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب تک تھانے دار درانی کو یقین نہیں آ جاتا' میرا کام ہونا مشکل تھا۔ تین چار منٹ فون پر بات کرنے کے بعد اُس نے ایک بار پھر مجھے حیرت سے دیکھا۔ اس بار اس کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا اب مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ میں نے کہا۔

''تھانے دار درانی صاحب! چوہدری اللہ رکھا کو میں نے قتل نہیں کیا' اس نے خودکشی کی ہے......''

''چھ گواہ ہیں تمہارے خلاف' آلۂ قتل بھی برآمد ہو چکا ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ یہ قتل نہیں' خودکشی ہے......؟''

''آپ کو یقین دلانے ہی یہاں آئی ہوں ورنہ سیدھی حویلی جاتی۔ آلۂ قتل سے فنگر پرنٹس لو درانی' پھر دیکھ کس کے نکلتے ہیں' میرے یا چوہدری اللہ رکھا کے؟''

''چوہدری اللہ رکھا دفنایا جا چکا ہے اور اس کے فنگر پرنٹس ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔''

''دفنایا جا چکا ہے تو اسے قبر سے واپس نکال اور فنگر پرنٹس لو' ہاتھوں اور پاؤں دونوں کے' تمہیں ثبوت مل جائے گا۔'' میں نے دانستہ لہجے میں تلخی پیدا کر لی تھی۔ ''اور گواہ!'' میں چند ساعتیں خاموش رہی۔ ''جن چھ گواہوں کی تم بات کر رہے ہو' ان میں سے ایک نے بھی اپنی آنکھوں سے مجھے گولی چلاتے نہیں دیکھا۔ وہ بس میرے پیچھے بھاگے تھے۔ اس قتل کا عینی شاہد ایک ہی تھا تھانے دار درانی اور وہ مر چکا ہے۔''

''کون؟''

''چوہدری اللہ رکھا......!'' میں نے دیکھا' تھانے دار تذبذب میں کھڑا ہوا ہے۔ درانی کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی' سر کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے' اپنے حلیے اور چہرے سے وہ فرض شناس تھانے دار لگتا تھا مگر بعض دفعہ کئی فرض شناس آفیسر اوپر سے آنے والی کال کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں' اس کے چہرے پر پریشانی بالکل واضح ہو گئی۔

میں نے اس کی سہولت کے لیے کہا۔ ''ثبوت تم دیکھو تھانے دار' گواہوں کو میں دیکھتی ہوں۔''
میں نے بشارت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مہر داد نگر چل' مجھے چھ آدمی گواہی دیں گے کہ انہوں نے قتل ہوتے

اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ یہ محض قیاس آرائی ہے کہ قتل مکھنی نے کیا ہے۔'' میں تھانے دار درانی کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ کانسٹیبل بشارت میرے ساتھ کسی غلام کی طرح ہاتھ باندھ کر چل رہا تھا۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگا مگر اس پر رعب قائم رکھنے کے لیے خاموشی ضروری تھی۔ میں ایک خیال کے تحت واپس تھانے دار کے پاس چلی گئی۔ عقب میں بشارت بھی چلا آیا۔

''انسپکٹر درانی...... !تم ہمارے ساتھ چلو۔''

''میں...... میں نہیں جا سکتا۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔'' اس پر تھانے داری کا بھوت سوار ہونے لگا۔ ''تمہیں یوں کھلے عام چھوڑ دینا بھی میرے فرض کے خلاف ہے۔''

''سوچ لو درانی صاحب' کہیں ایسا نہ ہو میں تمہارے گھر سے قدم باہر نکالوں اور یہ گھر آگ کی لپیٹ میں ہو تو چیختا چلاتا رہے' پکارتا رہے' پانی کے سمندر بہا دے مگر آگ نہ بجھے کیونکہ ہر آگ بجھنے والی نہیں ہوتی۔ کیوں وہ اپنے بیوی بچوں کو کوئلہ بنانے پر بضد ہو رہے ہو؟''

''صاحب......! خدا کے لیے' چلیں' آپ کو خدا' رسول کا واسطہ' یہ جو کہتی ہے' کر بھی سکتی ہے۔'' کانسٹیبل بشارت نے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ وہ عملی نظارہ دیکھ چکا تھا اس لیے اسے میری باتوں کا سو فیصد یقین تھا۔

میں مزید کچھ کہنے کی بجائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ مجھے یقین تھا' تھانے دار درانی ضرور آئے گا کیونکہ اولاد انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں ابھی گاڑی تک نہیں پہنچی تھی' عقب سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ قدموں کی چاپ بتا رہی تھی' آنے والا ایک نہیں' دو ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے تمام آدمیوں کو میں جانتی تھی کیونکہ وہ سب مہر داد نگر کے باسی تھے۔ جب ہم گاؤں پہنچے رات کافی ڈھل چکی تھی۔ دیہاتوں میں ویسے بھی رات سرِ شام اتر آتی ہے۔ ہمیں دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آئی' بس کتوں کے بھونکنے یا کسی ڈنگر (پالتو مویشی) کی آواز کبھی کبھی سنائی دیتی تھی۔ مہر داد نگر میں داخلے کے بعد سب سے پہلا گھر منظورے کا آتا ہے۔ منظورا چھ گواہوں میں شامل تھا۔ وقوعہ والے دن وہ بھی میرے پیچھے بھاگا تھا۔ ہم سیدھا اس کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ گھر سے باہر کھیتوں کے کنارے چارپائی لگائے لمبی تان کر سو رہا تھا۔ چارپائی کے ساتھ ایک طرف رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ منظورے کے بیوی بچے یقیناً اندر گھر میں ہی سو رہے تھے۔ تھانے دار درانی نے چارپائی کو زور سے ہلایا۔

''او منظورے......! اٹھ' تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' منظورا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے بندوق اٹھائی تھی۔ ''کون ہے؟'' اس نے غور سے دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پولیس پر نظر پڑتے ہی اس کی اکڑ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

''منظورے' اسے جانتے ہو؟''

''جی...... جی...... تھانے دار جی......! اسے کونڑ (کون) نہیں جانتا' چوہدری اللہ رکھا نوں (کو) قتل کرنے والی رحیم اللہ ترکھان کی دھی (بیٹی) ہے جی......!''

''اوئے منظورے......! ایک بات تو بتا؟''

''جی' پوچھو تھانے دار جی......!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اس نے گولی تیرے سامنے چلائی تھی؟'' اگلے سوال پر وہ خاموش ہوگیا۔ تھانے دار درانی نے اس بار انتہائی سخت لہجے میں پوچھا۔

''جواب دے' سانپ کیوں سونگھ گیا؟ سچ بتانا ورنہ تھانے لے جا کر تیری بھی چھینٹی لگاؤں گا۔''

''میں نے اپنڑی اکھاں نال (اپنی آنکھوں سے) نہیں دیکھا تھانے دار جی......!''

''تو پھر تھانے میں تُو نے بیان کیوں دیا کہ گولی ملکھنی نے چلائی ہے؟''

''وہ جی...... فیقہ اور پیو بھی یہی کہتے ہیں' گولی ملکھنی نے......''

''تو اپنی بات کر' انہیں بھی میں دیکھ لوں گا۔'' تھانے دار درانی کا لہجہ انتہائی سخت تھا۔

''منظورے......! جب میں بھاگی تھی تو مجھے پکڑنے کے لیے میرے پیچھے کون کون بھاگا تھا؟''

''میں' فیقہ' پیو' رمضان اسی سارے چھ بندے تیرے پیچھے بھاگے تھے۔''

''تب چوہدری اللہ رکھا کے پاس کون تھا؟''

''میرے خیال میں کوئی نہیں تھا مگر اساں (ہم) جب برآمدے میں پہنچے تو گولی کی آواز آئی تھی۔''

''تو پھر گولی ملکھنی نے کیسے چلائی ہے جبکہ یہ تم لوگوں کے آگے بھاگی تھی؟'' تھانے دار نے غصے میں پھنکارتے ہوئے پوچھا۔ اس بار منظورا چپ رہا۔

ہم منظورے کے بعد فیقہ' پیو' رمضان' سب کے پاس وقتاً فوقتاً گئے۔ سب کا بیان منظورے جیسا تھا۔ کیس میرے حق میں پلٹ گیا تھا۔ میں نے تھانے دار کو وہی کہانی سنائی جو سکھاں کو سنائی تھی۔ اس سے پہلے اس نے میری بات سننا گوارہ نہیں کی تھی مگر اب بات کچھ اور تھی' شاید چشمِ تصور' میں اس نے بیوی بچوں کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ لیا تھا اس لیے اب مستعدی سے کام بھی کر رہا تھا۔

''تھانے دار صاحب......! میں تھانے چلتی ہوں' آپ گھر جاؤ' گواہ میں نے پیش کر دیئے ہیں' ثبوت لینا آپ کا کام ہے۔''

''بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے بھئی......!'' وہ دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ مجھے اندازہ تھا' وہ واقعی بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔

میں بشارت کے ساتھ تھانے واپس چلی آئی۔ تھانے میں جس نے بھی مجھے دیکھا' ڈر اور خوف سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیڈی انسپکٹر شبانہ تھانے میں موجود نہیں تھی' اسے بخار ہوگیا تھا اس لیے گھر چلی گئی۔

............*......*

مہر داد نگر والوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا۔ رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی ملکھنی نے چوہدری اللہ رکھا کو قتل کر دیا ہے' اس واقعہ کی بازگشت بہت دور دور تک سنی گئی تھی۔ اب وہ دوسرا معجزہ دیکھ رہے تھے' رحیم اللہ ترکھان کی بیٹی باعزت بری ہو چکی ہے۔ گاؤں والوں کے لیے یہ انہونی تھی اور چوہدریوں کے منہ پر طمانچہ!

(اس حیرت اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے
کی چوتھی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے گا۔)

......☆☆......

WWW.PAKSOCIETY.COM



ماہِ رجب المرجب

عزیزو……!

رجب المرجب کا مہینہ اِن چار مہینوں میں سے ہے جن کے احترام میں کفار بھی لڑائی حرام سمجھتے تھے۔ جنابِ رسالت مآب ﷺ فرماتے ہیں۔ ''رجب المرجب اللہ کا مہینہ ہے۔ شعبان المعظم میرا اور ماہِ رمضان المبارک میری اُمت کے لیے استغفار کا مہینہ ہے۔ جو شخص ماہِ رجب المرجب میں ایک روزہ بھی رکھے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا مستحق ہوگا۔''

حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے۔ ''جو شخص ماہِ رجب المرجب میں تین روزے رکھے گا' اللہ تعالیٰ اُس کو ہر روزے کے عوض میں سال بھر کے روزوں کا ثواب عطا فرمائے گا اور جو آٹھ روزے رکھے تو خداوندِ عالم اُس کا حساب آسان فرمائے گا۔''

اگر کوئی روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو پھر ہر روز اِن تسبیحات کو سو مرتبہ پڑھے۔

سُبحَانَ الاِلٰہِ الجَلِیلِ سُبحَانَ مَن لَّا یَنبَغِی التَّسبِیحُ اِلَّا لَه سُبحَانَ الاَعَزِّ الاَکرَمِ

سُبحَانَ مَن لَّبِسَ العِزَّ وَھُوَ لَه اَھلُ

□ اُمِ کلثوم' شیخوپورہ۔

☆ بیٹی اُمِ کلثوم! تمہارا خط قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے تمہارا نام بھی تبدیل کردیا ہے۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا' ہوگیا۔ اس میں تم بھی برابر کی شریک ہو۔ اب اس لغزش کو اپنے ذہن کا بوجھ مت بناؤ۔ بس اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور ہر صورت میں پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو کہ نماز انسان کو ہر برائی سے روکتی ہے۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح استغفار کی کرلیا کرو اور اُٹھتے بیٹھتے یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ بِرَحمَتِکَ اَستَغِیثُ کا وِرد کرتی رہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بہت غفور الرحیم ہے اور معاف فرمانے والا ہے۔ اگر اگلے ماہ تمہاری شادی ہورہی ہے تو تمہیں کسی بھی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے کہ تمہارے ہونے والے شوہر کو علم ہوجائے گا۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس سے اسے علم ہو۔ بس تم خود پہ قابو رکھو اور خود سے وعدہ کرو کہ آئندہ صرف اور صرف اپنے شوہر کی وفادار رہو گی۔ اللہ کرم فرمانے والا ہے۔ ہاں' اگر تمہیں کچھ زیادہ ہی پریشانی ہے تو جوابی لفافہ بھیج کر مجھ سے تعویذ منگوالو۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ اس ضمن میں اپنی کسی ہمدرد دوست' بہن حتیٰ کہ والدہ سے بھی بات مت کرنا۔

□ رابعہ احمد' کراچی۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کے بارے میں ''سچی کہانیاں'' میں پڑھا تھا۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ میری مدد فرمائیں گے۔ میں تین جوان بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ میرے شوہر سانس کے مریض ہیں اس لیے گزشتہ دو سال سے وہ بے روزگار ہیں۔ ان کی صحت اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ کوئی کام کرسکیں۔ بیٹا سب سے بڑا ہے۔ وہ ایک بڑی غیر ملکی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے لیکن اسے ماں باپ اور بہنوں کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میری دو بیٹیاں پرائیویٹ اسکولوں میں جاب کرتی ہیں۔ میں خود بھی گھر میں سلائی وغیرہ کرکے کسی نہ کسی طرح وقت کو دھکا دے رہی ہوں۔ بابا جی! اصل مسئلہ شوہر کی بیماری اور بیٹیوں کی شادی کا ہے۔ ان کی عمریں نکلی جا رہی ہیں۔ اول تو کوئی رشتہ آتا ہی نہیں ہے اور اگر کوئی بھولا بھٹکا رشتہ آ بھی جائے تو وہ ہمارے گھر کی حالت دیکھ کر دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ میری بیٹیاں انتہائی خوب صورت اور سلیقہ شعار ہیں لیکن فی زمانہ لوگ شکل وصورت اور سیرت نہیں بلکہ دولت دیکھتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے مجھے اپنی بچیوں کے مستقبل کا خیال رہتا ہے۔ میرے شوہر الگ کڑھتے رہتے ہیں۔ مہنگائی کے اس دور میں دو وقت کی روٹی کھانا اور تن ڈھانپنے کے لیے معمولی کپڑوں کا بندوبست کرنا بھی ہم جیسے لوگوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے کئی دفعہ اپنے بیٹے کو سمجھایا' اسے زمانے کی اونچ نیچ سے بھی آگاہ کیا لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی خاصی معقول ہے اور اگر وہ چاہے تو ہماری مدد کرسکتا ہے لیکن نہ جانے وہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ صبح گھر سے نکلتا ہے تو پھر رات گئے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ وہ اپنے لباس' جوتوں اور پرفیوم پر خرچ کردیتا ہے۔ بابا جی! مجھ سے زیادہ بدنصیب بھی کوئی ماں ہوگی جس کا کوئی بیٹا موجود ہو اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترستی رہے۔ بابا جی! میں بہت امید سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ خدارا' مجھے مایوس مت کیجیے گا۔ لگتا ہے' کسی نے بندش کردی ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری بیٹیوں کی اچھے اور شریف

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھرانوں میں شادیاں ہو جائیں اور ہمارا بیٹا راہِ راست پر آ جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆ رابعہ بیٹی! تمہارا مسئلہ پاکستان کے ہر دوسرے گھر کا مسئلہ ہے لیکن اس ربِّ رحیم کی ذات سے مایوسی کفر ہے اور یہ 'بندش' کا لفظ ان ڈھونگی باباؤں اور بہروپیوں کی اصطلاح ہے جو لوگوں کو بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں۔ رابعہ بیٹی! اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ تم، تمہاری بیٹیاں اور شوہر پہلے تو پنج وقتہ نماز کی پابندی کریں۔ بیٹیوں سے کہو کہ وہ ہر روز بعد نمازِ عشاء سورۃ طٰہٰ ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ تم بھی فجر کی سنتوں کے بعد اور فرض نماز کے درمیان ایک مرتبہ سورۃ رحمٰن کا وِرد کر لیا کرو اور بعد نمازِ مغرب ایک مرتبہ سورۃ واقعہ پڑھ لیا کرو۔ اپنے شوہر سے کہو کہ وہ بھی اسی طریقے پر عمل کریں۔ خالص شہد اگر کہیں سے مل جائے (ڈھونڈنے سے عموماً مل جاتا ہے۔) تو اپنے شوہر کو صبح، شام کھانے کے دو چمچے نیم گرم پانی میں ملا کر پلا دیا کرو۔ شہد میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بے شمار بیماریوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اپنے بیٹے کے سلسلے میں یہ کرو کہ اس کا پیدائشی نام اور تاریخ پیدائش جوابی لفافے کے ہمراہ مجھے بھیج دو۔ میں اس کے لیے بھی بزرگوں کا آزمودہ ایک تیر بہ ہدف تعویذ روانہ کر دوں گا۔ تم اور تمہاری بیٹیاں اور شوہر اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے حَسبُنَا اللّٰہُ وَنِعمَ الوَکِیل ○ نعم المولیٰ ونعم النصیر کا وِرد کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔

▫ شائستہ وحید، لاہور۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میری عمر اس وقت اٹھارہ سال ہے۔ میں نے اس سال انٹر میڈیٹ کا امتحان دیا ہے۔ میری ایک خالہ نے دو سال پہلے آپ سے اپنے مسئلے کا حل پوچھا تھا۔ آپ کے بتائے ہوئے وظیفے سے نہ صرف اُن کا مسئلہ حل ہو گیا بلکہ اُن کے حالات بھی پہلے کے مقابلے میں بہت اچھے ہو گئے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک کزن کو دیوانگی کی حد تک چاہتی ہوں لیکن وہ میری محبت کو سمجھتا ہی نہیں ہے۔ اس نے اسی سال ایم اے کر کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کی ہے۔ وہ میرا تایا زاد ہے اور ہمارے گھر آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اب تو میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ جس دن میں اس کی صورت نہ دیکھوں، مجھے کسی طور چین نہیں پڑتا۔ میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ میں جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہوں، وہ مجھ سے اتنا ہی دور بھاگتا ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں، وہ کسی دوسری لڑکی کو پسند نہیں کرتا۔ میں اتنی بری بھی نہیں ہوں کہ بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت پرکشش ہوں۔ مجھے لباس پہننے کا سلیقہ آتا ہے اور میں خاصی فیشن ایبل مشہور ہوں۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ یا تعویذ بتائیں کہ میرا کزن بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرنے لگے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ خدارا، میرے لیے کچھ کریں۔

☆ شائستہ بیٹی! اگر دیکھا جائے تو سرے سے تمہارا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تمہارا عم زاد اگر تم سے کھنچا کھنچا رہتا ہے تو اس کی بھی ضرور کوئی وجہ ہو گی۔ اس عمر میں لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ اس قسم کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ تم پہلا کام تو یہ کرو کہ پنج وقتہ نماز پابندی سے اول وقت میں ادا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک ایک تسبیح "تسبیحِ فاطمہ" پڑھنا بھی ضروری ہے۔ بعد نمازِ فجر پانچ سو مرتبہ یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم کا وِرد کرو اور اپنے تمام مسائل کے حل کے لیے اللہ جل شانہ سے گڑگڑا کر اور رو رو کر دُعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی عاجزی بہت پسند ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کرو کہ اپنی کسی قابلِ اعتبار دوست یا خاندان کے کسی بزرگ کے ذریعے اپنے تایا کو اس رشتے پر راضی کرنے کی کوشش کرو۔ خدارا، اب کوئی بھی کوشش خود نہ کرنا ورنہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو زندگی بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ تم نے لکھا ہے کہ اگر تمہارا عم زاد تمہیں نہ ملا تو تم خودکشی کر لو گی؟ خودکشی کرنے والے تو بزدل ہوتے ہیں اور ویسے بھی خودکشی حرام موت ہے۔ ایسا بھول کر بھی مت سوچنا کہ زندگی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ کوئی بندہ اس میں خیانت کرنے والا کون ہوتا ہے؟ میری بتائی ہوئی ہدایات پر پابندی سے عمل کرو اور تیس دن بعد مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

▫ عبدالرحمان، کراچی۔

☆ بیٹے عبدالرحمان! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مشکلات زندگی کا حصہ ہیں، ان سے گھبرانا نہیں چاہیے، جو ان سے گھبراتا ہے، یہ اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ انسان اپنی قوتِ ارادی سے سب کچھ حاصل کر لیتا ہے لہٰذا اپنی سوچ مثبت رکھو۔ بکثرت یَا رحمٰنُ کا وِرد کیا کرو۔ والدہ سے کہو، نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھ کر تم پر دَم کر دیا کریں۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

▫ شاہین اختر، مقام نامعلوم۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی لاتعداد مہربانیوں سے خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! جب جب میری زندگی میں کوئی مشکل مقام آیا، میں نے اللہ کے بعد آپ سے رابطہ کیا جس میں آپ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ بابا جی! نہ جانے کیوں میری زندگی بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اب ایک اور میری زندگی میں مشکل آن پڑی ہے۔ بابا جی! میرے شوہر کا شناختی کارڈ نہیں بن رہا ہے، شناختی کارڈ میں نادرا والوں نے آبجیکشن لگا دیا ہے جبکہ ان کا پرانا کارڈ موجود ہے۔ ان کے کارڈ کی وجہ سے بچوں کا اسکول اور کالج میں بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ میرا کارڈ بنا ہوا ہے۔ بابا جی! اُن لوگوں کی اس حرکت کی وجہ سے ہم لوگوں کو کس قدر مشکلات کا سامنا ہے، اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ دیجیے کہ ان کا کارڈ بن جائے۔ اللہ کے کلام میں بے حد طاقت ہے۔

☆ بیٹی شاہین! تمہارا مسئلہ یقیناً اعصاب شکن ہے۔ جہاں انسان بے بس ہو اور کسی اور کی وجہ سے ذہنی اور مالی اذیت ہو رہی ہو، وہاں زندگی مشکل ہو جاتی ہے مگر میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اللہ سے مدد مانگتی رہو۔

▫ بی بی خلسائی۔ U.K.-

☆ بیٹی خلسائی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ وظیفہ پابندی کے ساتھ کرو اور خوب دُعائیں مانگا کرو۔ بچوں پر سے خوب صدقہ نکالا کرو۔ یہ عمل انسان کو مشکلوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

▫ رقیہ کشور زمان، بٹ گرام۔

☆ بیٹی رقیہ! اللہ تمہیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ بیٹی! جوابی لفافے کے ہمراہ مجھے خط لکھو تاکہ تمہیں تعویذ ارسال کیا جا سکے۔

▫ رشیدہ خاتون، کراچی۔

○ بابا جی! گزارش یہ ہے کہ ہماری بیٹی صائمہ رزاق جس کی عمر 34 سال ہو گئی ہے، شادی کے سلسلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں بات کرنی ہے کہ ان کے بہت سے اچھے رشتے بھی آئے لیکن بہت سی جگہ پر بات بنتے بنتے رہ جاتی ہے۔ جانے کون سی رکاوٹ یا بندش ہے جس کی وجہ سے یہ پریشانی ہے؟ برائے مہربانی کچھ ایسا پڑھنے کے لیے بتایئے جس سے ہماری یہ پریشانی دور ہوجائے اور کہیں اچھی جگہ ان کا رشتہ ہوجائے۔

☆ بیٹی رشیدہ! مناسب ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ کے لیے مکمل تفصیل ارسال کرو اور جوابی لفافہ بھی ارسال کرو تاکہ جواب براہ راست دیا جاسکے۔

□ ترنم۔ امریکہ۔

o محترم باباجی! خوش رہیں' شاید آپ کو یاد ہو' میں نے آپ سے اولاد کے لیے تعویذ لیا تھا۔ میرا بھائی کراچی میں ہوتا ہے' وہ آپ کے دفتر سے تعویذ لے آیا تھا۔ باباجی' میری شادی کو 12 سال ہوئے ہیں اور اس عرصے میں میرے چار بچے پیدا ہونے کے چند روز بعد ختم ہوگئے تھے۔ تعویذ کی برکت سے اب میں ایک صحت مند بیٹے کی ماں ہوں۔ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تعویذ کا کیا کروں؟ کیا آپ مجھے حفاظت کے لیے تعویذ دیں گے؟ میں خود ماہ جون میں پاکستان آرہی ہوں' اگر آپ تعویذ دیں گے تو میں خود لے جاؤں گی۔

☆ بیٹی ترنم! اللہ نے تمہیں اولاد کی نعمت سے نوازا' اس پاک ذات کا ہر لمحہ شکر ادا کرتی رہو اور اس کی راہ میں دینے سے کبھی کوتاہی مت کرنا۔ تعویذ تلف کردو' حفاظت کے لیے میں نقش تیار کردوں گا۔ تم دن میں کم از کم 13 بار آیت الکرسی پڑھ کر بچے پر ضرور دم کیا کرو۔

□ دردانہ۔ اٹک۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ چاروں قل کے ساتھ سورۃ فاتحہ پڑھا کرو۔ وظیفہ مزید 21 روز کرو پھر مجھے مطلع کرو۔

□ احمد فراز۔ دبئی۔

o باباجی! میں عرصہ چار سال سے یہاں دبئی میں نوکری کررہا ہوں۔ گھر اور بچوں سے دور ہوں مگر حالات ایسے نہیں ہو پا رہے کہ انہیں بھی یہاں بلا سکوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتایئے جو میں عشاء کے بعد کرسکوں۔

☆ بیٹے فراز! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور عشاء کے بعد 101 بار پڑھو۔

وَاَلْقِ مَافِی یَمِینِکَ تَلْقَفْ مَاصَنَعُوْ
اِنَّمَاصَنَعُوْا کَیْدُسٰحِرٍ ط وَلَایُفْلِحُ
السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰیo (طٰحٰہ ۶۹)

اول و آخر درود شریف 7-7 بار پھر دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ حاجت قبول ہونے پر حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرنا۔

□ زاہدہ۔ ہالینڈ۔

o عزت مآب جناب بزرگ! آپ جو نیکی کررہے ہیں' اللہ آپ کو اس کے بدلے دنیا و آخرت دونوں میں بلند رتبہ عطا فرمائے۔ میرا ایک مسئلہ جو بہت عرصے سے ہے اور اب شدید ہوگیا ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے جو ماشاء اللہ' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور بہت اچھی نوکری پر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی شادی کردوں مگر وہ کسی طور تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت اس کی عمر 34 سال ہوگئی ہے۔ جناب بزرگ! میرا اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں' میں چاہتی ہوں' اپنا یہ فرض جلد از جلد پورا کردوں۔

☆ بیٹی زاہدہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو اور بیٹے سے کہو' مجھے اپنا دوست' اپنا بڑا جان کر ضرور خط لکھے۔ انشاء اللہ' یہ معاملہ حل ہوجائے گا۔ بیٹی' تم اب کچھ عرصہ اس پر شادی کے لیے دباؤ مت ڈالنا۔

□ صائمہ' بیگم' لاہور۔

o باباجی! اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ اسی طرح خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں۔ باباجی! میرا نواسہ بہت بدتمیز اور غیر مستقل مزاج ہے۔ دنیا کی ہر سہولت حاصل ہے مگر پھر بھی بے زار بے زار سا رہتا ہے۔ اس کی ماں بہت پریشان رہتی ہے۔ اکثر باپ سے بھی زبان چلاتا ہے۔ اسی وجہ سے گھر کا ماحول بہت خراب رہتا ہے۔ ماں کو پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیجیے' وہ گھر میں رہتی ہے۔

☆ عزیزہ صائمہ! سب سے پہلے تو بچے پر بے تحاشہ توجہ دینا کم کردو۔ اس عمر میں لڑکے اکثر ایسے ہی رویہ رکھتے ہیں۔ ماں سے کہو' نماز فجر اور عصر کے بعد 7-7 تسبیح پڑھے۔

حَسْبُنَااللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیلُ ط عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا

پھر دعا کرے۔ کوشش کرے کہ بہت روک ٹوک نہ ہو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔

□ ایم حنیف' گجرات۔

o باباجی' پانچ سال ہوگئے ہیں لیکن پریشانی جانے کا نام نہیں لیتی' قرض داروں کی ایک لائن لگ گئی ہے' کچھ ایسا کریں کہ ان کے منہ بند ہوجائیں۔ پیسہ آنے پر میں خود ان کے گھر جاکر ان کا قرض ادا کردوں گا۔ مجھے تو خود بڑی فکر ہے۔ خدا سے دن رات دعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ! دنیا کا قرض دنیا میں ہی ادا ہوجائے۔ اپنے بعد تو مجھے کوئی قرض ادا کرنے والا نظر نہیں آتا' بچے بہت چھوٹے ہیں۔ باباجی' یہ سب باتیں تو ایک طرف' سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے مجھے سود جیسی لعنت میں جکڑ دیا ہے اور ہر ماہ کے آخر تک مجھے ایک لاکھ روپے بمعہ سود دینا ہے۔ باباجی' میں زندگی میں پہلی اور آخری غلطی کرچکا ہوں' آئندہ مرتے دم تک ایسی لعنت میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی بچوں کو آنے دوں گا۔ باباجی' آپ کو اس پیارے خدا اور اس کے پیارے رسولؐ کے حضور دعا کرنے کی التجا کرتا ہوں کہ اس لعنت سے' میری جان چھوٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ غیب سے کوئی مدد فرما دے۔ آپ سے خصوصی دعا کی التجا کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذریعے وسیلہ بنایا ہے۔

☆ بیٹے حنیف! جانتے بوجھتے تم نے وہ گناہ کیا جس کی بہت سخت سزا ہے۔ سود لینا اور دینا بہت سخت گناہ ہے۔ بہرحال تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو تو عہد کرلو کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروگے۔ نماز عشاء کے بعد 1100 مرتبہ پڑھو۔

رَبَّنَاالْغَفُوْرُ شَکُوْرo

اول و آخر درود شریف 11-11 بار پھر حاجت بیان کرو اور گڑگڑا کر دعا کرو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ شائستہ جبیں' لاہور۔

☆ بیٹی شائستہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ حالات بے شک بہت مشکل ہیں مگر اللہ پر بھروسہ رکھو' وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ نماز عصر کے بعد سورۃ انعام' آیات 51-50' 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ کوئی فیصلہ بھی جلد بازی میں مت کرنا' نقصان ہوگا۔ تم صرف اپنی بچیوں کا سوچو' صرف ان کی ذمہ داری پوری کرو۔ اللہ بہتر اسباب پیدا کرے گا۔

□ کنول ندیم' ملتان۔

o محترم باباجی' السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن نویں کلاس میں ہے اور نرسنگ کا کورس کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ میرے غریب والدین کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر ماں باپ کا سہارا بن جائے۔ باباجی' میری بہن کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کامیابی کے لیے دعا کریں اور اس کے لیے کوئی اچھا سا وظیفہ بھی بتا دیں۔ باباجی' ہمارے لیٹر کا جواب ضرور دینا' میں منتظر رہوں گی۔

☆ بیٹی کنول' تمہارا پہلا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ تم نماز فجر کے بعد 101 بار پڑھو۔

اَللّٰھُمَّ اَجِرنِی مِنَ النَّارِ ○

پھر دعا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔ بہن سے کہو نماز عشاء کے بعد 41 بار سورۃ فاتحہ پڑھے اور دعا کرے۔ خیال رہے' وظیفہ کے دوران حسد' غیبت اور دروغ گوئی سے مکمل پرہیز کرنا ہے۔

▯ احمد فہیم' کراچی۔

☆ بیٹے فہیم' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ بیٹے' خیال رکھو کہ نماز قضا نہ ہو۔

▯ صبوحی' بنوں۔

○ محترم باباجی' میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ میرے شوہر جس دفتر میں کام کرتے ہیں' وہ بند ہونے والا ہے۔ باباجی' اگر ایسا ہو گیا تو ہم کیا کھائیں گے اور کہاں رہیں گے؟ یہ سوچ کر میں بہت روتی ہوں مگر مسئلہ کچھ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔

☆ بیٹی صبوحی' رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو' رزق کا وعدہ اس کا ہے۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 3-3 بار سورۃ فرقان پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

▯ ضیاء اللہ' لاہور۔

☆ بیٹے ضیاء' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز عشاء کے بعد 41 بار سورۃ الناس پڑھو اور اپنے اوپر دم کرلیا کرو۔ تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم غلط کر رہے ہو تو بیٹے' وہیں رک جانے ہی میں عافیت ہے۔ تم مجھے تفصیل سے خط لکھو اور جوابی لفافہ بھی ارسال کرو۔

▯ عبداللہ خان' پشاور۔

○ باباجی' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ میرے خط کا ضرور جواب دیں گے۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں جذباتی ہو رہا ہوں یا یہ وقتی ابال ہے۔ باباجی' میں ایک لڑکی سے شدید محبت کرتا ہوں' وہ بھی مجھے بہت چاہتی ہے۔ میرے والدین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں مگر لڑکی والے بالکل بھی تیار نہیں' شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بہت پیسے والے ہیں اور ہم لوگ نہیں۔ مجھے جس نے بھی جو بتایا' میں نے وہ سب پڑھا۔ پلیز' آپ ہماری رہنمائی کیجیے تاکہ جلد از جلد یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

☆ بیٹے عبداللہ' بے شک کسی کو پسند کرنا جرم نہیں مگر یہ خیال ضرور رکھنا کہ اس سارے سلسلے میں عزتوں پر حرف نہ آئے۔ نماز پابندی سے ادا کرو اور ہر نماز کے بعد یا قادر کا بکثرت ورد کیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور بہتر اسباب پیدا ہوں گے۔

▯ جمیلہ' اسلام آباد۔

○ باباصاحب' آپ کو کئی خط لکھے مگر جواب ایک بھی نہیں مل سکا۔ آپ برائے کرم مجھے کالم کے ذریعے جلد از جلد جواب عطا فرمائیں۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہوں' نام اور مکمل کوائف ارسال کر رہی ہوں۔ بتائیے' استخارہ حق میں ہے یا نہیں؟

☆ بیٹی جمیلہ' استخارہ حق میں ہے۔ بیٹی پر سے کچھ رقم خیرات کر کے رشتہ طے کر دو۔ اگر کوئی رسم کرنے جا رہی ہو تو جون کی 3,11,21 تاریخیں مناسب ہیں۔

......☆☆......

سچی کہانیاں
MINI MAG

کتاب تبصرہ
آپ کی ڈائری
خیال آرائی
پسند اپنی اپنی
آپ کی خبر
بازگشت

WWW.PAKSOCIETY.COM

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انتخاب

اللہ ارحم الراحمین ہیں

رسول پاک کی ایک حدیث ہے کہ حشر میں ایک ایسا آدمی اللہ کی عدالت میں آئے گا کہ جس کے اعمال میں صرف ایک عمل کی کمی ہوگی تو حق تعالیٰ فرمائیں گے جاؤ اپنے عزیز رشتے داروں' بھائی 'باپ سے ایک نیکی مانگ کر لاؤ۔ اگر ایک نیکی مل جائے تو تم جنت میں جا سکتے ہو۔ وہ برادری کے پاس جائے گا' دوستوں کے پاس جائے گا' والدین کے پاس جائے گا لیکن وہاں تو نفسانفسی کی پکار ہو گی۔ کوئی اس کی نہیں سنے گا۔ نیکی نہیں ملے گی۔ وہ بے چارہ مایوس ہو کر جب واپس لوٹے گا تو ایک آدمی بیٹھا ہوگا' وہ اسے دیکھے گا کہ وہ بڑا پریشان' بڑا مضطرب آرہا ہے' تو وہ پوچھے گا کیا ہوا میاں' یہ کہے گا کہ ایک نیکی کم تھی اگر وہ مل جاتی تو جنت میں چلا جاتا لیکن کسی نے بھی نہیں دی۔ نہ بھائیوں نے نہ دوستوں نے یہاں تک کہ ماں باپ نے بھی آج نہیں پوچھا۔ تو وہ آدمی کہے گا کہ میرے پاس ایک ہی نیکی ہے' اسے تو لے جا' ایک اکلوتی نیکی سے میرا کیا بنے گا؟ وہ بڑا خوش ہوگا۔ اس سے ایک نیکی لے کر وہ رب کے پاس حاضر ہو کر کہے گا کہ مجھے نیکی مل گئی۔ مجھے جنت عطا کیجیے' حق تعالیٰ فرمائیں گے' یہ نیکی تجھے کس نے دی؟ اس آدمی کو بلایا جائے گا جس نے نیکی دی تو رب العالمین فرمائیں گے۔ آج تو ماں بیٹوں کو نہیں پوچھتی' باپ اولاد کو نہیں پوچھتا' بھائی بھائیوں کو بھول چکے ہیں' یہ نیکی تو نے کیسے دے دی؟ تو وہ کہے گا۔ اے رب العالمین! میرے پاس تو تھی ہی ایک نیکی۔ میں نے سوچا کہ میرا تو کچھ بنے گا نہیں' یہ تیرا بندہ کیوں نہ جنت میں چلا جائے۔ حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے دوسرے کا خیال کیا' جاؤ تم دونوں کو جنت میں بھیجتا ہوں۔''

سید عبدالمجید ندیم شاہ کی تصنیف ''جواہرات ندیم'' سے اقتباس

انتخاب۔ اشعر جواد' کراچی۔

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاڈلے تو ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں میں رضائی مانگے تو اس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں کیونکہ اسے ضرورت ہوگی لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اس کو گھر سے باہر نکال دو کیونکہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمیں مٹر چھیلنے پر لگا دیا۔ میں نے تھری پیس سوٹ پہن کر ٹائی لگا رکھی تھی لیکن مٹر چھیل رہا تھا حالانکہ میں نے ساری زندگی کبھی مٹر نہیں چھیلے تھے پھر انہوں نے لہسن چھیلنے پر لگا دیا اور میرے ہاتھوں سے بو آنا شروع ہو گئی پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتے اور ڈنٹھل الگ الگ کرو۔ اس مشقت سے تو اب خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زونیرا' اس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھئی یہ خط پہنچا دینا تو کہتی ہے بابا! یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی مشکل میں جانے جیسا کام شاید) میں نے کہا کہ یہ خط تو پہنچا دیتی' کہنے لگی یہ تو بابا جی بس پڑا ہی رہ گیا میرے پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے باپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈسپلن آئے۔

اشفاق احمد کی تصنیف ''زاویہ'' سے اقتباس

رضوانہ کوثر۔ لاہور۔

ترقی

قیام پاکستان کے بعد ہم نے بڑی ترقی کی ہے جس کے پاس ایک کوٹھی تھی' اس نے دو بنالیں۔ پہلے ہمارے پاس ایک پاکستان تھا ہم نے دو بنا لیے۔ یہی حال سیاسی پارٹیوں کا رہا۔ مولانا مفتی محمود صاحب ایک جمعیت العلماء اسلام چھوڑ کر گئے تو مولانا فضل الرحمان صاحب نے بڑی مشکلوں سے دو کیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے دن رات ایک کر کے ایک جمعیت علماء پاکستان سے دو بنائیں لیکن جماعت اسلامی ترقی نہ کر سکی ابھی تک ایک ہی ہے۔ سب سے زیادہ ترقی مسلم لیگ نے کی' سو اتنی مسلم لیگیں مارکیٹ میں آگئیں کہ اعلان کرنا پڑا نقالوں سے بچیے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی تصنیف ''افراتفری'' سے اقتباس

انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی' کراچی۔

سنہرے لوگ

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی۔ انہیں قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرحمٰن خان تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ انہیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آ رہی ہے پھر وہ میرے باپ سے ملنے کیوں آتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ عجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ عبدالرحمٰن خان کے آتے ہی میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھک جاتی ہیں۔ میں یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمٰن خان سے ڈرتے ہیں۔ جب ہی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ نہیں بولتے تھے۔ جب بہت دن تک یہ تماشا ہوتا رہا تو مجھ سے ضبط نہ ہوا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔ ''میاں جی آپ عبدالرحمٰن خان سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے؟''

انہوں نے میرا سوال سن کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا۔ ''بیٹا! عبدالرحمٰن خان ایک زمانے میں رئیس تھے۔ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ اس لیے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے۔'' اور جب میں آنکھوں میں آنسو بھر کر جانے لگا تو انہوں نے فرمایا۔ ''دیکھو بیٹا' میرے سر کی قسم' یہ بات کبھی زبان پر مت لانا۔''

جوش ملیح آبادی کی تصنیف ''یادوں کی برات سے'' اقتباس

انتخاب: نعیم احمد آکاش' حیدر آباد۔

باتیں اشفاق احمد کی

☆ منزل قریب آتے پر مسافر ایک دوسرے سے اور ساربان سے دور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آ جاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔

☆ جب زندہ آدمی کا اندر مر جاتا ہے تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہو جاتا ہے اور شمع زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دور دور سے اڑ کر آنے لگتے ہیں۔

☆ راستہ جب پتھریلا ہو' سورج کی تمازت تیز ہو' ہر قدم پر چڑھائی ہو تو مسافت مشکل سے طے ہوتی ہے۔

☆ سمجھوتے میں زبردستی کا عنصر ہوتا ہے' مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی' سب کچھ جانتے ہوئے سمجھوتا کرنا بڑا تاب ناک ہے مگر ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔

مرسلہ: شرجیل اقدس' جیکب آباد۔

اقوال ولیم شیکسپیئر

☆ دوستی باہم رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نام نہیں بلکہ یہ دو دلوں کے باہمی ربط کا نام ہے۔

☆ انسانیت کا زیور نیک نامی ہے۔

☆ میں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہوں۔

☆ زندگی ہر شخص کو عزیز ہے' لیکن بہادر انسانوں کے لیے عزت زندگی سے بھی عزیز ہوتی ہے۔

☆ بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہی ہے خواہ بچے کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

☆ بزدل اپنی موت سے قبل کئی بار مرتے ہیں لیکن جرأت مند لوگ ایک ہی مرتبہ مرتے ہیں۔

☆ حسین صورت' نیک سیرت کے بغیر ایسی ہے جیسے خوشبو سے تہی داماں گلاب' عقل مند انسان کبھی بیٹھ کر اپنی تکلیف کا رونا نہیں روتا بلکہ اپنی تکلیف کے تدارک میں بخوشی مصروف عمل ہوتا ہے۔

☆ خوشامد کرنے والا اور سن کر خاموش رہنے والا دونوں کمینے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

☆ عورتیں ایسی کتابیں' ایسی تصویریں اور ایسی دبستان ہیں جو تمام دنیا کی پرورش اور تربیت کرتی ہیں۔

☆ سچی محبت کے راستے میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔

☆ وہ لوگ جو اونچی جگہوں پر کھڑے ہوتے ہیں' انہیں گرانے کے لیے بہت ہی تند و تیز ہوائیں آتی ہیں۔ اگر وہ گر پڑیں تو ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

☆ دنیا آنکھوں سے نہیں دیکھتی' دل سے دیکھتی ہے' یہی وجہ ہے کہ محبت کا دیوانہ اندھا بتایا گیا ہے۔ دانش مند صرف وہی ہیں جو محبت میں اندھے نہ ہوں۔

☆ قطرہ قطرہ بھی مسلسل گراتے ہوئے رہو تو چٹان آپ کے عزم سے چکنا چور ہو جائے گی۔

☆ جب حسن بولتا ہے تو بڑے بڑے عالم اور دانش ور گونگے ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: کنول عمران خان' کراچی۔

خیال جدائی

☆ شب بخیر' شب بخیر' جدا ہونا اتنا میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی' میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)

☆ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)

☆ جدائی دل کی پیاس بڑھا دیتی ہے۔ (بیلی)

☆ جدائی بعض اوقات دوستی میں رَس گھول دیتی ہے اور اِسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (جے ہوویل)

☆ جانے والا اُن لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)

☆ ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

مرسلہ: ثانیہ بھٹی، سیالکوٹ۔

انمول موتی

☆ وقت صالح تو ہے ہی، لیکن یہ نصیب کی پرچھائیاں اپنے دامن کیوں بھگوتی ہیں؟

☆ تم تو دامنِ وقت کے سائے تلاش کرتے ہو، کبھی وقت کا دامن خود کو بھلا پائے گا؟

☆ شکستہ آرزوؤں کی پٹاریاں لیے میں اُسی رَب کے آگے جاؤں گا جس کے گھر میں داخل ہونا بھی ایک سال بعد نصیب ہوا۔

☆ وقت مرہم تو ہے ہی، دوائی لگنے کے بعد زخم آہستہ آہستہ کیوں بھرتا ہے؟

☆ اوروں کی خوشیوں میں خالی ہونے والے دامن دولت سے نہیں۔ رَبِّ کریم عزوجل کی رحمت سے بھرا کرتے ہیں۔

☆ وقت کے انمول رنگوں کی پہچان وہی کرتے ہیں جو انمول کو بے مول بنا دیتے ہیں۔

☆ محبت کے نام پہ ملا ہوا، ہوا کا جھونکا تمام تر ساعتوں سے بھاری ہوتا ہے۔

☆ تسلیم کی ہوئی غربت، مانگی ہوئی دولت سے بہتر ہے۔

☆ حاصل کے بعد جذبوں کی قدریں منجمد کیوں ہو جاتی ہیں؟

☆ اندھی خواہشیں خواب سراب سے بڑھ کر "میرا ہے۔" ہونے کا پتا دیتی ہیں۔

مرسلہ: سدرہ انور علی، جھنگ۔

عورت کیا ہے......؟

☆ عورت، ماں کے روپ میں رحمت ہے۔

☆ بہن کے روپ میں شرافت ہے۔

☆ بیٹی کے روپ میں باوفا دوست ہے۔

☆ ویرانے میں چمن ہے۔

☆ عورت محبت کرتی ہے تو بڑی مشکل سے لیکن نفرت پَل بھر میں کرنے لگتی ہے۔

☆ اندھیرے میں نور اور روشنی کی کرن ہے۔

مرسلہ: یاسمین شمعون، کراچی۔

ذرا مسکرایئے

نشانہ

ایک گاؤں میں ایک تھیٹر کمپنی آئی۔ اُس کے ایک فنکار نے وقفے کے دوران خنجر پھینکنے کا کرتب دکھانا شروع کیا۔ اُس نے اپنی ساتھی فنکارہ کے چاروں طرف آہستہ آہستہ اِس مہارت سے خنجر پھینکے کہ وہ چمکتے ہوئے خنجروں کے درمیان صحیح سَلامت رہی جبکہ کبھی کبھی تو خنجر اِس کے صرف بال برابر دور رہ جاتا۔ تمام حاضرین دم سادھے اِس مظاہرے کو دیکھتے رہے کہ ہال کے عقبی حصے سے غصے میں بھری ایک آواز ابھری۔ "بل، چلو، یہاں سے چل پڑو۔ اِس بے وقوف نے اپنا نشانہ پھر ضائع کر دیا۔"

مرسلہ: فہیم صدیقی، کراچی۔

مجبوری

"میرے امی ابو میرے لیے ایک چھوٹی سی بہن لائے ہیں۔" بچے نے اپنی ٹیچر کو بتایا۔

"کیا وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟" ٹیچر نے پوچھا۔

"ہاں، اچھی تو لگتی ہے، لیکن وہ لڑکا ہوتی تو زیادہ مزہ آتا۔" بچہ بولا۔

"تو آپ اپنے امی ابو سے کہیے کہ اُسے بدل کر آپ کو بھائی لا دیں۔" ٹیچر نے مسکرا کر کہا۔

"اَب اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔" بچے نے افسردگی سے کہا۔ "اَب تو ہم چاروں اُسے استعمال بھی کر چکے ہیں۔"

نمائندگی

امریکا کی ایک سڑک پر ایک جنازہ جا رہا تھا۔ ایک ہندوستانی کو یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ تابوت کے ہمراہ گولف کھیلنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے جنازے میں شریک ایک شخص سے دریافت کیا۔ "یہ شخص یقیناً زندگی میں گولف کا اچھا کھلاڑی رہا ہوگا؟"

"رہا ہوگا سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" اُس نے جواب دیا۔ "وہ اچھا کھلاڑی ہے، تبھی آج کا فائنل کھیلنے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا اس لیے اِس کے گولف کا سامان نمائندگی کی صورت ہمراہ ہے۔"

بلال احمد۔ کراچی۔

بدقسمتی

ایک نوآموز وکیل اپنا پہلا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ عدالت کے روبرو دلائل دیتے ہوئے وہ خاصا نروس ہو گیا۔ "مائی لارڈ، میرا بدقسمت مؤکل......" اس نے کہا اور خاموش ہو گیا، ذہن الجھ گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔ اس نے دوبارہ پھر سہ بارہ کوشش کی لیکن ہر بار وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ "مائی لارڈ، میرا بدقسمت مؤکل......" یہ دیکھ کر فاضل جج آگے جھکا اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتے ہوئے بولا۔ "کہیے کہیے جناب، رک کیوں گئے؟ یہاں تک تو عدالت آپ سے پوری طرح متفق ہے۔"

ساجدہ خان۔ کوئٹہ۔

مناسب موقع

اسٹیج ڈرامے کے دوران ایک کارندہ ہانپتا ہوا دوڑا دوڑا پروڈیوسر کے پاس پہنچا۔ پروڈیوسر اُس وقت ڈریسنگ روم میں ہیروئن کے ساتھ کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ "کیا بات ہے، اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" پروڈیوسر نے پوچھا۔

"سر، وہ ہیرو نے وِلن کو گولی ماردی لیکن وِلن نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے یہ چٹ تھما دی ہے۔" کارندے نے ایک چٹ پروڈیوسر کو دے دی۔ اُس پر لکھا تھا۔ "میرے بقایا جات پچھلے پردے کے نیچے سے چپکے سے مجھے دے جاؤ ورنہ میں گولی کھانے کے باوجود نہیں مروں گا۔"

مرسلہ: دادا مشتاق جمالی، حیدرآباد۔

خبر

ایک شیر جنگل میں سو رہا تھا کہ ایک بندر ادھر آ نکلا۔ جنگل کے بادشاہ کو سوتے دیکھ کر بندر کو شرارت سوجھی اور وہ اسے ایک تھپڑ مار کر بھاگ گیا۔ اس پر شیر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ بندر بھاگتا ہوا ایک پارک میں گھس گیا جہاں لوگ بینچوں پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ بندر نے بھی ایک اخبار پکڑا اور اُن کے درمیان میں بیٹھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا۔ اتنے میں شیر ہانپتا ہوا وہاں پہنچا اور بندر کے پاس کھڑے ہو کر بولا۔ ”تم نے یہاں کوئی بندر دیکھا ہے؟“

بندر اخبار کی اُوٹ سے بولا۔ ”تم اُس بندر کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے ہو جو شیر کو تھپڑ مار کر بھاگا ہے؟“

یہ سن کر شیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ ”کیا یہ خبر اخبار میں شائع ہوئی ہے؟“

مرسلہ: کاشف خان، پشاور۔

بزم آرائی

☆

یہ چراغ بے نظر ہے، یہ ستارہ بے زباں ہے
ابھی تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے
وہی شخص جس پہ اپنے دل و جاں نثار کردوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے
کبھی پا کے تجھ کو کھونا، کبھی کھو کے تجھ کو پانا
یہ جنم جنم کا رشتہ ترے میرے درمیاں ہے
مرے ساتھ چلنے والے، تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے، وہی غم کا آسماں ہے
میں اِسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر، مرا پیار جاوداں ہے
انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے
(بشیر بدر)

حسنِ انتخاب: قرۃ العین زینب، ملتان۔

☆

جو بھی مشکل کام تھا، کرنا اچھا لگا
اِس ندی کے پار اترنا اچھا لگا
لفظوں میں تصویر بنا کر چاہت کی
اِس میں رنگِ معانی بھرنا اچھا لگا
ہم نے دیکھا اُس کو ایک بلندی پر
اور وہاں پر اُس کا ڈرنا اچھا لگا
وہ خوشبو کی صورت آ کر پھیلا تو
ہمیں بھی اپنا اور بکھرنا اچھا لگا
جس رستے سے سارے لوگ پلٹ آئے
اس رستے سے مجھ کو گزرنا اچھا لگا
جس منظر پر دھیان کیا، وہ ڈوب گیا
میری خشک آنکھوں سے جھرنا اچھا لگا
سعد بگاڑ کی صورت اس نے پیدا کیا
جس کو بننا اور سنورنا اچھا لگا
(سعد اللہ شاہ)

حسنِ انتخاب: عائشہ اشعر، کراچی۔

☆

دیکھ کر دور اُسے ایسے پکارا میں نے
جس طرح دل میں کوئی خواب اتارا میں نے
پہلے اشکوں سے کیا درد کا صحرا سیراب
پھر تری یاد کو جنگل سے گزارا میں نے
رات بھر چہرہ ترا بھیگتی آنکھوں میں رہا
چاند دیکھا نہ میری جان، ستارہ میں نے
کیا بتاؤں ترے یک لخت بچھڑ جانے پر
کتنی مشکل سے دیا خود کو سہارا میں نے
میں جو نکلا ہی نہیں دکھ کے سمندر سے کبھی
خواب میں دیکھا ترے ساتھ کنارا میں نے
ورنہ یہ لوگ کہاں ملنے کے لائق تھے میرے
تیری خاطر کیا ہر شخص گوارہ میں نے
(فرحت عباس شاہ)

حسنِ انتخاب: اِم عادل، کراچی۔

مگر تمہیں کیا

میں آڑے ترچھے خیال سوچوں
کوئی بے ارادہ کتاب لکھوں
کوئی شناسا غزل تراشوں
کوئی اجنبی انتساب لکھوں
گنوا دوں اِک عمر کے زمانے
کہ ایک پل کا حساب لکھوں
میری طبیعت پہ منحصر ہے
میں جس طرح کا نصاب لکھوں
یہ میرے اپنے مزاج پر ہے
عذاب سوچوں، ثواب لکھوں
طویل تر ہے سفر تمہیں کیا
میں جی رہا ہوں مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کہ تم تو کب سے
میرے ارادے گنوا چکے ہو
جلا کے سارے حروف اپنے
میری دُعائیں بجھا چکے ہو
میں رات اوڑھوں کہ صبح پہنوں
تم اپنی رسمیں اٹھا چکے ہو
سنا ہے کہ سب کچھ بھلا چکے ہو
تو پھر مرے دل پہ جبر کیسا
یہ دل تو حد سے گزر چکا ہے
گزر چکا ہے مگر تمہیں کیا
خزاں کا موسم ٹھہر چکا ہے
ٹھہر چکا ہے مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کہ اِس خزاں میں
میں جس طرح کے بھی خواب لکھوں
(محسن نقوی)

حسنِ انتخاب: اشعر جواد، کراچی۔

دشواری

میں بھول جاؤں تمہیں
اَب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے، کیا کہوں
کم بخت......!
بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ ●
جو تھا ہی نہیں
وہ اِک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات
جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں
(جاوید اختر)

حسنِ انتخاب: کرن شبیر، کراچی۔

برہا کا گیت

بچھڑ کے جانے والے لوگو!
جب بھی رات کو بادل برسے
ہم کو دھیان میں لا کر اتنا روؤ کہ
آنکھوں کا کاجل
بہہ کر
سُندر گال بھگو دے
بچھڑ کے جانے والے لوگو!
جب بھی رات کو بجلی چمکے
چاہت کے سنگیت سنا کر ہمیں بلاؤ
ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں
ہر اجڑے نگر میں جاتے ہیں
اور گیت پرانے گاتے ہیں
(منیر نیازی)

حسنِ انتخاب: صائمہ شاہ، حیدر آباد۔

...... ☆ ☆ ......

WWW.PAKSOCIETY.COM

عطا تراب کا شعری مجموعہ

"بارش میں شریک"

پر تجزیاتی نوٹ

عکاشہ سحر

مجھے جب کوئی شعری تخلیق موصول ہوتی ہے تو میں اُس میں یہ چند امور ضرور تلاش کرتی ہوں...... شاعر کا پیرایۂ بیان' اسلوب میں جاذبیت' کوئی نیا پن موجود ہے! وہ کن تلازمات کے ساتھ اپنے اسلوب کو دلکش بناتا ہے؟ اور افکار و مضامین میں کہاں تک تلاش اور تنوع کا عنصر موجود ہے؟

اِس ماہ "کتاب تبصرے" کے لیے مجھے ایک بہت خاص اور اعلیٰ کتاب موصول ہوئی ہے......اور میں اس کشمکش میں ہوں کہ کیا لکھوں؟ ویسے عطا تراب کی شاعری سے میری آشنائی تو چند سالوں سے ہے۔ یہ بہت عمدہ غزل کہتے ہیں اور نظم کے بھی اعلیٰ شاعر ہیں۔

"بارش میں شریک" عطا تراب کی خوبصورت شاعری سے سجا پہلا مجموعۂ کلام ہے جسے فائزہ خان کی مصوری نے مزید دلکش بنا دیا ہے۔ عطا تراب کے قلم سے نکلے ہوئے لفظوں کو فائزہ خان نے تصویری پیرہن عطا کر کے ایک حسین امتزاج بخشا ہے۔ مصوری سے دلچسپی رکھنے والے فائزہ خان کے نام سے ضرور واقف ہوں گے' آپ بہت باکمال مصورہ ہیں۔ اِن کے بنائے ہوئے بے حد دلکش ٹائٹل کے ساتھ "بارش میں شریک" ایک نہایت خوبصورت مجموعۂ کلام ہے۔



عطا تراب کی شاعری اُن کی تخلیقی شخصیت کی مظہر ہے۔ عطا تراب کی کامیابی یہ ہے کہ وہ بڑی سہولت سے اپنی بات بیان کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اُن کی غزل اور نظم دونوں اپنے اندازِ بیان اور موضوعات کی انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ عطا جانتے ہیں کہ فنکارانہ اظہار کا حسن' سادگی اور بے ساختگی میں پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل کی جلوہ سامانیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔

عطا تراب کی غزل کے اچھوتے پن نے انہیں اپنے ہم عصر شاعروں سے نمایاں اور الگ مقام بنانے میں آسانیاں فراہم کی ہیں...... "بارش میں شریک" صرف نام کی حد تک ہی منفرد نہیں بلکہ اپنی شاعری کے لحاظ سے بھی منفرد الگ مقام کی حامل ہے۔ عطا تراب کی شاعری محض الفاظ اور اوزان کی جمع' تفریق سے حاصل ہونے والی شاعری نہیں ہے۔ اُن کی غزل اور نظم دل پر اثر کرتی ہے اور زندہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

حقائق کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ واقعاتی صداقتوں کی مظہر بھی ٹھہرتی ہے۔ وہ بیک وقت غزل اور نظم کہہ رہے ہیں اور دونوں اصنافِ سخن کے ساتھ اُن کی انصاف پسندی کا یہ عالم ہے کہ واضح طور پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر اِن دونوں میں سے کون سی صنفِ سخن میں ان کا اظہار زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ ''بارش میں شریک'' میں شامل نظمیں اور غزلیں اُن کی فنی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

☆☆

اے مری جانِ تمنا' یہ تمنا ہے مری
دامنِ کوہ میں ہم دونوں ہوں بارش میں شریک
رنگ اڑتے ہوئے دیکھے ہیں گلابوں کے تراب
وہ پری چہرہ تھا پھولوں کی نمائش میں شریک

☆☆

اُس کا بدن تھا میر کا مصرع بنا ہوا
ہم میں بھی جستجوئے معانی غضب کی تھی

☆☆

عطا تراب کی نظمیں اپنے منفرد موضوعات و مضامین' دونوں طرح سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب رہتی ہیں۔ اُن کی نظم میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی رکھ رکھاؤ اُن کی نظم کی اپنی الگ پہچان بنانے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے مناسب الفاظ کا چناؤ اور اُن کی ترتیب کو پوری دلچسپی اور سنجیدگی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانا اُن کے فن کا خاصہ ہے۔ یہ اُن کی نظم سے سنجیدہ وابستگی کا نتیجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے موضوع کو بھی چند لائنوں میں سمو کر مطلب کی بات پڑھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں۔

عطا تراب کی نظموں میں عشق و رومان کے موضوعات بھی ملتے ہیں مگر پوری نفاست اور شائستگی کے ساتھ......ایک نظم بعنوان ''ہجر کا مارا دسمبر'' ملاحظہ فرمائیے۔

تمہارے لمس کا سورج
نجانے وقت کے کس گھاٹ اترا ہے
درختوں کو دریدہ پیرہن کرتی
زمستانی ہوائیں
جب اکیلے جسم پر درے لگاتی ہیں
تمہارے ہجر کا مارا دسمبر
یوں ٹھٹھرتا ہے
کہ جیتا ہے نہ مرتا ہے

ایک اور نظم ''انتظار'' ملاحظہ فرمائیے۔

نگارِ حزن کو خبر نہیں
کہ دشتِ نینوا میں
ایک اشکِ بے نوا
ہنوز چشمِ گریہ کُن کو رو رہا ہے

''بارش میں شریک'' کی شریک فائزہ خان کی شاہکار مصوری اور ان کے نظموں کے انگلش تراجم نے کتاب کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ ''بارش میں شریک'' کا مطالعہ کرتے ہوئے میں خود کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کر رہی ہوں۔ رنگ' خوشبو اور فطری مناظر سے بھرپور ایک دلکش دنیا......مناظرِ فطرت سے گہری محبت اور وابستگی عطا تراب کی نظموں کا خاصہ ہے...... آہ کو صورتِ نغمہ بنانے والا یہ شاعر زندگی کے گہرے تاریک کھردرے اور سپاٹ مناظر کو بھی اپنے تخلیقی جمال سے رنگین کرتا چلا جاتا ہے......اور اس کے ساتھ ہی انکشاف اور کربِ ذات کا در بھی عطا تراب کی شاعری میں وا ہوتا ہے۔

''اچھی ہوں نا!!'' اس نظم میں کرافٹ کی بلندی دیکھیے!

ہم جو طوافِ حسن کو آئے
سمتِ سفر ہی بھول گئے ہیں
آنکھوں کے گرد اتنے گہرے
کالے حلقے!
''اچھی ہوں'' کا کیا مطلب!
ہاں!!
سکھ کی گہری سانسیں اور بھرپوری نیند
ان کے لیے بھی وقت نہیں ہے!
اتنا بھی کیا لکھنا پڑھنا!
ایسی بھی کیا خانہ داری!

مجھے نظم کے حوالے سے عطا تراب کی فکر اور انفرادیت نے بہت متاثر کیا ہے۔ عطا کی کچھ نظموں میں زمانے کی مادیت پرستی' خود غرضی' منافقانہ رویہ' تنگ نظری' سماجی شکست و ریخت کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔

''خود سوزی کی ایک خطا''
ساٹھ روپے کا
ایک کھلونا
لختِ جگر کو
دے نہ سکا تو
غربت مارے
باپ نے آخر
طیش میں آ کر
اسی روپے کے
سگریٹ پھونکے

عطا تراب کی نظمیں جہاں اُن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں' وہاں عصری حالات اور اُن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کی سماج کی سچی تصویر کی صورت عکاسی بھی کرتی ہیں۔ وہ جبر و استحصال کے ایک ایک جزو پر گہری نظر رکھتے ہیں...... یہ جبر مظلومیت کے کیسے کیسے دکھ بکھیرتا ہے!

''غیرت کے نام پر''
ستم ظریف عہد ہے
سگانِ کم نژاد
بھیڑیوں سے رابطوں کی
تہمتیں لگا کے
آہوانِ خوش جمال
کا شکار کر رہے ہیں
اور منصفی سے اب تلک
شعور کی وہ منزلیں ہی طے نہیں ہوئیں
کہ جن کے بعد
خوف و حرص سے گھٹی
گواہیوں سے پار دیکھنے کی ریت ہو
سو قاتلوں کو منصفوں سے
رحم کی امید ہے
کہ ناک کے لیے رگِ حیات کٹ گئی تو کیا
ستم ظریف عہد ہے
یہ بدنصیب عہد ہے

ان نظموں میں جن مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے' ہم ان کے بارے میں بخوبی جانتے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تصویر کا جو رخ وہ دکھاتے ہیں' ہم اس پر کھل کر بات کرنے سے نہ جانے کیوں گریز کرتے ہیں......؟ شاعر کے زیرِ تصرف ہر لفظ چاہتا ہے کہ اُس کے وجود کی پوری طرح پذیرائی ہو۔ تخیل کی ندرت اور اظہار کی جدت کا امتزاج عطا تراب کے کلام کا خاصہ ہے۔ اُن کی غزل کی کامیابی کی دو بنیادیں ہیں...... پہلی خوبی یہ ہے کہ ان کی تربیت غزل کی اعلیٰ اور زندہ روشنیوں میں ہوئی...... اور دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کی بلا کی انفرادیت اجتماعی شعور سے بے نیاز نہیں ہے۔ عطا تراب ایسے کامیاب اور خوش نصیب شاعر ہیں کہ ان کے مشہور شعر ہماری اعلیٰ غزل گوئی کے تنقیدی معیار پر پورے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اترتے ہیں۔ دراصل یہ امتیاز ایک اچھے شاعر کی پہچان ہے۔

☆☆

ایوانِ صدر میں یہ صدا تھی فقیر کی
ہم لوگ مانگتے ہیں مگر لوٹتے نہیں

☆☆

کتنی بے صبر ضرورت تھی کہ اس گھر کے لوگ
بیچ آئے ہیں شجر کاٹ کے پھل سے پہلے

☆☆

یہاں ہماری ریاضت بھی رائیگاں ٹھہری
یہ عہد' عہدِ تجارت ہے' کیا کیا جائے

☆☆

سماجی لحاظ سے عطا تراب کی شاعری میں ان دکھوں کو نظم کیا گیا ہے جو وہ اپنے اردگرد دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ یہ دکھ منظروں کی صورت میں بھی ہیں اور لفظوں کی صورت میں بھی...... وہ ان مسائل کو بیان کرتے ہوئے کئی ایک سماجی حقائق کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ اُن کے شعروں میں بہت سے سوال ہیں!!

تو ہی لب کھول وہ کس سمت میں بھاگے دریا
پیچھے سیلاب ہو جس شخص کے آگے دریا
ہم پہ سیلاب نے شب خوں تو نہیں مارا تھا
جرم اپنا ہے کہ ہم دیر سے جاگے دریا
اس لیے دشت میں پانی کا گماں ہوتا ہے
لوگ کہتے ہیں یہاں بہتا تھا آگے دریا
ایسی تقسیم پہ شکوہ تو ضروری ہے تراب
سو گئے قحط زدہ لوگ تو جاگے دریا

☆☆

عطا تراب کی نظم "سیلاب میں گھرے یتیم بچے کی روداد" کی چند لائنیں ملاحظہ فرمایئے اور دکھ درد کی شدت کو دل سے محسوس کیجیے!

رخصت ہوتی ماں نے مجھ سے اتنا کہا تھا
رونا مت!
رونے سے سیلاب کا پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے
ماں کا حکم تو سر آنکھوں پر
لیکن یہ سیلاب کا پانی!!!!

☆☆

غزل کی روایت ہماری تہذیب کی مضبوط روایت ہے۔ اردو غزل کی ابتدا سے فیض و فراق تک ہر سچے شاعر نے غزل کی مقررہ لفظیات میں اپنی انفرادیت کے نقش ابھارے ہیں۔ عطا تراب کی غزل کا منفرد انداز ہی غزل کی خوبصورتی ہے...... عصری حقیقتوں کا ادراک' معاشرتی مسائل کی عکاسی' غزل کا خالص رومانی اسلوب کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کی غزل وسیع کینوس کی غزل ہے۔ عطا تراب اپنے عہد کی شعری روایات' جمالیات اور ادبی تحریکات کے رمز شناس ہیں' انہوں نے اپنی غزل میں وہ سارے نقوش ابھارے ہیں جن میں ان کا عہد کروٹیں لیتا ہے...... عطا کے ہاں غزل اپنے سارے لوازم کے ساتھ آئی ہے اور کتنے ہی جہانوں کو اپنے باشعور قاری پر منکشف کرتی ہے...... عطا تراب کا قافلۂ فکر رواں دواں ہے اور ان کی غزل کو ابھی اور جہانوں میں سفر کرنا ہے......!

زندگی عشق میں آسان بھی ہو سکتی ہے
میری قاتل ہی مری جان بھی ہو سکتی ہے
اس محبت کو جو ایمان سمجھتی ہے تراب
اس محبت پہ پشیمان بھی ہو سکتی ہے

☆☆

میں نے تو خواب میں یہ حقیقت بھی دیکھ لی
سورج بجھے ہوئے ہیں گریبانِ وقت میں
جو گرد بادِ غم میں کہیں کھو گئے تراب
وہ پل ملیں گے خاک بیابانِ وقت میں

☆☆

موت اب ناگزیر ٹھہری ہے
زہر جیون کا پی چکا ہوں میں

☆☆

شدتِ غم سے کیا رقص تو اڑ اڑ کے پڑی
عشق میں گریہ کناں میر کے دیوان پہ خاک

عطا تراب کے اشعار آفاقی صداقتوں کی خبر دیتے ہیں' وہ سچائی کے طلب گار اور حسنِ باطنی کے پرستار ہیں' وہ اپنے عہد کے المیوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ان کی شاعری اپنے عہد کا ایک "دل سوز نوحہ" بن جاتی ہے۔

تدریجی نسل کشی
دھواں دھواں ہے زندگی
نفس نفس میں زہر کے ہیں ذائقے گھلے ہوئے
یہ خودکشی عجیب ہے
کہ اپنی آتی نسل کی ہیں مرگ پر تلے ہوئے

☆☆

عطا تراب کا اسلوب ہم عصر شعراء سے مختلف ذائقہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو پہلے ایک خاص فطری ماحول میں لے جاتے ہیں اور پھر اس کے جذبات و احساسات کو اپنے لفظوں کا اسیر کر لیتے ہیں۔

☆☆

افسوس' مانگ بیٹھا دُعا میں سکون کی
حد ہو گئی ہے آج تو اپنے جنون کی

☆☆

عطا تراب نئے سے نئے مضامین کو باندھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے' ان کی شاعری میں فارسی تراکیب اور رکھ رکھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ "بارش میں شریک" میں شامل غزلیات کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ مترنم بحور کے ساتھ ساتھ الفاظ کے صوتی اثرات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔

اب ترے لوٹ کے آنے کی کوئی آس نہیں
تو جدا مجھ سے ہوا آنکھ سے آنسو کی طرح
اب ہمیں اپنی جہالت پہ ہنسی آتی ہے
ہم کبھی خود کو سمجھتے تھے ارسطو کی طرح
ہاں' تجھے بھی تو میسر نہیں تجھ سا کوئی
ہے ترا عرش بھی ویراں مرے پہلو کی طرح

☆☆

عطا تراب کی نظمیں وجودی صورت حال' عصری اور سماجی حقائق کی ملتی جلتی کیفیات کا تلخ اور شدید اظہاریہ ہیں۔ نظموں کی قرات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ "بارش میں شریک" کے خالق نے طویل فنی و فکری سفر طے کیا ہے۔ ان کے لفظی اور فائزہ خان کے تصویری پیکر بہت باکمال ہیں۔ عطا تراب کا طرزِ شاعری ایسے الفاظ و تراکیب کی مدد سے اپنی تکمیل کرتا ہے جن میں تاثیر بھری ہوئی ہے مثلاً......!

میں اپنی حوا
سے کب کہوں گا
کہ تجھ سے نادم
ہے تیرا آدم

☆☆

"تعارف"
تراب تم بھی عجیب مشکل سے آدمی ہو
کہ کوئی کتنا ہی خوبصورت ہو
کوئی کتنا ہی دلربا ہو
کہ کوئی چاہے ہزار جانیں
تمہارے دل پر کرے نچھاور
پر ایک مدت سے بڑھ کے تم نے
کبھی محبت نہیں نبھائی
تراب تم بھی عجیب مشکل سے آدمی ہو

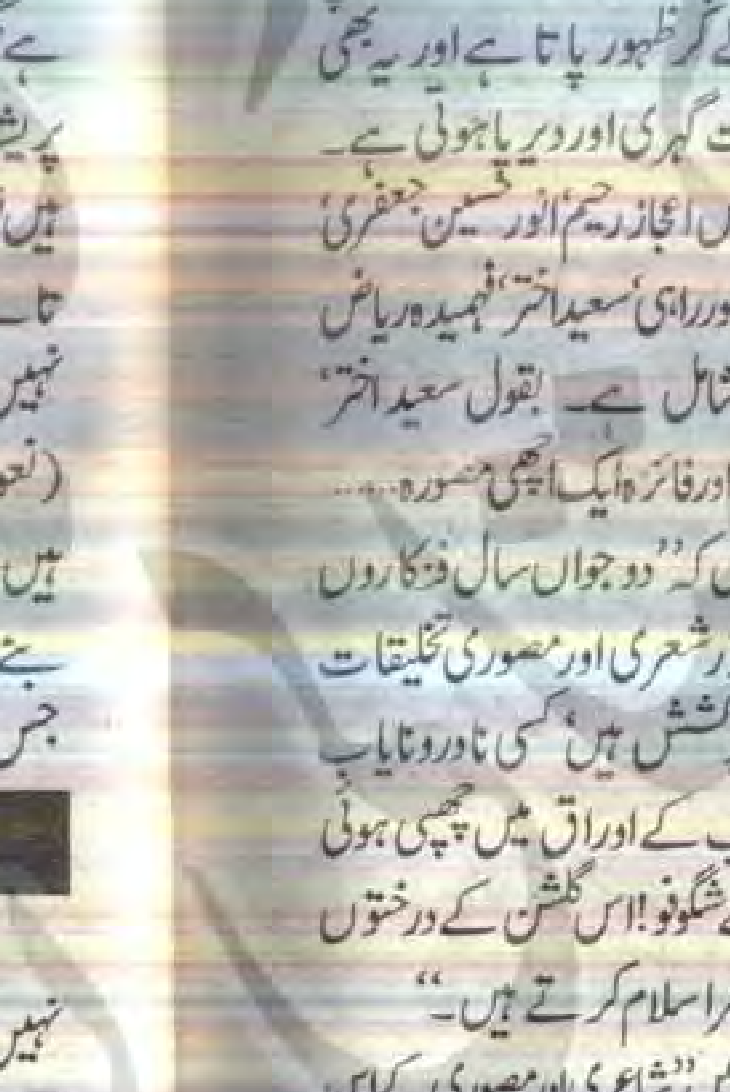
☆☆

عطا تراب کے ہاں حساسیت' ظلم کے خلاف

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈاکٹر نگہت نسیم کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

مٹی کا سفر



شائع ہو گیا ہے

ایک ایسی مصنفہ جو مسیحا بھی ہے اور تخلیق کار بھی......

دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے آباد افسانے جو اپنی مثال آپ ہیں۔

کتاب ملنے کا پتہ

مثال پبلشرز

رحیم سینٹر۔ پریس مارکیٹ۔ امین پور بازار۔ فیصل آباد

(Contact No. 0300-6668284)

بلند آواز، ہجر و وصال اور حوصلہ مندی کے موضوعات ملتے ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں اور حساس دل کے تانے بانے سے شعر کا سراپا تخلیق کرتے ہیں لیکن ان کا یہ لہجہ زرخیز زمینوں سے اپنے شعری آہنگ کے سچے مفاہیم اور نئے رنگ لے کر ظہور پاتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تاثیرِ غم بہت گہری اور دیرپا ہوتی ہے۔

''بارش میں شریک'' میں اعجاز رحیم انور حسین جعفری، مبینہ زبیری، شیما کرمانی، منصور راہی، سعید اختر، فہمیدہ ریاض اور فتح محمد ملک کی رائے شامل ہے۔ بقول سعید اختر ''تراب ایک اچھا شاعر ہے'' اور فائزہ ایک اچھی مصورہ......

فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں کہ ''دو جواں سال فنکاروں کی جرات مندانہ اور طاقتور شعری اور مصوری تخلیقات جو دل کو چھو لینے والی اور پرکشش ہیں، کسی نادر و نایاب خزانے کی طرح اس کتاب کے اوراق میں چھپی ہوئی ہیں، خوش آمدید! بہارِ نو کے شگوفو! اس گلشن کے درختوں کے برگ و بار تمہیں محبت بھرا اسلام کرتے ہیں۔''

شیما کرمانی کے لفظوں میں ''شاعری اور مصوری کے اس امتزاجی مجموعے کو دیکھتے ہی جو پہلی چیز ہمیں چونکاتی ہے، وہ اس کتاب کا عنوان ہے۔ میرے نزدیک بارش، زندگی، تجدید اور تسلسل کا استعارہ ہے جو کہ کتاب میں دلچسپی لینے پر اکساتا ہے کیونکہ ہر کوئی اس بارش میں شریک ہونا چاہتا ہے۔''

آخر میں عطا تراب کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیے۔

''شاید میری آخری نظم''

موت وہ آخری حسینہ ہے
جس کی آغوش میں عطا مجھ کو
ایک بھرپور نیند چاہیے ہے
زندگی اور مجھی محبت دے
خودکشی کی مجھے اجازت دے

☆☆

بہت سی دُعائیں عطا تراب کے شعری تخیل کے نام!!

......☆☆......

ہم کیا ہیں؟

تنویر خالد، تحصیل میلسی

میرے خیال میں، ہم ایک ناتواں تماشائی کی طرح ہیں ایک ایسا تماشائی جس کے سامنے سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے مگر وہ خاموشی سے بس دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب یہ کوئی 23 مارچ کا دن تھا، میں نے جب اخبار اٹھایا تو حیران پریشان دیکھتا رہا۔ امن کا پیغام دینے والے جو کہتے ہیں کہ ہم خطے میں امن لائیں گے، جب خود ایسا کام کرتے ہیں تو امن کہاں سے آئے گا۔ اخباری تصویروں میں امریکی فوجی افغانی باشندوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں پر گن تانے کھڑے ہیں اور عورتوں سے بدتمیزی کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ یہ تو صرف چند تصویریں تھیں اور پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہوگا جس سے ہم بے خبر ہیں؟ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ امریکی فوجیوں نے قرآنِ پاک (نعوذ باللہ) جلا دیا ہے مگر ہم نے کیا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں اور اگر پوچھا جائے تو کہتے ہیں کہ یار، ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو ڈوب مرنا چاہیے ایک طرف تو امریکی اتنا کچھ کر رہے ہیں، دوسری طرف ہم ان کے اتحادی بنے ہوئے ہیں۔ سلالہ چیک پوسٹ پر اچانک حملہ میں ہمارے 24 جوان شہید ہو گئے۔ ہم بھینس کی طرح ہیں جس کے سامنے حکمران بین بجاتے رہتے ہیں اور ہم سر چلاتے رہتے ہیں، بس یہ ہیں ہم!

محبت نعمت ہے

ثانیہ بھٹی، سیالکوٹ

محبت کیا ہے؟ ہر انسان محبت کو اپنے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، میری نظر میں محبت ایک نعمت ہے جو ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی۔ موبائل فون پر ہونے والی محبت، محبت نہیں ہوتی، عزت کو روندنے والی محبت، محبت نہیں ہوتی، دلوں کو توڑنے والی محبت، محبت نہیں ہوتی۔ محبت ہر ہوس، گندگی، برائی، لالچ سے پاک ہوتی ہے۔ محبت ایک ایسا حصار ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا، محبت میں دل بس محبوب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ محبت جسم سے نہیں، روح سے ہوتی ہے۔ محبت جب انتہا کو پہنچ جائے تو 'عشق' کا روپ دھار لیتی ہے۔ محبت کے بہت روپ ہیں۔ سب سے پیاری محبت خدا سے محبت ہے پھر ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ کی محبت اور پھر ماں باپ کی محبت۔ کہتے ہیں کہ محبت قربانی مانگتی ہے، ہاں، یہ سچ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے نفس کو مارنا محبت ہے۔ اپنے ماں باپ کی عزت اور رضا کے لیے کسی کو چھوڑنا بھی محبت ہے۔ پر یہ قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔ اللہ صلہ ضرور دیتا ہے لیکن یہ محبت آئے کہاں سے؟ ہم قربانی دیں کیسے؟ میں نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ محبت ''نعمت'' ہے جو سب کو عطا نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ذرا سوچیے

وقاص عمر، بنگڑ نو، ضلع حافظ آباد

ہمارے ارد گرد روز ہر طرح کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ تمام لوگوں کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے۔ ایسے واقعات کا ہونا کوئی خاص بات نہیں، خاص بات یہ ہے کہ ہم لوگ خود غرضی، مفاد پرستی اور بے حسی کی انتہا کو چھو رہے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ چکا ہے، ہر طرف افراتفری کا عالم ہے، سب ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں، نفسانفسی کے اس دور میں کسی کو کسی کی پروا نہیں، جس سے مطلب ہے، جس سے کوئی غرض ہے، وقتی طور پر وہی سب کچھ ہے۔ ہر شخص اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ افراتفری کے اس دور میں کسی کے پاس اتنا وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی نہیں کہ کسی کو دو بول محبت کے ہی کہہ سکے۔ چہرے پہ چہرے بدلتے لوگ کیا جانیں محبتوں کے رشتے کیسے ہوتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی' لوگ صرف دولت' شہرت سے محبت کرتے ہیں' حسن کے پجاری' جسموں سے کھیلنے والے کیا جانیں دل کیا ہوتا ہے۔ کاش' کوئی اندر کے دکھ بھی بانٹ لیتا۔ بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ملتے ہیں جو کسی کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ انسان میں صرف لالچ اور مکاری بھر گئی ہے' ہر چیز کھوکھلی ہوگئی ہے' رشتوں کی پہچان ختم ہوگئی ہے' لوگ زندگیوں سے کھیلتے ہیں اور دلوں کو کھلونا سمجھتے ہیں' پتا نہیں' انسان ایسا کیوں کرتا ہے؟ شاید اپنی انا کے لیے؟ لیکن میری دُعا ہے کہ ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوں' نفرتوں کے جال نہ ہوں' محبتیں عام ہو جائیں' دکھ درد ختم ہو جائیں' سبھی ایک ہو جائیں اور ایک دوسرے کے غموں کو بانٹ لیں' اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ ذرا اس بارے میں سوچیے گا۔

ڈرامہ بازی

کرن شبیر' کراچی

موجودہ دور میں ڈراموں کی بھرمار ہے لیکن ڈراموں کا معیار پست سے پست تر ہوتا جارہا ہے۔ آج سو' ڈیڑھ سو اقساط پر مبنی طویل ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں جنہیں ''ڈیلی سوپ'' کا نام دیا جاتا ہے مگر ان کے آغاز اور اختتام کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ کہانی غیر منطقی انداز سے آگے بڑھتی ہے' ڈرامہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ڈرامے کو بڑھانے کے لیے غیر ضروری مناظر کا سہارا لیا جاتا ہے جن سے کہانی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جبکہ بعض اوقات تو کہانی کا ہی پتا نہیں چلتا۔ ڈرامے اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ ایک کردار کو کوئی دوسرا اداکار کرنے لگتا ہے۔ کیبل ٹی وی کی وجہ سے غیر ملکی چینلز کی بھرمار ہوگئی ہے۔ پڑوسی ملک کے ٹی وی ڈراموں میں کوئی مقصد کی بات نظر نہیں آتی۔ گھریلو سازشوں' ساس بہو کے لڑائی جھگڑے' فیشن' فحاشی' بے راہ روی سے آراستہ یہ ڈرامے ہماری نسل کے اخلاق و کردار کے بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔ ان میں کوئی مثبت پہلو نظر نہیں آتا۔ ذہنوں پر غلط اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کی تقلید میں ہمارے یہاں بھی ایسے ہی بے سرو پا ڈرامے بن رہے ہیں۔ ڈرامے انہیں کہا جاتا ہے جو فن کے معیار پر بھی پورے اتریں اور اخلاق کے معیار پر بھی اور جنہیں پوری فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہ ہو۔

میری ساتھی

شیخ معظم الٰہی' لاہور

میری ساتھی' میری ہم سفر' ہر طرح کا ساتھ دینے والی شاید کوئی دنیا میں ہوگی۔ اتنی سادہ' شرمیلی میں نے آج تک نہیں دیکھی' میری ساتھی کی دہکتی رنگت' خوبصورت مسکراہٹ اور نیلاہٹ مائل سبز جھلک دیتی آنکھیں کسی بہت ہی اچھے فوٹوگرافر کے کمالِ فن کا نمونہ تھیں۔ اس کے سیاہ لمبے بال کمر سے نیچے تک لہراتے تھے' وہ جوڑا باندھ کر نکلتی تھی' بے حد سادگی میں اس کا حسن اور بھی انوکھا ہو جاتا۔ وہ ہر روز تیار ہوکر آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر فخریہ اپنا جائزہ لیا کرتی تھی۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی' اس کے نزدیک میک اپ قدرتی حسن کی توہین تھا۔ اس کا لباس بھی سادہ ہوا کرتا تھا' بعض اوقات میک اپ نہ کرنے اور جدید فیشن کے لباس استعمال نہ کرنے پر اس کا خوب مذاق اڑایا جاتا تھا مگر اس نے کبھی بھی اس مذاق کا برا نہیں منایا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ میں دو سو برس پرانی عورت ہوں' مجھے اس کی یہ بات اچھی لگتی تھی کیونکہ سادگی میں جو بات ہے' وہ فیشن میں نہیں ہے۔ سادگی کا اپنا حسن ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ 16 اکتوبر 1996ء کو میری ساتھی' میری ہمدرد شریکِ حیات کا جب انتقال

ہوا تو وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی سوئی ہے' تھوڑی دیر کے بعد وہ جاگ جائے گی۔ میں ہمیشہ اُس کے لیے دُعا گو رہوں گا اور اسے کبھی بھلا نہ پاؤں گا۔

نماز

سہیل خان' کورنگی

نماز جنت کی کنجی ہے۔ جس نے نماز کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا تو میرا ایمان ہے اللہ بھی اُس بندے پر اپنی مہربانیاں فرماتا ہے اور اللہ اُسے اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں کرتا۔ نماز کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ن سے نبیؐ م سے محمدؐ الف سے اللہ ز سے زندگی یعنی اللہ نے اپنے نبیؐ اور محمدؐ کو ہماری زندگی میں نماز کی صورت شامل کر دیا ہے۔ جب یہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اُس بندے کی زندگی ہی سنور جائے گی۔ وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو گیا کیونکہ جب بندے کو اس دنیا سے اٹھایا جائے گا تو سب سے پہلا سوال نماز کا ہی ہوگا۔ نماز ہی پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل ہے۔ نماز ہی سب بیماریوں کا علاج ہے۔ نماز ہی کے ذریعے بندہ اپنے رَب سے مخاطب ہوتا ہے اور اللہ اسے سب پریشانیوں سے نجات دے دیتا ہے کیونکہ نماز پڑھنے سے بندہ پاک ہوتا ہے اور اُس کی موت بھی اچھی حالت میں ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے سے آدمی کی ورزش بھی ہو جاتی ہے جو کہ صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔ میں جب سے نماز کا پابند ہوا ہوں' اللہ نے مجھے پریشانی اور غموں سے دور کر دیا ہے۔ ہمت اور توانائی دی ورنہ جو غم مجھے ملے ہیں' اگر میں نماز کا پابند نہ ہوتا تو آج ریت کی طرح بکھر چکا ہوتا۔ جب بچہ تھا تو میں نے جوان باپ کا جنازہ اٹھایا جو ٹی بی کی بیماری میں انتقال کر گئے۔ جب جوان ہوا تو جوان بھائی کا جنازہ اٹھایا جو کینسر کا شکار بنا۔ میرا ایک ہی بھائی تھا' جب بڑھاپے میں قدم رکھا تو جوان بیٹا جو کہ ایک ہی ہے' ایب نارمل ہو گیا جو کہ نہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا ہوں اور اپنے ہی ہاتھ سے باتھ روم اٹھا کر لے جاتا ہوں۔ ہر وقت اس کے لیے سوچتا ہوں مگر نماز نے نہ تو مجھے کبھی مایوس کیا نہ اکیلے پن کا احساس ہونے دیا کہ میرا کوئی سہارا نہیں ہے' نہ کبھی یہ کمی محسوس ہوئی۔ خدا کی قسم! یہ نماز کی طاقت تھی جس نے میرے حوصلے بلند کیے اور اللہ پر یقین رکھا۔ جب بھی یہ چیزیں آئیں' نماز کا سہارا لیا اور رو رو کر اللہ سے دُعا مانگی اور اللہ نے وہ دُعا پوری کی اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے جب بھی دُعا مانگی اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ اگر میرے رَب نے مجھے غم دیئے تو صبر بھی اس نے ہی دیا۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ نماز ہی میرا سہارا ہے لہٰذا نماز کو اپنی زندگی میں شامل کرلو گے تو انشاء اللہ آپ کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔ نماز پڑھنے سے ایمان مضبوط ہوتا ہے اور اللہ پر یقین پکا ہوتا ہے۔ اگر میری تحریر میں کہیں غلطی ہوگئی ہو تو اللہ مجھے معاف کرے کیونکہ میں کوئی لکھاری نہیں ہوں جو میرے دل میں ہے اور جو میں نے نماز میں پایا' وہ لکھ دیا۔ بس میری اللہ سے دُعا ہے کہ میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا اثر کسی ایک پر ہو جائے تو میرے لکھنے کا مقصد پورا ہو جائے۔

ایک انسان' دو رخ

محمد آصف ریاض' ملت کالج

دورِ حاضر کا انسان تھکا تھکا' اداس' بوجھل' مایوس و بے زار دکھائی دیتا ہے جیسے اس دنیا میں اُس کے لیے کوئی کشش نہیں' محض اداسیاں اس کا مقدر ہیں۔ یہ اداسیاں دراصل طویل محرومیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ایک بچہ جسے کھلونوں کی خواہش ہے' ان سے مسلسل محرومی اسے اداس کر دیتی ہے۔ وہ کبھی کبھی خوش بھی دکھائی دیتا ہے لیکن اندرونی طور پر ایک آہ کا بیج اس کے من میں پھوٹ چکا ہوتا ہے۔ جوں جوں وہ زندگی کی منازل طے کرتا جاتا ہے'

WWW.PAKSOCIETY.COM

بے شمار ایسی خواہشات اس کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہیں اور خواہشات کا وہ ننھا سا پودا ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ خواہشات نے موجودہ انسان کو کچھ زیادہ ہی اپنی غلامی میں لے لیا ہے وہ بغیر کسی کوشش کے اپنی ہر خواہش کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس نے اپنی خواہشات کو اتنا وسیع کرلیا ہے کہ وہ انہی کی تکمیل میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ موجودہ انسان الہ دین کے چراغ کا تمنائی ہے تاکہ صرف رگڑنے سے جن کو حاضر کرلے اور جھٹ پٹ اپنی خواہش اس پر ظاہر کردے۔ ہوسکتا ہے، کبھی ایسا بھی ہو کہ چراغ کو رگڑنے کے لیے بھی اسے ایک نوکر کی ضرورت ہو۔ ایک انسان نے دوسرے انسان کا سانس لینا بھی دوبھر کردیا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی آرزو کی تکمیل کی فکر میں گھل رہے ہوتے ہیں۔ ایک عجیب سا معیار سب لوگوں نے اپنا لیا ہے۔ ان چمکتے اور سجے بنے چہروں کو زرق برق لباس زیب تن کرنے والوں کو اونچے لوگ خیال کرکے اُن پر دل و جان نچھاور کیے جاتے ہیں جبکہ خود یہ چمکیلے چہرے نجانے کتنے غم تہہ در تہہ اور کتنی آرزوئیں ناتمام دل میں چھپائے پھرتے ہیں۔ سادگی ایک لفظ ہے جو کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک سادہ لوح اور سادگی پسند شخص کے لیے اس معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ اس کے سادہ لباس کو دیکھ کر یہ بناوٹی چہرے اس پر دل ہی دل میں قہقہے لگاتے ہیں اور آنکھوں سے طنز کے ایسے تیر چلاتے ہیں کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی محفل میں جانے کے لیے چہرے کو میک اپ کی اتنی تہوں تلے چھپا دیا جاتا ہے کہ اصلی چہرہ ناقابلِ پہچان ہو جاتا ہے اور جب تک شریکِ محفل رہیں، قہقہوں پر قہقہے لگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا جاتا ہے۔ عجب احمقانہ باتیں سنا کر دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پھر یہ مصنوعی قہقہے لگانے والے جب گھروں کو لوٹتے ہیں تو ان قہقہوں کا حساب رات کے اندھیرے میں آنسوؤں سے چکاتے ہیں۔ ان اشکبار آنکھوں سے غموں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہری و باطنی انسان میں کوسوں کا فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔ بیرونی انسان ہر لمحہ خوش و شادماں اور بے فکر سا دکھائی دیتا ہے جبکہ اندرونی انسان بے شمار دکھوں کا بوجھ سہتے سہتے ختم ہو جاتا ہے۔ غریب کو غربت پریشان کیے ہوئے ہے تو امیر کو دولت میں اضافے کی فکر چین سے سونے نہیں دیتی۔ ایک بے چینی کی لہر ہے جو ہر ذی روح میں سرایت کرگئی ہے۔ اوپر سے خوش اور اندر سے افسردہ، یہ انسان آخر کب تک زندگی کے شب و روز اسی طرح بسر کرتا رہے گا، کب تک؟؟

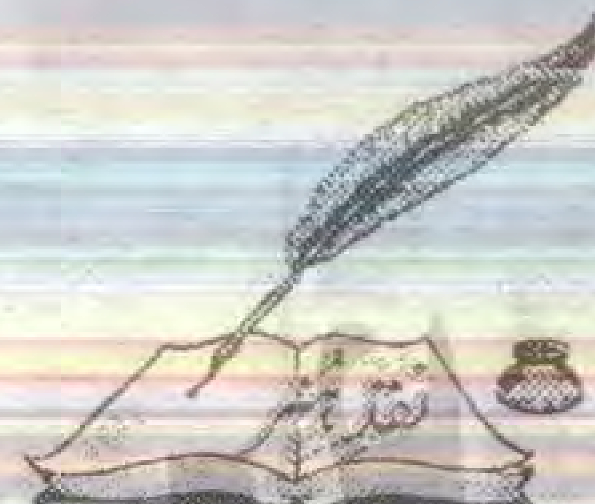
میٹھے بول کا جادو

مہر نسیم، اسلام آباد

جس طرح کوئی بھی میٹھی چیز زبان کو اور سارے منہ کو شیریں کردیتی ہے، اسی طرح انسان کی زبان سے نکلے میٹھے بول اردگرد کے ماحول کو امن اور محبت کا گہوارہ بنا دیتے ہیں۔ ہماری زبان سے نکلنے والے چند پیار بھرے جملے کسی بھی انسان کی زندگی کو خوشگوار اور حسین بنا سکتے ہیں۔ ایک بلکتے ہوئے انسان پر میٹھے بول جادو کا اثر کرتے ہیں، کسی بھی اداس انسان کی زندگی کو جگمگا سکتے ہیں۔ خدارا! اپنی زبان سے زہر آلود جملے نہ نکالیے۔ میٹھے بول ہی کسی کی زندگی کو بچا سکتے ہیں، کسی کو زندگی دے سکتے ہیں، کسی کی زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کرسکتے ہیں، یہ معمولی معاملہ نہیں ہے، معمولی بات نہیں ہے۔ آج اگر میٹھے بول کے جادو کا اثر جان لیں تو معاشرے سے آدھی سے زیادہ برائیاں ویسے ہی ختم ہو جائیں گی کیونکہ اکثر مسائل اس زبان کے سبب ہی پیدا ہوتے ہیں۔

؎ زباں شیریں، ملک گیری
محبت فاتح عالم

......☆☆......



چرانہ لینا

خدا کے لیے نہ اب تم
چرا کے جانا
وہ خواب جس کو کسی نے دیکھا
ہمارے پرکھوں نے تعبیر ڈھونڈی
لہولہان تم نے تعبیر کردی
مگر خدا کے لیے بچانا
کہ خواب سچا
کہ خواب ورثہ
تم اس خواب کو اب چرا نہ لینا

علی آذر۔ کراچی۔

میں اور......!

میں اور میری تنہائی
اور ساتھ ہوتی ہیں
تیری یادیں
زندگی کے اس طویل سفر میں
آنسو کہیں رکتے نہیں
ساری رات
اور پھر صبح کا آغاز ہوتے ہی
دل کو بے چینی ہونے لگتی ہے
پھر شام...... اداس شام......!
ڈھلتے ڈھلتے تڑپاتی ہے
رلاتی ہے، دل کو جلاتی ہے
اور پھر وہی
میں اور میری تنہائی ہوتی ہے!

مور شاہد حسین، کراچی۔

چہرے

لاتعداد چہرے!
جیسے تھکن زدہ یہ جزیرے
ان چہروں پر بہتے گہرے دکھ......
لہروں کی صورت سانس لیتے ہیں!

شفق شیخی، سیالکوٹ۔

سنو......!

سنو، تم سے کچھ کہنا ہے
مگر ڈرتا ہوں
کہہ نہیں پاتا
تجھے دیکھوں تو یوں لگتا ہے
چاند اس دھرتی پر اتر آیا ہو جیسے
تیری باتوں کی خوشبو سے
میرے دل کا آنگن مہکتا ہے
یہ سب تم سے کہنا ہے
بہت پیار ہے تم سے
یہ کہہ نہیں پاتا
کیونکہ
مجھے ڈر ہے
ٹھکرائے جانے کا......

ممتاز احمد، سرگودھا۔

پھول

ایک پھول مرجھایا تو کیا
فضا نے کسے بخشا ہے
دوسرا ابھی آیا تو کیا......!

WWW.PAKSOCIETY.COM

جگنو

تیری یاد کا جگنو جب جگمگاتا ہے
زہر بنتا ہے رگوں میں لہو
دل ٹھہر سا جاتا ہے

جاوید عثمان زندانی۔ کراچی۔

کیوں!

ناجانے کیوں؟
وہ لوگ ریت کی طرح
ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں
جن کو ہم زندگی سمجھتے ہیں
کبھی کھونا نہیں چاہتے!

لیلیٰ مردہ اقبال۔ سیالکوٹ۔

کتنا آسان ہے

کتنا آسان ہے
برے دنوں کا آ جانا
اچھے وقت کا بدل جانا
محبتوں کا نفرتوں کے خوف سے
سمٹ جانا
اور......!
محفلوں کا تنہائیوں میں
بٹ جانا
دلکش مناظر کا یوں
چلتے چلتے رک جانا
محبت سے جدائی کا جیت جانا
اور
پیار کے حسین دور کا بیت جانا
کتنا آسان ہے
کتنا آسان ہے

ارباب قربان علی اریٰ بھاگ شہر آباد

وہ مجھے یاد نہیں کرتا
ہاں مگر
یہ بھی سچ ہے
کہ اس کے خیالوں میں
آباد ہیں ہم......!

ماریہ جلال، کراچی۔

اے انسان......!

اے انسان
کیا سبب ہے اس تکبر کا جو
تیرے دل میں
کنڈلی مار کر بیٹھا ہے
کیا تو نے نہیں دیکھا
اُن پتوں کو
جو پت جھڑ میں جھڑ جایا کرتے ہیں
نئے پتے اُن کی جگہ
آ جایا کرتے ہیں

ڈاکٹر حنا عبدالقیوم خان۔ حیدر آباد۔

......☆☆☆......

پسند اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار، ادبی ذوق کے آئینہ دار

فرید عالم نقشبندی......کراچی
تصور میں چلے آؤ کہ میں دیدار ہی کر لوں
تمنا تم سے ملنے کی پوری ہو نہیں سکتی

شازیہ عارف......ساہیوال
کیا پڑی افتاد آخر کہتے سنتے ماجرا
کہتے سنتے ماجرا، بے ماجرا کیوں ہو گئے
نعمتِ دنیا و دیں، کیا یہ بھی ہے کوئی مزہ
سب مزے اک اک کر کے بے مزہ کیوں ہو گئے

نگہت منیر......اوکاڑہ
ہم یہ کیسا سماج رکھتے ہیں
لغو رسم و رواج رکھتے ہیں
سب رُتوں میں ہرے نہیں رہتے
زخم اپنا مزاج رکھتے ہیں

حنا لطیف......کراچی
تم جو غیروں کی بات کرتے ہو
میری چاہت میں کچھ کمی ہوگی

بابر الیاس......کراچی
وہ شخص جسے ملتی رہیں ماں کی دُعائیں
وہ زیست میں کچھ بھی کبھی ہارا نہیں ہوگا
جن رشتوں کی اخلاص پہ بنیاد نہ ہوگی
اُن رشتوں کا کوئی بھی سہارا نہیں ہوگا

یاسمین اعوان......کوپرا
الفتوں میں سدا خسارہ رہا
نہ کبھی کوئی ہمارا رہا
ہار اپنا نصیب بنتی رہی
جیت کا لمحہ بس تمہارا رہا

یاسمین......بورے والا
نہیں ہے اب ترے وعدوں پہ اعتبار کوئی
جو ہو سکے تو پرانے وہ خواب دے دے مجھے

امبر ظفر......کراچی
چوٹ پر چوٹ کھا رہا ہے دل
یہ حقیقی چٹان ہے خرم

کامران عباسی......حیدر آباد
اتنا گھٹا دیا ہے مجھے دنیا کی حرص نے
اندر سے آج اپنے برابر نہیں ہوں میں

نرگس جمال......حیدر آباد
بجز تیرے کوئی نہیں دوسرا
بس اک تُو ہی تو ہے یہاں ہر طرف

عبداللہ شاہد......حیدر آباد
زلفِ سیہ کو پاؤں کی زنجیر کر چکا
قاتل ہمارے قتل کی تدبیر کر چکا
مرضی ہے جو سلوک روا اس سے تم رکھو
جو شخص اپنے آپ کو تقدیر کر چکا

شازیہ......کراچی
ان کی آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں عدم
ہم پہ تصنیف اک کتاب کرو

غلام حیدر دلشاد......بلتستان
ٹوٹی ہے مری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بجتے رہیں ہواؤں سے در، تم کو اس سے کیا

فراز......لاہور
سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

سدرہ انور علی......جھنگ
اپنے ہاتھوں کی لکیروں پہ بگڑ جاتے ہیں
ہم تو پاگل ہیں، ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں
تم بضد ہو کہ چلو ساتھ ہمارے لیکن
ہم تو مسافر ہیں، ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

شبانہ......سیالکوٹ
درد کا کہنا، چیخ اٹھو، دل کا کہنا، وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا، چپ چپ رہنا، کام ہے عزت داروں کا

حضور بخش کنول......ظاہر پیر
دل میں ہوتا تو بھلا دیتے فراز
وہ شخص دور تک بسا ہے مجھ میں

حیات خان......بونیر
تجھے کب پکارا نہیں جارہا
فراق اب سہارا نہیں جارہا
عجب بے کلی ہے، پس عشق بھی
یہ لمحہ گزارا نہیں جارہا

رضوانہ کوثر......لاہور
ہماری صبح کسی شام سے نہیں ملتی
یہ وہ تھکن ہے جو آرام سے نہیں ملتی

انعام الٰہی عارف......کراچی
وہ آنکھ جس میں کوئی خواہش وصال نہ تھی
ہزار بار اٹھی حسن کی سلامی کو

کوثر اسلم......راولپنڈی
حوصلہ دینے جو آتے ہیں، بتائیں انہیں کیا
ہم تو ہمت ہی نہیں، خواب بھی ہارے ہوئے ہیں

وفا عباسی......ہری پور ہزارہ
زمانہ جس کو ڈرائے مسافتوں سے قتیل
مرا خدا اسے چلنے کو پاؤں دیتا ہے

عبدالقیوم......کراچی
اڑتے پرندوں کو کوئی قید نہیں کرسکتا وصی
جو اپنے ہوتے ہیں، خود ہی لوٹ آتے ہیں

صبا صغیر......کراچی
یہ سوچ لیا ہے اب اس کو آواز نہیں دینی محسن
اب کے میں بھی تو دیکھوں وہ میرا طلبگار ہے کتنا

آسیہ خان......ہارون آباد
تیرے لوٹ کے آنے کا امکان نہیں ہے پھر بھی
رت جگا اپنا مقدر بنا لیا میں نے

عائشہ آصف......کوئٹہ
آج تم یاد بے حساب آئے
آنکھ سے پھر ٹوٹ کے برسا ساون

سلطان قریشی......فیروز پورہ
بے جا تجاوزات میں کچے مکاں گئے
معدوم کوئی اونچی عمارت نہیں ہوئی

فرحینہ خان......پشاور
جسے بہار کے مہمان خالی چھوڑ گئے
وہ اک مکان ابھی تک مکین کی چاہ میں ہے

مشعل......کراچی
کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے میں نقش
پھر یوں ہوا کہ میرا یہ چہرہ بدل گیا

فرح خان......اسلام آباد
اتر رہی ہیں عجب خوشبوئیں رگ و پے میں
یہ کس کو چھو کے مرے شہر میں صبا آئی ہے

بشریٰ مغل......ملتان
کناروں کے دل پگھلے تو دریا ہوئے جاری
اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ پتھر نہیں روتے

ناظم وقاص......لاہور
محبت میں زخم جگر چاہتا ہوں
میں لہجے میں اپنے اثر چاہتا ہوں
رہو سامنے تم نگاہوں کے میری
یہی بس میں شام و سحر چاہتا ہوں

علقمہ سحر......پشاور
محبت ایک جیسی ہے، وفائیں ایک جیسی ہیں
یہاں موسم بدلنے پر ہوائیں ایک جیسی ہیں
عجب شہر سخن آباد ہے میری سماعت میں
عجب شہر خموشاں ہے، صدائیں ایک جیسی ہیں

سید فرحان احمد......کراچی
یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

☆☆......

نوٹ: اب شعر کے ساتھ شاعر کا نام لکھنا ضروری نہیں۔ اچھے اور معیاری اشعار ارسال کریں۔

آپ کی خبر

◆......انتقال پر ملال......◆

دوشیزہ کی دیرینہ لکھاری تسنیم منیر علوی کے شوہر منیر الدین علوی گزشتہ دنوں دبئی میں قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم تسنیم سے دلی تعزیت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خدا، مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین!) قارئین سے بھی دعا کی خصوصی درخواست ہے۔

◆......دعائے صحت......◆

امریکہ میں مقیم معروف سینئر رائٹر قمر علی عباسی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ بستر علالت پر ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اُن کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کریں۔ ہم بھی دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں کہ خدا انہیں شفاء عطا فرمائے۔ (آمین!)

............*

ہماری سینئر لکھاری اور شاعرہ رضوانہ کوثر کی بہو عظمیٰ جمال اور بھانجی شگریہ نذیر بیمار ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ دونوں کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ ہم بھی دعا گو ہیں کہ خدا انہیں جلد از جلد شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆......مبارک باد......☆

ہمارے بہت اچھے دوست اور سچی کہانیاں کے قاری غلام حیدر دلشاد کو خدا نے بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ ہماری طرف سے حیدر کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ دعا ہے کہ خدا نومولود کو خوشیوں سے بھری لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆......سالگرہ مبارک......☆

رضوانہ کوثر کی بھانجی شگریہ نذیر کی سالگرہ اور بھانجے عمر کی شادی کی سالگرہ 29 جون کو ہے۔ ہماری طرف سے دونوں کو بہت ہماری دعاؤں کے ساتھ بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔

............*

ہماری دوست لکھاری مینا تاج 3 جون کو اپنا جنم دن منا رہی ہیں۔ ہماری طرف سے مینا کو بہت بہت مبارک باد! ہم دعا کرتے ہیں کہ مینا کی زندگی کا سفر خوشیوں، مسرتوں، کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ جاری و ساری رہے اور اسی طرح ان کے قلم سے ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار تخلیق ہوتا رہے۔ (آمین!)

📖......کتاب خبر......📖

📖 ہماری بہت پیاری اور سینئر رائٹر صفیہ سلطانہ مغل کا افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل مجموعہ "مشت خاک کا سفر" شائع ہوگیا ہے۔ ہماری طرف سے صفیہ کو ڈھیروں ڈھیر مبارکباد۔ دعا ہے کہ وہ شاہراہ ادب پر اسی طرح کامیابیوں کے سنگ میل عبور کرتی رہیں۔ (آمین!)

📖 ہمارے دیرینہ دوست لکھاری اشعر جواد کا شعری مجموعہ "مفہوم" منظر عام پر آ گیا ہے۔ ہم انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ ان کی کامیابیوں کا سفر یونہی جاری و ساری رہے۔

"آپ کی خبر" کا حصہ بننے کے لیے تمام رائٹرز اور قارئین بلا جھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM